پاکستان کی قومیتیں
نسلیاتی تاریخ کی بنیادی منزلیں

یوری گنکوفسکی

فہرست

پیش لفظ

تمہید

پہلا باب _ برصغیر ہندوپاکستان کے شمالی علاقے کی قدیم ترین آبادی

دوسرا باب _ نظام غلامی کے شباب وزوال کے دور میں

برصغیر کے شمال مغربی علاقے میں نسلیاتی عوامل

تیسرا باب _ جاگیری عہد میں نسلیاتی عوامل اور جاگیری قومیتوں کی تشکیل

چوتھا باب _ بورژوا قوموں کی تشکیل

نتائج

پیش لفظ

کئی سوویت ماہرین شرقیات نے پاکستان کے تاریخ ماضی، اس کی ثقافت، ادب اور زبانوں کا مطالعہ کرنے، اس کے معاشی مسائل، عمرانیات اور سیاسی زندگی کی ممتاز خصوصیات کی تحقیق کرنے میں

اپنی زندگیاں وقف کر دی ہیں۔ تو پھر یہ قدرتی بات ہے کہ نوآبادیاتی ماضی کی باقیات کو مٹانے، معیشت، سائنس اور ثقافت کو فروغ دینے اور ملک کی آزادی کو مستحکم کرنے کی خاطر پاکستان کے عوام نے جو جدوجہد کی ہے اس سے انہیں ہمیشہ ہمدردی رہی ہے اور اس پر انہوں نے توجہ دی ہے۔ پاکستانی عوام نے ایک مضبوط، آزاد اور خوشحال جدید ریاست کی بنیاد ڈالنے کی جدوجہد میں جو کامیابیاں حاصل کی ہیں ان پر تمام سوویت عوام کی طرح ہم سوویت ماہرین شرقیات بھی شاداں ہیں۔

پاکستان کی نسلیاتی (ethnic) تاریخ کی بنیادی ممتاز خصوصیات سے سوویت قارئین کو متعارف کرنے کے لئے اس مصنف نے 63-9161 میں یہ کتاب تحریر کی اور روسی زبان میں ''پاکستان کی قومیتیں'' 1964 میں چھپی۔ پھر 1971 کے شروع میں انگریزی میں ترجمہ کر کے اسے ماسکو میں شائع کیا گیا۔ چند ماہ بعد اس کی اشاعت لاہور میں بھی ہوئی۔

اس کتاب کے لکھنے کے بعد بہت کچھ ہو چکا ہے۔ کئی سوویت عالموں نے مشرق کے عوام کی نسلیاتی تاریخ کے اہم مسائل کے متعلق بہت سی دلچسپ تصنیفات تحریر کی ہیں (ان میں قابل ذکر الیکسیف) ڈے بیٹس، دیا کوف، زو بوف، کوزلوف، کودریافتسیف، سے ماشکو اور چیبو کساروف ہیں) خود پاکستان میں بھی اس عرصے میں کئی دلچسپ کتابیں شائع ہوئی ہیں۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ اس ملک میں علم و تحقیق نے بڑی ترقی کی ہے۔ ابھی تک جن بعض مسائل پر بحثیں ہوتی رہی ہیں محققین نے ان کے جواب دریافت کر لئے ہیں۔ لیکن اب بھی بہت سے مسائل حل طلب ہیں۔

اس کا سبب یہ ہے کہ بہت سے پیچیدہ سوالات کے جامع حل کے بغیر پاکستان کی نسلیاتی تاریخ کی تحقیق کرنا ناممکن ہے۔ مثلاً یہ ضروری ہے کہ وہ علاقہ معین کیا جائے جہاں لوگوں کے ہر گروہ کی نسلیاتی بنیاد کی تشکیل ہوئی، ان کی انسانیاتی (anthropological) ساخت معلوم کی جائے، یہ پتہ چلایا جائے کہ ان کی تشکیل میں کون سے نسلیاتی اجزا نے حصہ لیا، ہر گروپ کے ثقافتی ڈھانچے کے تاریخی سرچشمے کا مطالعہ کیا جائے، مخصوص علاقے کی ثقافت کے ارتقا، تسلسل اور تبدیلی کی ابتدا دریافت کی جائے، ان کی زبانوں کے ارتقا کی تاریخ پر تحقیق کی جائے اور نسل کی بھی۔ یہ بھی لازمی ہے کہ معاشی فرقے (community) کی تشکیل اور ان بنیادی طبقات کے استحکام کی تاریخ کا مطالعہ کیا جائے جو جاگیردارانہ قومیت اور بورژوا قوم کی خصوصیت ہیں۔

ان تمام انتہائی پیچیدہ مسائل کی تحقیق کا تقاضہ ہے کہ وسیع ترین انواع کے ذرائع کا گہرا مطالعہ کیا جائے: قدیم انسانیات، انسانیات (anthropology)، علم آثار قدیمہ، نسلی جغرافیہ (ethnography)، لسانیات (linguistics)، بیانی تاریخ کے ذرائع، معیشت وغیرہ۔

یہ سب ذرائع اپنی نوعیت کے لحاظ سے اتنے گونا گوں ہیں کہ ان کا مطالعہ ایک آدمی کے بس کی بات نہیں ہے۔ اس کتاب کا مصنف ___ جو پیشے کے اعتبار سے مورخ ہے ___ کبھی یہ دعویٰ نہیں کر سکتا کہ اس نے انسانیاتی، نسلیاتی، آثار قدیمہ کے ذرائع کا خود مطالعہ کیا ہے۔ اس کا کام بس یہ تھا کہ دستیاب تاریخی ذرائع کا مطالعہ کر کے اور اس میں علم کے دوسرے میدانوں کے ماہرین کی حاصل شدہ معلومات کو شامل کر کے پاکستان کی قومیتوں کے بڑے بڑے گروہوں کی نسلیاتی تاریخ کی بنیادی منزلوں کی خصوصیات بیان کر دے۔ آج سائنس نے ٹھوس معلومات کی اتنی زیادہ دولت جمع کر لی ہے کہ اس کا ابتدائی شکل میں خلاصہ یقینی مفید ثابت ہوسکتا ہے۔ اس کتاب کے مصنف نے یہی مقصد اپنے نظر رکھا ہے۔ یہ قدرتی بات ہے کہ مصنف یہ فیصلہ صادر نہیں کر سکتا کہ کس حد تک وہ اس فرض کو انجام دینے میں کامیاب ہوا ہے۔

پاکستان کی قومیتوں کی نسلیاتی تاریخ کا مطالعہ کرتے وقت محقق کئی مخصوص قسم کی مشکلات سے دوچار ہوتا ہے۔ سب یہ ہے کہ تاریخ کی تمام منزلوں کا مطالعہ کرنے کے لئے ضروری ذرائع دستیاب نہیں ہیں۔ طویل نوآبادیاتی محکومی نے پاکستان کے تاریخی ماضی پر گہری چھاپ چھوڑی۔ سیاسی آزادی حاصل ہونے کے بعد وہاں معاشرتی سائنسوں کی کئی شاخوں نے حال ہی میں پروان چڑھنا شروع کیا۔ ایک اور مخصوص دقت یہ ہے کہ تاریخی ذرائع کثیر لسانی ہیں۔ ایک ممتاز سوویت ماہر شرقیات الکساندر فری مان نے اس سلسلے میں عرصہ ہوا کہا تھا کہ ''اس طرح محققین ترجموں پر تکیہ کرتے ہیں اور دوسروں کے ذریعے جو معلومات حاص ہوتی ہیں انہیں استعمال کرتے ہیں۔ یہ بات تنقید کے لئے پا بہ جولاں ہے۔''

پاکستان کی قومیتوں کی نسلیاتی تاریخ کی بنیادی منزلوں کا مطالعہ کرتے وقت ان بہت سی مشکلات کو دور کرنے میں اس مصنف کو سوویت اور پاکستانی رفقا کار کی تصنیفات سے بہت مدد ملی۔ لیکن اس کتاب کے مصنف نے جو نتائج اخذ کئے ہیں ان کے لئے دوسرا محقق ذمے دار نہیں ہے۔

اب اس کتاب کا ترجمہ اردو میں شائع ہو رہا ہے۔ اس سے ایک گونہ خوش کیوں کہ بہت سے

پاکستانی قارئین اس سے واقف ہوں اور یوں، مشوروں اور تجویروں سے اس مصنف کو نوازیں گے تو وہ ان کا بے حد مشکور ہوگا۔ میں آپ یقین دلاتا ہوں کہ اس سے مجھے اپنے مستقبل کے کام میں بڑی مدد ملے گی۔

یوری گنکوفسکی

تمہید

پاکستان کی آبادی کی نسلیاتی ساخت معین کرنے میں سوویت عالم زیادہ لسانی معلومات کو استعمال کرتے ہیں جن میں ابتدا، ثقافت، معاشرتی ڈھانچے نسلی رابطوں اور دوسرے عناصر کی شہادتوں کا اضافہ کیا جاتا ہے اور ان کے ذریعے تصدیق بھی۔ لسانی معلومات کی تصدیق کرنا صرف اس لئے ہی ضروری نہیں ہے کہ اکثر اوقات لسانی فرقے اور نسلیات فرقے میں براہ راست تعلق نہیں ہوتا (چنانچہ اگر وہ تمام زبانیں گنا دی جائیں جنہیں پاکستان کی قومیتیں بولتی ہیں تو اس سے اس کی نسلیاتی ساخت کا کوئی اندازہ نہیں ہوسکتا) بلکہ اس لئے بھی کہ آزاد پاکستان اور نو آبادیاتی برصغیر ہند دونوں میں مخصوص طرح مردم شماریاں ہوئی ہیں۔ نو آبادیاتی عہد میں بعض علاقے اور ضلع (کچھ ریاستیں اور قبائلی علاقے بھی) جو 1947 میں پاکستان میں شامل کئے گئے ان کی آبادی کے یا تو ایک حصے کی مردم شماری کی گئی یا سرے سے کی نہیں گئی۔ 1931 اور 1941 میں جو مردم شماریاں ہوئیں ان میں اعداد و شمار کو جان بوجھ کر مسخ کیا گیا۔ موجودہ اور نو آبادیاتی دور کے اعداد و شمار کے صحیح نہ ہونے کی ایک اور وجہ یہ ہے کہ وہ سائنس کے مطابق خارجی معیار پر نہیں بلکہ ان حکام کے داخلی تخمینے پر مبنی ہیں جنھوں نے انہیں سرکاری طور پر جمع کیا۔

مثال کے طور پر 1891 میں شمال مغربی ہندستان میں ڈوگری زبان بولنے والوں کی تعداد 12 لاکھ 29 ہزار درج کی گئی تھی۔ 1921 میں ان کی تعداد گھٹ کر 4 لاکھ 18 ہزار 7 سو ہو گئی اور 1951 میں برصفر رہ گئی (پاکستان اور ہندستان کی مردم شماریوں کے مطابق)۔ اس مظہر کی تشریح کیسے کی جائے؟ ہوا یہ کہ 1921 میں اعداد و شمار جمع کرنے والوں نے گری کو کانگڑی بولی بنا کر (جو 1891 میں 6 لاکھ 36 ہزار 5 سو درج کی گئی تھی) پنجابی زبان میں شامل کر دیا۔ 1951 میں ڈوگری مجموعی طور پر پنجابی میں شامل کر دی گئی[1]۔

پاکستان میں 1951 کی مردم شماری کے مطابق 50لاکھ 6ہزار لوگوں کی زبان پشتو تھی۔ 1961 میں ان کی تعداد صرف 33لاکھ 43ہزار درج کی گئی 2؎۔ وجہ ظاہر ہے۔ 1961 میں قبائلی علاقے کی (جہان بیشتر لوگوں کی مادری زبان پشتو ہے) 34لاکھ 38ہزار آبادی کو درج ہی نہیں کیا گیا۔

اس لئے پاکستان کی آبادی کی نسلیاتی ساخت معین کرتے وقت دستیاب لسانی اعداد وشمار کی تصدیق کرنا اور بھی زیادہ ضروری ہے کیونکہ اس ملک کی سرزمیں پر جونسلیاتی فرقے آباد ہیں وہ مسلسل ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل ہوتے رہتے ہیں۔ سیاسی آزادی کے بعض بڑے بڑے فرقے (جونو آبادیاتی دور میں وجود میں آئے تھے) مستحکم ہوتے جا رہے ہیں۔ اس عمل میں اکثر وہ چھوٹے نسلیاتی فرقوں یا علیحدہ نسلی جغرافیائی گروہوں کو اپنے اندر جذب کر رہے ہیں۔

پاکستان میں 1951 کی مردم شماری کے مطابق 50لاکھ 2ہزار لوگوں کی زبان پشتو تھی۔ 1961 میں ان کی تعداد صرف 33لاکھ 43ہزار درج کی گئی ☆☆۔ وجہ ظاہر ہے۔ 1961 میں قبائلی علاقے کی (جہاں بیشتر لوگوں کی مادری زبان پشتو ہے) 34لاکھ 38ہزار آبادی کو درج ہی نہیں کیا گیا۔

اس لئے پاکستان کی آبادی کی نسلیاتی ساخت معین کرتے وقت دستیاب لسانی اعداد وشمار کی تصدیق کرنا اور بھی زیادہ ضروری ہے کیونکہ اس ملک کی سرزمین پر جونسلیاتی فرقے آباد ہیں وہ مسلسل ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل ہوتے رہتے ہیں۔ سیاسی آزادی کے بعد بعض بڑے بڑے فرقے (جونوآبادیاتی دور میں وجود میں آئے تھے) مستحکم ہوتے جا رہے ہیں۔ اس عمل میں اکثر وہ چھوٹے نسلیاتی فرقوں یا علیحدہ نسلی جغرافیائی گروہوں کو اپنے اندر جذب کر رہے ہیں۔

پاکستان کی 1951 اور 1961 کی مردم شماری معلوم ہوتا ہے کہ ملک میں 12 زبانیں بولی جاتی ہیں (انگریزی، فارسی اور عربی کو چھوڑ کو جنھیں یا تو آبادکاروں کے چھوٹے چھوٹے گروپ بولتے ہیں یا معاشرے میں چوٹی کی لوگ بطور ضمنی زبان استعمال کرتے ہیں) پاکستان کی اکثر آبادی ہند آریائی (ہندستانی) زبانیں بولتی ہے جن کا تعلق ہند یورپی شجرہ سے ہے: پنجابی سندھی، اردو، گجراتی اور راجھستانی۔ ایرانی شجرہ کی زبانوں میں پشتو اور بلوچی بھی وسیع پیمانے پر بولی جاتی ہیں۔ ان کے علاوہ ہند یورپی شجرہ کی داردی (Dardic) زبانیں اور دراوڑی زبانیں (بروہی) والوں کے بھی کئی گروہ ہیں۔

تقسیم کے لحاظ سے پاکستان کی زبانوں میں ایک دوسرے سے بہت بعد ہے۔ 98فیصدی

باشندے 5 بڑی بڑی بولتے ہیں___ پنجابی (2 کروڑ 62 لاکھ لوگ)، پشتو (لگ بھگ 68 لاکھ لوگ)، سندھی (50 لاکھ لوگ)، اردو (33 لاکھ لوگ) اور بلوچی (10 لاکھ لوگ) ☆۔ ان میں سے ہر زبان (اردو کے علاوہ) مخصوص، کم وبیش وسیع، جغرافیائی اور تاریخی علاقے میں بولی جاتی ہے۔ پنجاب، سندھ، بلوچستان اور صوبہ سرحد جو اپنی اپنی آبادی کی اس لسانی، علاقائی اور ثقافتی وحدت کی نشاندہی کرتے ہیں جس نے ہر علاقے میں تاریخی لحاظ سے ارتقا کیا ہے۔

جب اگست 1947 میں برطانوی ہند کی تقسیم ہوئی اور پاکستان کا قیام عمل میں آیا تو آبادی کی اتنی زبردست نقل مکانی ہوئی جس کی اس برصغیر میں کوئی مثال نہیں ملتی۔ 1963 کے وسط تک ہندستان سے جن لوگوں نے پاکستان ہجرت کی ان کی تعداد تقریباً ایک کروڑ تھی (یعنی کل آبادی کا 108 فیصدی حصہ) ☆☆۔ اسی مدت میں جو غیر مسلم پاکستان چھوڑ کر ہندستان آئے وہ 90 لاکھ سے زیادہ تھے۔ لیکن اس کے باوجود نسلیاتی ساخت میں کوئی بنیادی تبدیلیاں نہیں ہوئیں۔ اس سلسلے میں سندھ کے جنوبی علاقے کو استثنیٰ کہا جا سکتا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ پاکستان آنے والے مہاجرین کی اکثریت مشرقی پنجاب اور آس پاس کے پنجابی مسلمانوں پر مشتمل تھی ☆ جو زبان اور ثقافت کی قربت کی وجہ سے مغربی پنجاب کے لوگوں میں گھل مل گئے۔ جہاں تک ہندستان کے دوسرے علاقوں کے مہاجرین کا تعلق ہے (جو خاص کر شمالی ہندستان سے آتے اور جن کی مادری زبان اردو ہے) تو وہ کراچی میں آباد ہو گئے۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ معاشی لحاظ سے ترقی پذیر علاقہ ہونے کے سبب یہاں دوسرے علاقوں کے مقابلے میں نہ صرف دفتر کے ملازمین اور ہنرمند مزدوروں بلکہ غیر ہنرمند مزدوروں کو بھی زیادہ آسانی سے روزگار مل جاتا تھا۔

1961 کے اعداد کے مطابق پنجاب میں (مع بہاولپور) 946 فیصدی باشندے پنجابی بولتے ہیں۔ شمال مغربی صوبہ سرحد میں آبادی کا 90 فیصدی حصہ پشتو بولتا ہے۔ بلوچستان میں (قلات کو چھوڑ کر جہاں بروہی بولی جاتی ہے) عام زبان بلوچی ہے۔ سندھ کے جنوبی علاقے میں جہاں شہر کراچی واقع ہے 517 فیصدی لوگوں کی مادری زبان اردو ہے۔ سندھی ہندوؤں ☆☆ کی جگہ جو ہندستان چلے گئے وہاں سے مسلمان آئے۔ اور ان کی مادری زبان اردو ہے۔ اس وجہ سے 1961 میں کراچی علاقے کی آبادی میں سندھیوں کا حصہ کم ہو کر صرف 11 فیصدی رہ گیا۔ یہ کہنا بالکل صحیح ہے کہ بیشتر سندھ میں (حیدرآباد اور

خیر پور کے علاقوں میں) سندھی زبان پاکستان کے قیام سے پہلے کی طرح باشندوں کی اکثریت کی مقامی زبان ہے (ترتیب وار 77.5 اور 82.3 فیصدی) ☆۔

☆ 1951 ہی میں مشرقی پنجاب اور ملحقہ علاقوں سے پاکستانی آنے والوں کی تعداد تقریباً 58 لاکھ تھی (کل مہاجرین کا 88.9 فیصدی)۔ ان میں 53 لاکھ مہاجر مغربی پنجاب اور بہاولپور میں بس گئے۔ ''مردم شماری پاکستان، 1951'' جلد اول، صفحات 29-31، فہرست 5-

☆☆ سندھ اور خیر پور ریاست سے 8 لاکھ ہندو ہندستان چلے گئے جن میں اکثریت سندھیوں کی تھی۔ 1951 میں 7 لاکھ 45 ہزار 4 سو سندھی ہندستان میں تھے (خاص کر ملک کے مغربی علاقوں میں)۔ (از: ''ہندستانی یونین کے اعداد و شمار کا خلاصہ،، صفحہ 38۔)

اوپر کے اعداد و شمار سے معلوم ہوتا ہے کہ پاکستان کی آبادی پانچ بنیادی نسلیاتی گروہوں پر مشتمل ہے: پنجابی (1961 کی مردم شماری کے مطابق 61 فیصدی)۔ پشتون ☆☆ (15.8 فیصدی)، سندھی (11.7 فیصدی) اور بلوچ (2.3 فیصدی)۔ شمالی ہندستان سے جو مسلمان آئے ہیں اور جن کی مادری زبان اردو ہے ان کا آبادی میں 6.9 فیصدی حصہ ہے۔

زیادہ تر پنجابی ــــ تقریباً 2 کروڑ یعنی 95 فیصدی ــــ صوبہ پنجاب اور شمال مغربی صوبہ سرحد کے دو ضلعوں ہزارہ اور ڈیرہ اسمٰعیل خان میں بسے ہوئے ہیں۔

ان علاقوں کے تمام اضلاع میں پنجابیوں کی غالب اکثریت ہے۔ اس کے علاوہ پنجابی پشاور، مردان، شمالی سندھ، کوئٹہ، لورالائی اور کراچی میں بھی رہتے ہیں۔ لیکن تقریباً ان تمام مقامات میں ان کی حیثیت چھوٹی سی اقلیت کی ہے (7 سے 9 فیصدی تک)۔ شہر کوئٹہ اور ضلع لورالائی کو استثنٰی کہا جا سکتا ہے جہاں وہ کل آبادی کا تقریباً 30 فیصدی حصہ ہیں۔

زیادہ تر پشتون (65 لاکھ تک یا تقریباً 95 فیصدی) شمال مغربی صوبہ سرحد کے اضلاع بنوں، کوہاٹ، مردان اور پشاور میں، بلوچستان کے ژوب ضلع، سابق ریاستوں سوات اور دیر اور قبائلی علاقے میں آباد ہیں۔ ان علاقوں میں ان کی مطلق اکثریت ہے (آبادی کا 90 سے لے کر 99 فیصدی تک حصہ)۔ بلوچستان کے دو اور ضلعوں کوئٹہ پشین اور لورالائی میں بھی وہ اکثریت میں ہیں (تقریباً 60 فیصدی)۔ ڈیرہ اسمٰعیل خان اور ہزارہ کے ضلعوں میں پشتونوں کی بھاری اقلیت ہے (آبادی کے

60 فیصدی)۔

☆ ''مردم شماری پاکستان۔ آبادی، 9161''' جلد 1 صفحات IV-37-1941 اور 1951 کے درمیان سندھ اور خیر پور میں ان لوگوں کی تعداد جن کی مادری زبان سندھی تھی 35 لاکھ 36 ہزار سے گھٹ کر 33 لاکھ 49 ہزار رہ گئی یعنی 5.3 فیصدی کم ہوگئی، حالانکہ اس مدت میں آبادی میں 11.9 فیصدی کا اضافہ ہوا۔ اسی عرصے میں یہاں اردو بولنے والے 32 ہزار سے بڑھ کر 4 لاکھ 79 ہزار ہوگئے، پنجابی بولنے والے 61 ہزار سے ایک لاکھ 52 ہزار، گجراتی بولنے والے 66 ہزار سے 98 ہزار۔

(از: ''مردم شماری پاکستان، 1951''' جلد 1، صفحہ 75؛ جلد 6، صفحات 1.4 و 108۔)

☆☆ ایرانی شجرے کی زبانوں میں ''ش'' اور ''خ'' کی آوازوں کو اکثر آپس میں تبدیل کرلیا جاتا ہے۔ چنانچہ ''پشتون'' کو ''پختون'' بھی کہتے ہیں۔

چند ہزار پشتون کیمبل پور، راولپنڈی (پنجاب) اور سندھ میں بھی بسے ہوئے ہیں لیکن بکھرے ہوئے۔ 1947 کے بعد کراچی میں پشتونوں کی تعداد بڑی تیزی سے بڑھی۔ یہ زیادہ تر مزدوروں پر مشتمل ہے۔ 1957 میں ان کی آبادی تقریباً ڈیڑھ لاکھ تھی ☆۔

پاکستان میں ابھی تک پشتونوں میں جرگہ تنظیم کی باقیات موجود ہیں (خاص کر قبائلی علاقوں میں)۔ پشتونوں کے سب سے بڑے قبائل (یا قبائلی گروہ) یہ ہیں: یوسف زئی، مہمند، آفریدی، اورک زئی، بنوچی، مروت، وزیری، ککڑ اور تارین۔

بعض پشتون خیل ☆☆ (جنھیں پاوندہ کہا جاتا ہے) گرمیاں افغانستان میں گذارتے ہیں۔ اور جب سردیاں شروع ہوتی ہیں تو شمال مغربی صوبہ سرحد، بلوچستان اور پنجاب واپس آجاتے ہیں ☆☆ ☆۔

صوبہ سندھ، سابق ریاستوں خیر پور اور لاس بیلا اور ضلع کراچی میں سندھی بسے ہوئے ہیں۔ پاکستان کی کل سندھی آبادی کا 96 فیصدی حصہ (تقریباً 48 لاکھ) ان ہی علاقوں میں رہتا ہے۔ قلات میں بھی 80 ہزار سندھی آبادی ہیں (1951 میں کل آبادی کے 29 فیصدی)۔ چند ہزار سندھیوں نے سابق ریاست بہاولپور کے ضلع رحیم یار خاں میں بودوباش اختیار کررکھی ہے۔

☆ ''پاکستان ٹائمز'' کے شمارہ 10 اکتوبر 1957 کے مطابق۔ 1961 کی مردم شماری میں ان کی تعداد

ایک لاکھ 22 ہزار بتائی گئی ہے۔

☆☆خیل شاذ و نادر ہی پورا قبیلہ ہوتا ہے، اکثر بڑے گروہ یا قبیلے کی شاخ کو خیل کہتے ہیں۔

☆☆☆ 1961 میں پاکستان میں (قبائلی علاقوں کو چھوڑ کر) 76 ہزار 3 سو پاوندے تھے۔

بلوچ جن کی پاکستان کے صوبے بلوچستان میں سکونت ہے دو گروہوں میں منقسم ہیں: جنوب مغرب میں مکرانی اور شمال مشرق میں سلیمانی۔ درمیان میں ضلع قلات میں زیادہ تر بروہی بسے ہوئے ہیں۔ مشرقی بلوچستان میں 4 لاکھ بلوچ رہتے ہیں۔ خاران اور مکران میں وہ بڑی اکثریت میں ہیں (کل آبادی کے 90 فیصدی سے بھی زیادہ)، چاغی اور سبی میں 60 لاکھ 20 ہزار سے زیادہ بلوچ سندھ میں رہتے ہیں، خاص کر شمالی سندھ کے سرحدی اضلاع، دادو، لڑکانہ اونوب شاہ میں۔ ان علاقوں میں ان کی تعداد اگرچہ بڑھی ہے لیکن کہیں بھی ان کی اکثریت نہیں ہے☆۔ ضلع کراچی میں ایک لاکھ 30 ہزار بلوچ آباد ہیں۔

بلوچوں میں بھی پشتونوں کی طرح جرگہ تنظیم کی بعض باقیات موجود ہیں۔ وہ 18 خاص قبیلوں (یا قبیلوں کے گروہوں) میں بٹے ہوئے ہیں۔ ان میں سب سے بڑے ماری اور بگتی ہیں۔

دراوڑی زبانیں بولنے والے بروہی بھی پاکستان میں رہتے ہیں، لیکن کم تعداد میں۔ 1961 کم مردم شماری کے کے مطابق 350800 سے زیادہ بروہی پاکستان میں ہیں☆☆۔ ان میں سے زیادہ تر مشرقی بلوچستان کے مرکزی علاقوں اور قلات میں آباد ہیں۔ ان کی آبادیاں کوئٹہ پشین، سبی چاغی خاران اوشمالی سندھ میں بھی پائی جاتی ہیں۔

چند چھوٹی قومیتیں (نسلیاتی گروہ) جن کی بولیاں داردی زبانوں سے نکلی ہیں پاکستان کے شمالی مرتفع خطے میں رہتی ہیں۔ ان کی رسوم اور معاشرتی زندگی میں جرگے کے تعلقات کی کئی باقیات موجود ہیں۔ ان میں سب سے بڑا گروہ خوسیوں یا چترالیوں کا ہے (تقریباً 95 ہزار) اور چترال کی زیادہ تر آبادی ان پر ہی مشتمل ہے۔ لگ بھگ ایک ہزار خوسی قوم میں بسے ہوئے ہیں۔ چترال میں تقریباً تین ہزار کافر اور دو ہزار سے زیادہ کوہستانی ☆ بھی آباد ہیں۔ لیکن زیادہ تر کوہستانی (60 ہزار سے زیادہ) سوات کے علاقے میں رہتے ہیں۔ شمال مغربی پنجاب میں بھی کوئی ایک ہزار کوہستانی موجود ہیں☆☆۔

☆1941 اور 1951 کے درمیان سندھ میں بلوچوں کی تعداد 2 لاکھ 35 ہزار سے بڑھ کر

4لاکھ 48 ہزار 3 سو ہوگئی، یعنی 88 فیصدی کا اضافہ ہوا۔ اس کا سبب بلوچستان سے نقل مقام تھا۔ 1951 میں شمالی سندھ کے سرحدی اضلاع میں بلوچ مقامی آبادی کا 30.9 فیصدی تھے، دادو میں 17.1 فیصدی، لڑکانہ میں 14.8 فیصدی اور نواب شاہ میں 10.4 فیصدی (''مردم شماری پاکستان، 1951 ''' جلد 6، صفحات 104، 108-108)۔

☆☆''مردم شماری پاکستان، آبادی، 1961 ''' جلد 1، صفحات IV_39-

1961 کی مردم شماری کے مطابق شمالی ہند سے پاکستان آنے والوں کی تعداد 29 لاکھ 88 ہزار تھی (1951 میں 21 لاکھ 89 ہزار)۔ ان کی مادری زبان اردو ہے۔ لیکن جیسا کہ بیان کیا جا چکا ہے وہ کسی متصل علاقے میں نہیں بسے ہوئے ہیں، سوائے سندھ کے جنوبی علاقے کے (ضلع کراچی)۔ ان میں سے اکثر سندھ اور پنجاب میں (زیادہ تر شہروں میں) آباد ہیں اور سب سے بڑی نسلیاتی اقلیت کہے جا سکتے ہیں۔

پاکستان میں 2 لاکھ 40 ہزار 7 سو گجراتی بھی رہتے ہیں۔ ان میں سے اکثریت مغربی ہند سے آئی ہے۔ 1951 ہی میں شہر کراچی کی کل آبادی کا وہ 11.4 فیصدی تھے (ایک لاکھ 27 ہزار 6 سو افراد)۔ تقریباً ایک لاکھ گجراتی سندھ کے شہروں میں آباد ہو گئے ہیں۔

پاکستان میں راجستانی لوگ بھی رہتے ہیں۔ وہ سندھ کے ضلع تھرپارکر کے علاوہ جو ہندستان کی سرحد پر ہے نواب شاہ اور حیدرآباد میں بھی بسے ہوئے ہیں۔ ان کی مجموعی تعداد 1961 کی مردم شماری کے مطابق ڈیڑھ لاکھ سے اوپر ہے۔

پاکسان کے قیام کے بعد پاکستان کے بنیادی نسلیاتی فرقوں ___ پنجابی، پشتون، سندھی اور بلوچی ___ کا مزید استحکام ہوا ہے۔ معیشت اور ثقافت کے فروغ، شہروں کے بڑھنے اور آبادی کی نقل مکان نے ان بنیادی نسلیاتی فرقون کے انفرادی ترکیبی اجزا کے علاقائی اور قبائلی امتیازات کو ایک حد تک ماند کر دیا ہے۔ یہ خاص نسلیاتی قومیتیں ان چھوٹے چھوٹے نسلیاتی گروہوں کو اپنے اندر جذب کر رہی ہیں جو پہلے اپنے آپ کو الگ سمجھتے تھے۔ اس عمل کا اظہار اس طرح ہوتا ہے کہ بیک وقت دو زبانوں کا استعمال بڑھ رہا ہے۔ ان لوگوں کی تعداد بڑھ رہی ہے جو روزمرہ کی زندگی میں پاکستان کی مقامی آبادی کے بڑے نسلیاتی گروہوں کی زبانیں بولتے ہیں۔ اس کے مقابلے میں چھوٹے چھوٹے

نسلیاتی گروہوں کی ان زبانوں کا دائرہ محدود ہو رہا ہے جن کا رسم الخط نہیں ہے۔ان کے بولنے والوں کی تعداد بھی کم ہو رہی ہے۔ چنانچہ 1951 میں ان لوگوں کے مقابلے میں جن کی مادری زبان سندھی ہے سندھی میں بات چیت کرنے والوں کی تعداد 2 لاکھ 80 ہزار زیادہ تھی اور 1961 میں 6 لاکھ 25 ہزار 7 سو۔اسی طرح یہ تعداد پنجابی میں 2 لاکھ 40 ہزار اور 4 لاکھ 70 ہزار ایک سو اور بلوچی میں ایک لاکھ 32 ہزار 9 سو اور ایک لاکھ 59 ہزار تھی ☆۔

☆ یہ لفظ کئی چھوٹی چھوٹی داردی قومیتوں کے لئے استعمال کیا جاتا ہے۔

☆☆ ''مردم شماری پاکستان، آبادی، 1961 '' جلد 1، صفحات IV_29؛ IV_116۔

جو معلومات ہمیں دستیاب ہیں ان سے ہم یہ نتیجہ اخذ کرتے ہیں کہ پاکستان میں نسلیاتی تبدیلیوں کا جو عمل ہو رہا ہے۔ وہ لسانی حلقے کی حدود سے بھی باہر ہے اور بعض اوقات آبادی کے ایک گروہ کے ارکان کے سابقہ نسلیاتی شعور کو بدل رہا ہے (جو اپنے اصلی سر چشمے سے کٹ کر نئے معاشرتی ماحول میں آ گیا ہے)۔

پاکستان میں جو نسلیای عمل ہو رہا ہے اسے بیان کرتے وقت بروہی عوام سے بحث کرنا ضروری ہے۔ یہ دراوڑی بولنے والوں کی چھوٹی سی آبادی ہے جو صدیوں سے بلوچوں کے ساتھ رہتے چلے آئے ہیں اور ان مین بتدریج جذب ہو رہے ہیں۔ بیسویں صدی کی ابتدا میں عالموں نے تحقیق کی کہ بروہی دو زبانیں بولتے تھے۔ مستقبل قریب میں ان کی مادری زبان کا مٹ جانا اور ارد گرد کے نسلیاتی لسانی ماحول میں ان کا جذب ہونا ناگزیر خیال کیا جاتا تھا☆۔ بروہیوں کا اپنی زبان کا نہ رسم الخط تھا اور نہ ادب اس لئے وہ بلوچوں میں جذب ہو گئے۔ان کی ثقافت اور معیشت پسماندہ تھی، زیادہ تر وہ نیم خانہ بدوشی کی زندگی گذارتے تھے، ان میں جرگے کی باقیات موجود تھیں (اس کا سبب ثقافتی اور معاشی پسماندگی تھا جس کا اظہار یوں ہوتا تھا کہ بروہیوں کی شہری آبادیاں نہیں تھیں جو نسلیاتی استحکام کے مرکز بن جاتیں)۔ان تمام باتوں کی وجہ سے بروہی لوگوں میں مخصوص نسلیاتی شعور پیدا نہیں ہو سکا۔ بروہیوں کے نسلیاتی شعور میں بعض تبدیلیوں سے معلوم ہوتا ہے کہ بلوچوں نے انہیں نسبتاً تیزی سے جذب کیا☆☆۔ یہ اس سے بھی ثابت ہوتا ہے کہ بلوچی قومی تحریک میں بروھیوں نے سرگرم حصہ لیا ہے۔

☆ ''مردم شماری پاکستان، 1951 '' جلد 1، فہرست 7'7_1؛ ''مردم شماری پاکستان، آبادی،

1961'''جلد 1،فہرست 38_39،صفحات IV_114؛IV_117-

لیکن حالیہ برسوں میں بروہیوں کے نسلیاتی ارتقا میں نئے عوامل بھی دکھائی دیتے ہیں۔ان سے معلوم ہوتا ہے کہ بلوچوں میں جذب ہونے کے ساتھ ساتھ (خاص کر ان علاقوں میں جہاں وہ بیگانہ ماحول میں گھل مل گئے) ان کا نسلیاتی استحکام بھی ہو رہا ہے۔ جیسے جیسے پاکستان میں نوآبادیاتی ماضی کی باقیات ختم ہوں گی بروہیوں کے انتہائی پچھڑے ہوئے علاقے معاشی اور ثقافتی اعتبار سے ترقی کریں گے۔ بروہی تحریریں اور افسانوی تخلیقات شائع ہونے لگی ہیں۔ 1961 میں 3 ہزار 7 سو پڑھے لکھے بروہیوں کے نام درج کئے گئے☆☆☆ (1951 کی مردم شماری کے وقت اور نوآبادیاتی دور میں ایک بھی بروہی تعلیم یافتہ نہ تھا)۔ظاہر ہے کہ بروہیوں کا نسلیاتی شعور واضح ہو رہا ہے۔اس کا ایک یہ ثبوت بھی ہے کہ ان کی تعداد تیزی سے بڑھ رہی ہے۔ 1951 میں 2 لاکھ 18 ہزار 6 سو بروہی تھے اور 1961 میں 3 لاکھ 65 ہزار میں سو (یعنی 66.8 فیصدی کا اضافہ)۔ان ہی برسوں میں بلوچوں کی تعداد میں صرف 4 فیصدی کا اضافہ ہوا۔اس میں کوئی شبہ نہیں کہ حال ہی میں بروہیوں کے ایک حصے میں جو بلوچی آبادی سے جدا نہ تھا اپنے بروہی نسلی گروہ ہونے کا احساس پیدا ہو گیا ہے۔

G.A. Grierson, {{Linguistic Survey of India}}, Vol. I, p. 93;*

E.Hultzsch,{{TheBrahui Language}}S.149; (R.Huges-Buller), {{Balu-chistan}}, pp. 26_27.

☆☆ 1941 اور 1951 کے درمیان سندھ کے شمالی علاقے میں بروھیوں کی تعداد 36 ہزار سے گھٹ کر 23 ہزار رہ گئی۔ 1951 کی مردم شماری پاکستان سے پتہ چلتا ہے کہ وہ بلوچوں میں جذب ہو چکے تھے۔

☆☆☆''مردم شماری پاکستان، آبادی، 1961'''جلد 1،صفحات IV_119-

☆☆☆

بعض اصطلاحات کی تشریح

انسانی نسلیاتی فرقے کی تاریخی قسمیں بیان کرتے وقت جو مختلف معاشرتی معاشی تشکیلوں کی

خصوصیت ہوتی ہیں مصنف نے مندرجہ ذیل اصلاحات استعمال کی ہیں:

___ جرگہ (clan)، قبیلہ، قبائلی اتحاد (ان فرقوں کو دکھانے کے لئے جو نظام جرگہ کے زمانے میں موجود تھے اور بعض اوقات جیسا کہ پہلے بیان کی جا چکا ہے ترقی یافتہ جاگیردارانہ قومیت یا مستحکم بورژوا قوم کے اندر بدلی ہوئی شکل میں بچ رہے)

___ غلامی کے نظام کی قومیت ☆ (ان فرقوں کو دکھانے کے لئے جو غلامی کے نظام کے طریقہ پیداوار کے لئے مخصوص ہیں)

جاگیردارانہ قومیت (جاگیرداری نظام میں موجود فرقوں کو دکھانے کے لئے)

___ بورژوا قوم (ان نسلیاتی فرقوں کو دکھانے کے لئے جنھوں نے سرمایہ داری نظام میں فروغ پایا)

___ اشتراکی قوم (ان نسلیاتی فرقوں کو دکھانے کے لئے جو اشتراکی نظام میں پروان چڑھ رہے ہیں)۔

چونکہ لفظ قوم کے مختلف (بعض اوقات متضاد) معنی پیش کئے جاتے ہیں اس لئے ضروری ہے کہ اس پر ذرا تفصیل سے بحث کی جائے۔ یہ

☆ روسی زبان میں اس کے لئے لفظ ''نرودنست'' استعمال کیا جاتا ہے جس کا اردو میں صحیح بدل نہیں ہے۔ اس لئے وقتی طور پر معنی سمجھانے کے لئے ''قومیت'' کا لفظ کام میں لایا گیا ہے۔

اس لئے بھی مزید اہم ہو جاتا ہے کہ اس کا کتاب کے موضوع سے براہ راست تعلق ہے۔

چنانچہ سب سے پہلے ہم اصطلاح قوم سے شروع کرتے ہیں۔

لفظ قوم اتنا ہی پرانا ہے جتنی کہ لاطینی زبان۔ لاطینی زبان میں nascor, natus sum, nasci کے معنی ہیں پیدا ہونا، اور natio-onis کا مطلب ہے پیدائش۔ ان کا ابتدائی لفظ natio ہے (جس کا لفظ cognatio سے گہرا تعلق ہے، اس کے معنی ہیں خونی رشتہ، اور cognatus ہوا خونی رشتے دار) جو خونی رشتے داروں کے گروہ کا اظہار کرتا ہے۔ لیکن ہمارے عہد کے آغاز میں اس لفظ کے معنی قبیلہ، قبائلی اتحاد، لوگ ☆ ہو گئے، یعنی اس لفظ سے نہ صرف خونی رشتے بلکہ اتحاد، نسلیاتی فرقے کا بھی اظہار ہونے لگا۔

مغربی یورپ کی زبانوں نے لفظ natio لاطینی سے ہی حاصل کیا۔ ازمنہ وسطی میں یہ لفظ وسیع معنوں میں استعمال کیا جاتا تھا ــــ انسانی فرقہ جس کی باہمی رشتے کی بنیاد ایک مقام میں پیدائش تھی یا جو ایک ملک میں رہتا تھا (مثلاً ازمنہ وسطی کی یونیورسٹیوں میں natio کا مطلب ایک مخصوص علاقے سے تعلق رکھنے والے طلبا کے گروہ سے تھا)۔

ازمنہ وسطی کے اواخر میں لفظ natio_ قدیم فرانسیسی میں nacion کی شکل میں اور ازمنہ وسطی کی انگریزی میں nacioum کی صورت میں ــــ لفظ populus یا peple کے مترادف استعمال ہونے لگا (لاطینی لفظ populus سے ماخذ جس کا مطلب ہے لوگ، عوام)۔

عہد جدید کی ابتدا سے یہ لفظ nacion_nation کی شکل میں استعمال کیا جانے لگا (کم از کم مغربی یورپ کی بڑی زبانوں میں)، نہ صرف ایک ایسے انسانی فرقے کے معنوں میں جس کا اندرونی رشتہ کسی مخصوص ملک یا علاقے میں پیدائش پر مبنی ہو بلکہ یا ریاست کے معنوں میں بھی، جہاں لوگ رہتے ہوں۔

روسی زبان میں لفظ قوم فرانسیسی سے آیا ہے۔

لیکن یہ پیش نظر رکھنا ضروری ہے کہ روسی زبان میں لفظ ناتسیا (قوم) مغربی یورپی زبانوں کے مقابلے میں محدود معنوں میں استعمال کیا جاتا ہے۔ چنانچہ جدید انگریزی زبان میں nsyion کا مطلب قبیلہ، وفاق اور علاقہ ہوسکتا ہے جس پر وہ آباد ہے۔ اس کا مطلب لوگوں کا ایک گروہ بھی ہوسکتا ہے جن کی ابتدا اور زبان مشترک ہو۔ اس سے مراد لوگوں کے ایسے جتھے سے بھی ہوسکتی ہے جن کا تعلق مخصوص علاقے سے ہو اور جو ایک حکومت کے تحت منظّم ہوں اور جن کی زندگی کا معاشرتی اور ثقافتی طرز واضح ہو۔ دوسری مغربی یورپی زبانوں کے متعلق بھی یہی کہا جاسکتا ہے۔

☆ شہنشاہ آگستس نے روم میں ایک پیش گاہ تعمیر کرائی تھی جس کا نام تھا Nationes- اسے ان تمام لوگوں کی تصاویر سے سجایا گیا تھا جن کا علم رومنوں کو تھا۔

جدید ادبی روسی میں ناتسیا (قوم) کا استعمال صرف ایک معنی ہوتا ہے ــــ ایک مستحکم نسلیاتی فرقہ۔ بطور استعارہ بعض اوقات اس کا مطلب ریاست بھی ہوسکتا ہے۔

اب یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ تاریخ کے مارکسی لیننی نظریے میں اصطلاح قوم کے کیا معنی ہیں، اور

نسلیاتی فرقہ جن امتیازی خصوصیات کا اظہار کرتا ہے انہیں کس طرح معین کیا جائے؟

مارکسی مورخ انسانی معاشرے کی تاریخ کو مادی اشیا کے ذرائع پیداوار کے ارتقا کی تاریخ سمجھتے ہیں۔ پیداوار کی ٹیکنک کے ارتقا کی مخصوص منزل کے مطابق ایک مخصوص معاشرتی نظام وجود میں آتا ہے۔ پیدآور قوتوں کے ارتقا کے سبب پیداوار کی ٹیکنک میں کسی بھی تبدیلی کا نتیجہ اس کے مطابق معاشرتی نظام میں بھی تبدیلی کی صورت میں نکلتا ہے۔ یہی بات معاشرتی تشکیلوں میں تبدیلی معین کرتی ہے۔ اور معاشرتی تشکیلوں میں تبدیلی معاشرے کی صرف معاشی بنیاد اور بالائی ڈھانچہ (ریاست)، قانونی ادارے، مذہبی اور فلسفیانہ خیالات وغیرہ) ہی نہیں بدلتی بلکہ اس انسانی نسلیاتی فرقے کی نوعیت (ساخت) میں بھی تغیر پیدا کر دیتی ہے جس نے ایک مخصوص معاشرتی تشکیل کے تاریخی ارتقا کے دوران نشوونما پائی ہے۔

جوں جوں مادی قدروں کی معاشرتی پیداوار ترقی کرتی ہے انسانی نسلیاتی فرقے کی یہ امتیازی خصوصیات بھی فروغ پاتی ہیں: علاقے کا اشتراک، معاشی زندگی کا اشتراک، زبان کا اشتراک، مادی اور روحانی ثقافت اور نسلیاتی شعور (کسی مخصوص نسلیاتی فرقے سے اپنائیت کا احساس) کا اشتراک۔

ساتھ ہی ہر نوعیت کے نسلیاتی فرقے کی اپنی امتیازی خصوصیات بھی ہوتی ہیں جن کا تعلق مخصوص معاشرتی معاشی تشکیل کے اندر پیدآور قوتوں اور تعلقات پیداوار کے ارتقا کی نوعیت پر ہوتا ہے۔

یہاں یہ پیش نظر رکھنا ضروری ہے کہ تاریخی لحاظ سے مستحکم نسلیاتی فرقے اور انسانی نسلیں ایک چیز نہیں ہیں۔ انسانی نسلیں معاشرتی (spcial) نہیں بلکہ حیاتیاتی (biological) فرقے ہوتی ہیں جو ارتقا کی ابتدائی منزلوں میں مختلف حیاتیاتی اور جغرافیائی ماحول کے ساتھ انسانوں کے مختلف گروہوں کی مجہول مطابقت کا نتیجہ ہوتی ہیں۔ اس طرح مذہبی اشتراک کا بھی لوگوں کے نسلیاتی فرقوں سے کوئی تعلق نہیں ہوتا۔

تاریخی لحاظ سے پہلا مستحکم (وقت کے لحاظ سے) فرقہ جرگے کی شکل میں اس وقت ابھرنا شروع ہوا جب قدیم حجری (paleolithic) عصر نچلی منزل سے بلند منزل میں داخل ہو رہا تھا اور جب انسان ایک حیاتیاتی ہستی کی حیثیت سے تشکیل پا چکا تھا۔ جیسے جیسے سرگرمی کی مختلف شکلیں بڑھیں اور انہوں نے ترقی کی تو حیوانی آباواجداد کی قدیم خصوصیات آہستہ آہستہ ختم ہوتی گئیں اور وسطی حجری عہد کے آدمی کی

جگہ جدید انسان نے لے لی۔ اس عہد نے انسانی فرقوں کے نمونوں میں بھی بنیادی تبدیلیاں کیں: قدیم آدمی کے گلوں کی جگہ جرگہ گروہ بننے لگے۔ تاریخ انسانی میں جرگے کا ابھرنا ایک تاریخی قدم تھا۔ اس سے ثقافتی اور معاشرتی روایات کے تسلسل کو ضمانت ملی اور کام کے دوران ٹیکنولوجیکل حاصلات نصیب ہوئیں۔

چونکہ پیداآور قوتوں کے ارتقا کی سطح انتہائی پست تھی اس لئے اسی کے مطابق جرگہ تنظیم کے تحت تعلقات پیداوار کی نوعیت اور اس کی مناسبت سے مستحکم نسلیاتی فرقے کی وضع معین ہوئی۔ فرقے کی اس وضع کی ممتاز خصوصیات یہ تھیں کہ وہ غیر طبقاتی تھا اور جرگے (خونی رشتے کے تعلقات پر مبنی افراد کا الگ الگ مجموعہ تھا۔ معاشی زندگی کا اشتراک ذرائع پیداوار کی مشترکہ ملکیت پر اور جرگے کے تمام ارکان کے اجتماعی کام (ابتدائی باہمی تعاون کی شکل میں) پر مبنی تھا۔ محنت کی تقسیم جسمانی حیاتیاتی نوعیت کی تھی اور محنت کی پیداوار کی بٹائی مساوی تھی۔ علاقے کا اشتراک جو پیداوار کی ابتدائی خارجی شرط ہے قدرتی طور سے قائم ہوا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ جرگہ زمین کو اپنا غیر نامیاتی جسم تصور کرتا تھا۔ زبان کے اشتراک پر جس کا ارتقا اجتماعی جرگے کی پیداوار کی حیثیت سے ہوا تھا اور جو اس کی نمایاں خصوصیت تھی، تحریر نے معیاری بنانے کا اثر نہیں ڈالا۔ نسلیاتی شعور اور ثقافت کا اشتراک ☆ جو اجتماعی جرگے کے عمل اور کام کے دوران ابھرے، ان کی بنیاد خونی رشتے پر تھی اور انہیں خونی رشتوں نے ہی معین کیا۔

اجتماعی جرگوں کے افراد کی تعداد میں کمی اور ان کے ٹوٹ کر مختلف حصوں میں بٹنے کا قدرتی رجحان دراصل پیداآور قوتوں کے ارتقا کی پست سطح کی وجہ سے تھا۔

جب جرگے کے نظام میں پیداآور قوتوں نے نشوونما کی تو انسان نے شکار کرنا اور غذا کی تلاش میں گھومنا پھرنا چھوڑ دیا۔ وہ بعض علاقوں میں آباد ہو گیا اور کاشتکاری اور مویشی بانی کرنے لگا۔ یہ علاقے تھے جہاں حالات مفید تھے۔ چنانچہ محنت کی پہلی تقسیم ☆☆ اور اس کے نتیجے میں اشیا کا تبادلہ شروع ہو گیا۔ ساتھ ہی بڑھتی ہوئی گھنی آبادی نے اجتماعی جرگوں کو مجبور کر دیا کہ وہ اندرونی طور پر اور اردگرد کی دنیا سے کاروبار میں زیادہ متحد ہوں۔ رشتے کے جرگے جو ایک دوسرے کے نزدیک رہتے تھے مشترک ہونے لگے۔ اس طرح وہ قبیلے ظہور میں آئے جو ایک مخصوص علاقے میں رہتے تھے، جن کا اپنا نام تھا اور جو اپنی خاص بولی بولتے تھے۔ قبائلی کے علاوہ جنھوں نے جرگے کے طریقہ پیداوار کی آخری منزل میں تشکیل پائی تھی، ایک زیادہ پیچیدہ معاشرتی تنظیم ابھری: اسی دور میں منتخبہ سردار اور منتخبہ قبائلی کونسلوں کے

ادارے وجود میں آئے۔

اس دور میں جو وسطی حجری اور جدید حجری عہدوں کا سنگم تھا پیداآور قوتوں نے بے نظیر طور پر ترقی کی۔ دوسری طرف اس زمانے میں مسلسل مسلح تصادم بھی ہوتے رہے۔ ان پیہم عداوتوں کے دوران ایک علاقے میں رہنے والے رشتے دار قبائل کے درمیان وحدت قائم ہوئی۔ جنگوں اور لوٹ مار کی وجہ سے جرگے کے سرداروں اور سرخیلوں کے اختیارات اور طاقت میں اضافہ ہو گیا۔ ایک ایسے معاشرے کے سر پر جو حاکمی اور محکومی سے پاک وصاف تھا معاشرتی معاشی تبدیلیاں منڈلانے لگیں۔

☆ ثقافت کی تعریف یوں کی جاسکتی ہے کہ وہ ان تمام حاصلات کا مجموعہ ہے جنھیں انسانیت نے اپنے تاریخی ارتقا کے دوران تخلیق کیا ہے۔

☆☆ زراعت اور مویشی بانی محنت کی مخصوص قسمیں بن گئیں۔

دھات کے اوزار بننے سے انسان کی پیداواری صلاحیتیں بے پناہ بڑھ گئیں۔ پیداآور قوتوں کی مزید نشوونما ہونے کے سبب انسان اپنی ضروریات سے زائد پیدا کرنے لگا۔ اس کا ایک نتیجہ یہ نکلا کہ اب انسانی محنت کا استحصال کر کے زائد پیداوار کی ذخیرہ اندوزی ممکن ہوگئی۔

ان طبقاتی تعلقات کے بڑھنے سے وہ ستون ہی منہدم ہو گئے جن پر جرگہ تنظیم کی عمارت کھڑی تھی۔ ساتھ ہی اس عمل نے جرگہ نظام کے اداروں کو بھی آہستہ آہستہ لیکن ثابت قدمی سے تبدیل کر دیا۔ ''...جو ابتدا میں قدرتی بالیدہ جمہوریت تھی وہ قابل نفرت اشرافیہ میں بدل گئی،، ☆ معاشرہ متضاد طبقات میں بٹ گیا۔

جب جرگہ تنظیم کی جگہ اس نئے نظام نے لی جس کی بنیاد انسان کے ہاتھوں انسان کا استحصال تھی تو قبائل اور قبائلی اتحاد ایسے نئے قسم کے فرقے میں بدل گئے جو طبقاتی معاشرے کی بنیاد تھا ___ غلامی کے نظام کی قومیت یا (اگر معاشرہ غلامی کی تشکیل سے گریز کر کے براہ راست جاگیردارانہ نظام میں داخل ہوا تو) جاگیردارانہ قومیت میں۔

مستحکم نسلیاتی فرقے جو غلامی کے یا جاگیردارانہ طریقہ پیداوار کے دور میں ابھرتے ہیں ___ غلامی کے نظام کی قومیت یا جاگیردارانہ قومیت ___ وہ معاشرتی اعتبار سے بیچ میل ہوتے ہیں۔ علاوہ ازیں ہر فرقے کا مختلف معاشرتی معاشی تشکیلوں کے تعلق سے اپنا مخصوص طبقاتی ڈھانچہ ہوتا ہے۔ چنانچہ غلامی

کے نظام کی قومیت تاریخی لحاظ سے تشکیل شدہ ایک ایسی مستحکم نسلیاتی فرقہ ہے جس کے بنیادی طبقات آقا اور غلام ہوتے ہیں۔ جاگیردارانہ قومیت بھی متضاد طبقات پر مشتمل فرقہ ہے۔ لیکن اس کے بنیادی طبقات روسا یا زمیندار اور معاشرتی مساوات اور حقوق سے محروم کسان ہوتے ہیں۔

☆ اینگلس، ''خاندان، ذاتی ملکیت اور ریاست کا آغاز''۔

اب معاشی زندگی کا اشتراک ذرائع پیداوار کی اجتماعی ملکیت اور اجتماعی محنت پر مبنی نہیں ہوتا بلکہ اس کی بنیاد لوگوں کی محنت کی بڑھتی ہوئی تقسیم پر (اس کا اظہار دستکاری کے کاشتکاری سے جدا ہونے، تقسیم پر (اس کا اظہار دستکاری کے کاشتکاری سے جدا ہونے، خود کاشتکاری میں تخصیص اور شہروں کی دیہات سے علیحدگی میں ملتا ہے) اور جنس کی پیداوار کی ابتدا پر ہوتی ہے۔ ہم خون رشتے غالب نہیں رہتے، ان کی جگہ علاقائی رابطے لے لیتے ہیں۔

زبان کے اشتراک کا کردار بھی بدل جاتا ہے: قبائلی بولیوں کی جگہ قومیتوں کی زبانیں ابھرتی ہیں۔ رسم الخط شروع ہونے سے یہ زبانیں (یا ان کی انفرادی بولیاں) پختہ ہوتی ہیں، ادبی معیار قائم ہونے میں مدد ملتی ہے جو بعض اوقات بولی جانے والی سے کہیں زیادہ ترقی یافتہ ہوتے ہیں۔

ثقافت کے اشتراک میں بھی تبدیلی پیدا ہوتی ہے کیوں کہ اب قومیت ومشقت طبقاتی ثقافت بن جاتی ہے۔ معاشرے میں چھوٹی کے لوگ جو محنت ومشقت سے آزاد ہو جاتے ہیں نہ صرف اپنے مفاد میں ثقافت کو پروان چڑھاتے ہیں بلکہ اس پر اپنے طریقہ زندگی کی چھاپ بھی پروان چڑھاتے ہیں بلکہ اس پر اپنے طریقہ زندگی کی چھاپ بھی چھوڑتے ہیں۔ ساتھ ہی ایک معین قومیت کی ثقافت میں بعض مخصوص امتیازات (علاقائی خصوصیات) بھی ابھرتے ہیں۔ اس کے دو اسباب ہیں: پہلا، ان معاشی رابطوں کا بے قاعدہ کردار جو اس علاقے کے الگ الگ حصوں میں تعلق پیدا کرتا ہے جہاں معین قومیت بکھری ہوئی ہوتی ہے۔ دوسرا، ان معاشی ثقافتی طرزوں میں ہر قسم کے فرق جو الگ الگ حصوں کے لئے مخصوص ہوتی ہیں۔

جرگہ تنظیم کی کئی باقیات غلامی کے طریقہ پیداوار کے پہلو بہ پہلو، زندہ رہیں (جاگیرداری نظام کے شانہ بشانہ بھی جس کا ظہور ہمارے عہد کی ابتدائی صدیوں میں شروع ہو گیا تھا)۔ خاص کر نظریے کے شعبے میں ان باقیات کو ختم کرنا مشکل تھا۔ یہ نسلیاتی شعور کی تشکیل کیلئے رکاوٹ بنا۔ یہ بات واضح ہے

کیونکہ جرگے کے اداروں کے جاری رہنے سے اکثر جرگے کے ابتدائی عناصر کی نسلیاتی تبدیلی رکی، خاص کر غلامی کے دور میں۔ اس کی وجہ سے نسلیاتی عوامل کو قومیتوں میں بدلنے میں ضرورت سے زائد عرصہ لگا۔ اور اگر قومیتوں کی تشکیل ہونے بھی لگی تو وہ آسانی سے پارہ پارہ ہوگئیں۔ جب قومیتوں میں اتصال پیدا ہو گیا اور انہوں نے نسلیاتی شعور حاصل کر لیا (کسی معین قومیت کے ساتھ مماثلث کا احساس) تب بھی اس احساس کے ساتھ مشترکہ جرگے یا قبیلے کی گہری یادیں چمٹی رہیں۔

جاگیردارانہ معاشرے میں پیداآور قوتوں کی نشو ونما کی وجہ سے سرمایہ دارانہ پیداوار اور سرمایہ دارانہ نظام نے جنم لیا۔ اس نظام کے ارتقا اور نئے معاشرتی طبقات ___ بورژوازی اور پرولیتاریہ ___ کی تشکیل نے ایک نئی قسم کے تاریخی فرقے کے ظہور کے لئے راہ ہموار کی۔ یہ تھی بورژوا قوم۔

بورژوا قوم کی تشکیل کا مطالعہ کرتے وقت ہم کو ان سوالات سے دوچار ہونا پڑا ہے: کہاں، کب اور ارتقا کی کس منزل میں جاگیردارانہ قومیت بورژوا قوم میں تبدیل ہوئی؟

ان کا جواب ہمیں لینن کی تحریروں میں ملتا ہے۔ انہوں نے لکھا ہے کہ قومی رشتوں کا قیام بورژوا رشتوں کے قیام کے علاوہ کچھ نہیں ہے۔ ''معاشرتی ارتقا کے بورژوا عہد میں قومیں ناگزیر پیداوار ہیں، ناگزیر شکل ہیں۔'' ☆

دراصل سرمایہ دارانہ معاشی اداروں کے قیام کے ساتھ ساتھ جاگیردارانہ قومیت بورژوا قوم میں بدلنا شروع ہوتی ہے۔ جیسے جیسے سرمایہ دارانہ تعلقات مضبوط ہوتے ہیں نئے معاشرتی طبقات وجود میں آتے ہیں۔ جب جاگیردارانہ قومیت کے اندر بورژوا معاشرے کے دو بنیادی طبقات یعنی بورژوازی اور پرولتاریہ نشو ونما پاتے ہیں تب بورژوا قوم ابھرتی ہے (اس وقت بھی جب قبل از سرمایہ داری کے تعلقات کی بعض باقیات زندہ رہتی ہیں)

بورژوا قوم کی امتیازی خصوصیات گذشتہ مستحکم تاریخی نسلیاتی فرقوں سے بنیادی طور پر مختلف ہوتی ہیں۔

سرمایہ داری کے ارتقا کے دوران معاشی زندگی کا جو اشتراک تشکیل پاتا ہے وہ محنت کی علاقائی تقسیم اور سرمایہ دارانہ جنس کی پیداوار پر مبنی ہوتا ہے۔ جنس کی پیداوار جاگیرداری کی چھوٹی چھوٹی مقامی منڈیوں کو ایک واحد قومی منڈی میں متحد کر دیتی ہے۔

جوں جوں سرمایہ دارانہ تعلقات بڑھتے اور مضبوط ہوتے ہیں معاشی زندگی کا اشتراک وسیع اور مستحکم ہوتا ہے، اور آخر کار قومی علاقے کے انفرادی حصوں کے درمیان رابطے باقاعدہ اور قوی ہو جاتے ہیں۔ اور جاگیرداری کا انتشار ناگزیر ہو جاتا ہے۔ لیکن ساتھ ہی مختلف علاقوں میں معاشی ترقی کی ناہمواری اور بڑے بڑے شہروں کے ابھرنے سے ملک کی حدود کے اندر آبادی کی کافی نقل مکانی ہونے لگتی ہے۔ اس کے سبب الگ الگ بولیوں کے درمیان فرق مٹنے لگتے ہیں اور قومی پیمانے پر لسانی معیاروں کی تشکیل ہوتی ہے۔ تحریری اور بولی کی زبان میں فرق کم ہونے لگتے ہیں۔ معاشی اور سیاسی ارتکاز کی وجہ سے مختلف بولیاں ایک قومی زبان میں مرتکز ہو جاتی ہے۔ جاگیردارانہ قومیت کی زبان بورژوا قوم کی زبان میں بدل جاتی ہے۔ اگرچہ مختلف علاقوں میں معاشی اور ثقافتی ارتقا غیر ہموار ہوتا ہے اور بولیوں میں امتیاز باقی رہتا ہے (کیونکہ سرمایہ داری میں شہر اور دیہات کے درمیان خلیج حائل رہتی ہے) اس کے باوجود ادب میں جو قومی لسانی معیار تجسیم ہوتے ہیں وہ مقامی بولیوں کے ارتقا پر معین اثر ڈالتے ہیں۔

☆ لینن، "کارل مارکس"۔

سرمایہ داری کے ارتقا کے دوران جب پورے ملک کا علاقہ مستحکم ہوتا جاتا ہے، معیاری پیداوار بڑھتی ہے اور طباعت و اشاعت وغیرہ فروغ پاتی ہے تو مختلف علاقوں کے لوگوں کے درمیان ثقافت کی خلیج پٹ جاتی ہے۔ لیکن بورژوا قوم میں ثقافت کا اشتراک دھری اور متضاد نوعیت کا ہوتا ہے۔ لیکن بورژوا قوم میں ثقافت کا اشتراک دھری اور متضاد نوعیت کا ہوتا ہے۔ اس کی وجہ ہے کہ اس میں ایک طرف جمہوریت اور اشتراکی ثقافت کے عناصر ہوتے ہیں جن کے خالق استحصال کئے جانے والے محنت کش لوگ ہیں اور دوسری جانب استحصال کرنے والے طبقے کی بورژوا ثقافت غالب ثقافت ہوتی ہے☆۔

نسلیاتی شعور میں معین تبدیلیاں بھی ہوتی ہیں۔ جب معاشی اتصال مضبوط ہو جاتا ہے تو اس سے جاگیردارانہ انتشار کو ختم کرنے اور قومی علاقے کو ایک واحد مرکزی ریاست میں متحد کرنے کی خواہش پیدا ہوتی ہے۔ اس کا سبب یہ ہے کہ قومی ریاست سرمایہ داری کی ترقی کے لئے بہتر حالات فراہم کرتی ہے۔ کہ قومی ریاست سرمایہ داری کی ترقی کے لئے بہتر حالات فراہم کرتی ہے۔ اینگل نے لکھا ہے کہ متحدہ مادر وطن کو حاصل کرنے کی کافی مادی بنیاد ہوتی ہے☆☆۔ جو قومی شعور معاشرے کے ارتقا کے

دوران تشکیل پاتا ہے اس پر ان معاشرتی رشتوں کی چھاپ ہوتی ہے جو اسے جنم دیتے ہیں۔ ترقی پسند، جمہوری، جاگیرداری کے مخالف اور نجات دھندہ رجحان کے ساتھ ساتھ اس میں قومی تنگ نظری، برتری کے خط وخال بھی ہوتے ہیں جو بورژوا طبقے کی جارحانہ قوم پرستی اور تسلط کے رجحانات کی پیداوار ہیں۔

☆ لینن، ''قومی سوال پر تنقیدی رائے''۔

☆☆ اینگلس، ''تاریخ میں قوت کا کردار،،۔

پرولیتاری انقلابوں کے ذریعے سرمایہ دارانہ طریقہ پیداوار کو ختم کرنے سے اور سامراج کے خلاف محکوم عوام کی قومی آزادی کی تحریکوں سے تاریخ انسانی میں ایک نئے باب کی ابتدا ہوتی ہے۔ اس معاشرتی انقلاب سے ایک نیا کمیونسٹ معاشرہ ظہور میں آتا ہے جس کی پہلی منزل اشتراکیت ہے۔ سرمایہ داری سے اشتراکیت تک عبور کے دور میں استحصال کرنے والے طبقات بے باق کر دئے جاتے ہیں، ملک کی قومی معیشت اشتراکی خطوط پر از سر نو تعمیر کی جاتی ہے اور ثقافتی انقلاب مکمل کیا جاتا ہے۔ اس دور میں لوگوں کے نسلیاتی فرقے کی تاریخی طرز میں بھی بنیادی تبدیلیاں ہوتی ہیں اشتراکی قومیں وجود میں آتی ہیں۔

اشتراکی قوم کی معاشی زندگی کے اشراک کی بنیاد ذرائع اور آلات پیداوار کی قومی اشتراکی ملکیت پر اور محنت کش عوام کی بڑھتی ہوئی ضروریات کو حتی الامکان پوری کرنے کی خاطر معیشت کی منصوبہ بند ترقی پر ہوتی ہے۔ اشتراکیت میں بھی محنت کی علاقائی تقسیم باقی رہتی ہے لیکن سرمایہ داری کے مقابلے میں اس کی نوعیت بنیادی طور پر بالکل مختلف ہوتی ہے۔ اس کا سبب یہ ہے کہ اول الذکر اشتراکی تخصیص اور تعاون کے اصولوں پر مبنی ہوتی ہے جس کا مقصد عوامی پیداوار کی انتہائی معقول تنظیم اور سائنسی اور ٹیکنکی ترقی کی تیز تر بالیدگی ہے۔

معاشرے کے طبقاتی ڈھانچے میں بنیادی تبدیلیاں، مزدور طبقے اور کسانوں، شہر اور دیہات کے درمیان فرق کا بتدریج خاتمہ، بعض علاقوں کی معاشی پسماندگی کا اختتام، اس علاقے میں بسنے والے لوگوں کے مختلف حصوں کے درمیان گوناگوں تعلقات کا قیام جہاں اشتراکی قوم ابھر رہی ہے، ناخواندگی کی بیخ کنی اور سائنس اور ثقافت کی بالیدگی ___ ان سب سے مختلف بولیوں میں فرق بتدریج دور ہو جاتے ہیں جو سرمایہ داری میں موجود ہوتے ہیں۔ اشتراکی قوم کی صحیح معنوں میں کل عوامی واحد زبان تشکیل پاتی ہے۔

عوام کی مادی اور روحانی ثقافت کی رگ و پے میں اشتراکی مقصد سرایت کر لیتا ہے۔ نسلیاتی شعور میں بھی تبدیلیاں ہوتی ہیں۔ حب الوطنی کا جذبہ تمام محنت کش عوام سے بین الاقوامی اخوت اور قوموں کے درمیان دوستی کے احساس کے ساتھ ہم آہنگ ہو جاتا ہے۔ بورژوا جمود اور علحدگی ماضی کی بات بن جاتے ہیں۔

اشتراکی اشتراکی قوموں کو ترقی کے غیر محدود مواقع فراہم کرتے ہے، لیکن ساتھ غیر محدود مواقع فراہم کرتی ہے، لیکن ساتھ ہی ان کے درمیان اتصال کا راستہ بھی کھولتی ہے۔ جب اشتراکی تعمیر ختم ہونے کے قریب ہوتی ہے اور کمیونزم کی تعمیر کا آغاز ہوتا ہے تو تمام اشتراکی قوموں میں مشترکہ روحانی امتیازی خصوصیات پروان چڑھتی ہیں اور ان کے استحکام اور پیوستگی کا رجحان مضبوط سے مضبوط تو ہوتا جاتا ہے۔ اشتراکی قوموں کے درمیان سرحدوں کی دیواریں منہدم ہو جاتی ہیں، ان کی ثقافتوں کی قومی شکلوں میں تبدیلی پیدا ہوتی ہے اور تمام اشتراکی قوموں میں ایک بین الاقوامی مشترکہ ثقافت ابھرنے لگتی ہے۔ ''اشتراکیت کا مقصد نہ صرف انسانیت کی چھوٹی چھوٹی ریاستوں میں تقسیم کو اور قوموں کی علحدگی کی ہر شکل کو ختم کرنا ہے، نہ صرف قوموں کو ایک دوسرے کے نزدیک لانا ہے بلکہ ان کا اتصال بھی کرنا ہے۔''☆ اشتراکی قوموں کا آپس میں ضم ہونا ایک طویل تاریخی عمل ہے۔ موجودہ عہد میں اس کی ابتدا ہو رہی ہے۔ اور جب تمام کرہ ارض پر کمیونزم کی تعمیر مکمل اور کامران ہو جائے گی تب کمیونسٹ قسم کا نسلیاتی فرقہ تشکیل پائے گا۔

☆ لینن، ''اشتراکی انقلاب اور قوموں کا حق خود ارادیت''۔

پہلا باب

برصغیر ہندو پاکستان کے شمالی علاقے کی قدیم ترین آبادی

آثار قدیمہ سے ثابت ہوتا ہے کہ برصغیر ہندو پاکستان کے شمال مغربی حصے میں (جو اگست

1947 میں پاکستان بنا) پہلے بین برفانی (niterglacial) دور کے آخر میں بھی انسان رہا کرتے تھے۔اوراسی سے قدیم حجری عصر میں قدیم ترین آبادی کے تاریخی ارتقا کی منزلوں پر روشنی پڑتی ہے۔

پاکستان میں جوقدیم ترین اوزار پائے گئے ہیں وہ اول حجری عصر کے ہیں (قبل ازسوآن قسم کے پتھر کے بڑے ٹکڑوں کے اوزار)۔یہ پوٹھوہار کے میدان مرتفع، دریائے سوآن (سوہان) ضلع راولپنڈی) جھیلم دریا اور چناب دریا کی معاون ندیوں کی وادیوں میں ملے ہیں۔سنگ ریزوں اور پتھر کے ٹکڑوں سے بنائے ہوئے ترقی یافتہ اوزار سوآن اور سندھ دریاؤں کی وادیوں میں پائے گئے ہیں۔انہیں قدیم سوآن کے اوزار بھی کہتے ہیں☆۔

ایک طرف سلسلہ شوراور شملہ کے درمیان اور دوسری جانب پونچھ اور رھتاس کے بیچ میں جو پتھر کی پپڑیاں اور دھاردار پھل دریافت ہوئے ہیں ان سے برصغیر کے شمال مغربی حصے کے قدیم حجری عصر میں صنعت کے ارتقا کی کڑیاں ملتی ہیں۔یہ سب آخری سوآن کے آلات ہیں۔چنانچہ آثار قدیمہ سے پتہ چلتا ہے کہ حجری عہد کی

R.E.M. Wheeler, <<Wheeler, <<Five Thousand Years of Pakistan>> pp. 15_16;*

T.T. Paterson, H.J.H. Drummond, <<Soan. The Paleooithic of Pakistan>>

اصلی صنعت ایک مسلسل عمل تھا جو نچلے قدیم حجری عہد سے بلند قدیم حجری عہد تک مربوط منزلوں سے گزرا۔

نچلے قدیم حجری عہد سے بلند قدیم حجری عہد تک عبور نے انسانیت کے ارتقا میں اہم ترین دور کی ابتدا کی۔اب ایک حیاتیاتی نوع کی حیثیت سے انسان کی تشکیل ہوچکی تھی۔انسان نے ثقافت کے میدان میں ڈرامائی کامیابیاں حاصل کر لی تھیں۔ان میں پتھر او رہڈیوں کے اوزار بنانے میں بعض بنیادی حاصلات اور انسان کی نفسیاتی ساخت میں چند اہم تبدیلیاں شامل ہیں۔بلند قدیم حجری دور ہی میں فن نے جنم لیا۔اور وثوق سے کہا جاسکتا ہے کہ اسی زمانے میں پہلے مذہبی تصورات ظہور میں آئے۔

انسانوں نے گروہوں کی شکل میں رہنا شروع کر دیا، یہ زبردست تبدیلی تھی۔کئی نسلوں کے تاریخ

دانوں، ماہرین نسلیات اور عمرانیات کے عالموں نے جو تحقیقات کی ہیں ان کی بنیاد پر یہ دعوی کرنے کی جرأت کی جاسکتی ہے کہ اس دور میں ہی نوع انسانی (genus) اور جرگے نے تشکیل پائی۔

بلند قدیم حجری عہد کئی ہزار برسوں تک جاری رہا۔ اسی زمانے میں جب انسانوں نے پہلی بار گروہوں کی شکل میں رہنے کی کوشش کی اور مختلف حالات زندگی اور حیاتیاتی جغرافیائی ماحول کے مطابق وہ اپنے آپ کو ڈھالنے لگے تو بنیادی یا ابتدائی نسلوں کی تشکیل ہوئی۔ بنیادی یوریشیائی (یاEuropoid) نسل انسانوں سے آباد دنیا کے شمال مغرب میں اور بنیادی ایشیائی (یا منگولیائی) نسل اس کے شمال مشرق میں وجود میں آئی۔

برصغیر ہندو پاکستان کی آبادی کے متعلق علم قدیم انسانیات اور انسانیات کے شواہد سے پتہ چلتا کہ اس علاقے کے قدیم ترین باشندے بنیادی نسل خط استوائی یا نیگرو آسٹریلیائی سے تعلق رکھتے تھے۔ اس نسل کا ارتقا افریقی ایشیائی براعظموں کے وسیع وعریض خط استوا کے منطقے میں ہوا تھا۔

بلند قدیم حجری عہد میں انسانی ثقافت کے جو پہلے مقامی نمونے ظہور میں آئے ان کی خصوصیت یہ تھی کہ وہ آبادی کے بڑے بڑے گروہوں کے طویل اور جدا جدا ارتقا سے مربوط تھے۔ ماہرین آثار قدیمہ کا دعوی ہے کہ بلند قدیم حجری دور میں برصغیر ہندو پاکستان کا زیادہ تر حصہ، افریقہ اور مغربی ایشیا ایک واحد خزری (Caspian) ''ثقافتی خطے پر'' مشتمل تھے۔ لیکن پنجاب مستثنی تھا۔ یہاں بلند قدیم حجری دور کی صنعت میں بعض ایسی امتیازی خصوصیات تھیں جو پامیر کی شمالی دامنی پہاڑیوں اور شمال مشرق اور مشرق سے آگے مشرقی ایشیا کے علاقوں کی ہم عصر حجری صنعت سے ملتی جلتی تھیں۔

بلند قدیم حجری دور کے بعد وسطی حجری عہد شروع ہوا (تقریباً 15 ہزار اور 6 ہزار سال قبل از مسیح)۔ اور یہ اس وقت کی بات ہے جب برصغیر کے شمال میں برفانی دور ختم ہو رہا تھا۔

جب وسطی حجری عہد آیا تو پیداآور قوتوں میں مزید ترقی ہوئی۔ تیر کمان ایجاد ہوئے، پتھر سے نئے اوزار بنائے گئے جنھیں اصطلاح میں خورد اوزار سنگ (microlithe) کہتے ہیں جو پیوست (insert) کرنے کے کام آتے تھے۔ وسطی حجری عہد کے آخر میں پہلی بار مٹی کے برتن بننا شروع ہوئے۔ اسی دور میں جانور پالنے کی ابتدا ہوئی اور زمین پر کاشت کرنے کی کوشش کی جانے لگی۔ ماہی گیری انسان کی معاشی سرگرمی کا ایک بڑا حصہ بننے لگی۔ پیداآور قوتوں کی ترقی ہونے کے سبب لوگوں کا ایک حصہ

کم وبیش مستقل طریقے سے آباد ہونے لگا۔

گجرات، کاٹھیاواڑ، سکھر کے نزدیک شمالی سندھ، روھڑی اور برصغیر کے اس علاقے کے مختلف مقامات میں وسطی حجری عہد کے شکاریوں اور ماہی گیروں کی کئی آبادیاں دریافت ہوئی ہیں☆۔ ان علاقوں میں انسانی ڈھانچوں کے جو حصے برآمد ہوئے ہیں ان سے ایسا ٹھوس ثبوت نہیں ملتا کہ باشندوں کی آبادیوں کا انسانیاتی کردار بیان کیا جاسکے۔ لیکن بعض عالموں کا خیال ہے کہ برصغیر ہندو پاکستان کے بلند قدیم حجری دور کی ثقافتوں اور افریقہ اور مغربی ایشیا کی ہم عصر ثقافتوں (جو وسطی حجری عہد تک گھسٹتی رہیں) کے درمیان مشابہت کی تشریح ان کے بانیوں کے مشترکہ سرچشمے سے کی جاسکتی ہے☆☆۔

اس قدیم آبادی کی زبانوں کے متعلق بھی کوئی تاریخی شہادت

R.E.M. Wheeler, <<Early India and Pakistan to Ashoka>>, pp. 81_82.*

V.D. Krishnaswami, <<Stone Age India,>> p. 36.**

نہیں ملتی۔ لیکن چند عالموں کا قیاس ہے کہ علم انواع (typology) کے نقطہ نظر سے ان کا تعلق پاپوآ، انڈمان اور آسٹریلیا کے اصلی باشندوں کی زبانوں سے ہوسکتا ہے اور ان دوسرے نسلیاتی گروہوں کی زبانوں سے بھی جو خط استوا کے علاقے میں بسنے والے قدیم ترین قبائل کی اولاد تھے۔

علم انسانیات اور آثار قدیم کی شہادتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ وسطی حجری دور میں یوریشیائی لوگ، جو شمال مغرب سے آئی ہوئی بینادی نسل سے تعلق رکھتے تھے، تیزی سے نیگرو آسٹریلیائی گروہوں کے علاقے میں داخل ہوئے۔ ان دونوں کے اتصال سے وسطی حجری عہد کے آخر میں برصغیر ہندو پاکستان کی سرزمین پر انسانیاتی قسم کے دراوڑی گروہ☆ نے جنم لیا جس کا جنوبی یوریشیائی (یا ہندرومی) کی اقلیتی نسل سے تعلق تھا۔

یہ ذہن نشین کرنا ضروری ہے کہ دو بنیادی نسلوں کا باہمی اختلاط اور انسانیاتی قسم کے دراوڑی گروہ تشکیل برصغیر کے بیرونی (شمال مغربی، مغربی اور جنوب مغربی) خطوں میں زیادہ تیزی سے ہوئی۔ اندرونی علاقوں میں یہ عمل انتہائی سست تھا اور وہاں نیگرو آسٹریلیائی نسل کی انسانیاتی قسمیں (ویدوئی یا سیلون زوندی گروہ) جاری رہیں۔

اس دور کے آخر میں ایشیائی یا منگولیائی بنیادی نسل کے افراد برصغیر کے شمال مشرقی کنارے پر ظہور میں آئے۔ قدیم ترین نیگرو آسٹریلیائی آبادی سے ان کے اتصال کا ثبوت ہمیں منڈا قومیتوں کے منگولیائی خدوخال سے ملتا ہے جن کا مجموعی طور پر تعلق نیگرو آسٹریلیائی نسل سے ہے۔

برصغیر ہندو پاکستان کی سرزمین پر نسلی لحاظ سے مخلوط انسانیاتی قسموں کی تشکیل کا سبب کئی اہم تاریخ عوامل تھے جو قدیم معاشرے میں جاری تھے۔ برفانی دور ختم ہو جانے سے انسان کا حیاتیاتی جغرافیائی ماحول زیادہ موزوں ہو گیا اور آباد علاقوں میں آبادی تیزی سے بڑھنے لگی۔ اگر ہم اس زمانے کی قدیم معیشت کی وسعت کو پیش نظر رکھیں تو اضافی زائد آبادی کا ناگزیر ہونا سمجھ میں آ سکتا ہے۔ اس لئے انسان

☆اس کا جنوبی ہندستان کے موجودہ دراوڑی لوگوں سے تعلق نہیں ہے۔

مجبور ہو گیا کہ دوسرے غیر ترقی یافتہ اور غیر آباد علاقوں کا رخ اختیار کرے۔ وسطی حجری دور میں اوزاروں میں ترقی کی وجہ سے انسان نئے علاقوں میں پھیل سکا۔ وہ دیواریں جنھوں نے قرنوں تک بنیادی نسلوں کو ایک دوسرے سے علحدہ رکھا تھا اب منہدم ہونے لگیں۔

برصغیر ہندو پاکستان کے باشندوں کے انسانیاتی کردار میں جو تبدیلیاں ہوئیں وہ ان اہم تاریخی عوامل کا عکس تھیں جو وسطی حجری عہد کے خاتمے اور جدید حجری عہد کی ابتدا میں قدیم معاشرے میں ہو رہے تھے۔

ماہرین آثار قدیمہ کا خیال ہے کہ برصغیر کے شمالی حصے میں جدید حجری دور لگ بھگ 6 ہزار سال قبل از مسیح شروع ہوا۔ انیسویں صدی کے آخر اور بیسویں صدی کی ابتدا میں جو مطالعے کئے گئے ہیں ان سے ثابت ہوتا ہے کہ جدید حجری دور میں بلوچستان سے لے کر بنگال تک برصغیر کا تقریباً تمام شمالی علاقہ لوگوں سے آباد تھا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ آبادی اور نقل مکان دونوں تیزی سے بڑھ رہی تھیں۔

یہ برصغیر میں حجری دور کی تہذیب کا شباب تھا۔ اس تہذیب کو وسطی حجری عہد کی گذشتہ خورد اوزار سنگ کی ثقافتوں نے جنم دیا۔ ان علاقوں میں جہاں قدرتی ماحول موزوں تھا شکاریوں اور ماہی گیروں کے گروہوں نے کاشتکاری شروع کر دی۔ ابتدا میں برصغیر میں زرعی نخلستان چھوٹے چھوٹے دریاؤں کی پہاڑی وادیوں میں ابھرے☆۔ ان علاقوں میں جدید حجری عہد کی آبادیوں کے جو آثار کھودے گئے ہیں ان سے معلوم ہوتا ہے کہ وہاں کے باشندے پتھر اور کچی اینٹوں کے مکانوں میں رہا کرتے تھے اور اچھے

خاصے ظروف بناتے تھے (حالانکہ وہ کمہار کے چاک سے واقف نہ تھے)۔ وہ کتے اور بھیڑ بکریوں پالتے تھے۔ برصغیر کے شمال مغربی علاقے کی خورد اوزار سنگ کی صنعت کا خاص امتیاز باقرینہ اقلیدسی شکلیں ہیں۔ کاربن کے تجزیے سے معلوم

☆ بڑے دریا، جیسے سندھ اور اس کے معاون دریاؤں کی وادیوں میں کاشت کاری بعد عہد میں شروع ہوئی جب وہاں مصنوعی آبپاشی کا نظام رائج ہوا۔

ہوتا ہے کہ یہ آبادیاں 4 ہزار سال قبل از مسیح میں موجود تھیں ☆۔

پاکستان میں آثار قدیمہ کی کھدائی سے پتہ چلتا ہے کہ وہاں متصل زرعی ثقافتیں موجود تھیں۔ آبادی کے انفرادی گروہوں کی اپنی مقامی خصوصیات خواہ کچھ بھی ہوں لیکن تمام علاقے کو ایک واحد ثقافتی اور تاریخی صوبہ تصور کیا جاسکتا ہے۔ آثار قدیمہ کی شہادتوں سے یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ جدید حجری دور کے خاتمے اور حجری عہد کے بعد تانبے کا دور شروع ہونے کے وقت شمال مغربی ہندستان کی زرعی ثقافتوں کا ایران، جنوبی افغانستان، عراق اور وسطی ایشیا کے جنوبی علاقوں کی ہم عصر ثقافتوں سے گہرا تعلق تھا ☆☆۔ یہ سب ایک وسیع ثقافتی علاقے پر پھیلی ہوئی تھیں۔ انہیں ''رنگین ظروف کی ثقافت،، کہا جاتا ہے۔

برصغیر کے شمال کے تمام علاقوں میں زمین پر کاشت اور مویشی بانی بہ یک وقت شروع نہیں ہوئی۔ جدید حجری دور کے خاتمے کے وقت ان گروہوں کے درمیان جنھوں نے آباد ہو کر کاشتکاری اور مویشی بانی اختیار کر لیا تھی اور جو مختلف وجوہات کی بنا پر (مثلاً غیر موزوں حیاتیاتی جغرافیائی ماحول) ہنوز شکار، ماہی گیری، جنگلی پھل سبزیاں جمع کرتے تھے، معاشرتی اور ثقافتی ارتقا کی رفتار میں فرق تھا۔

انسان کی معاشی سرگرمیاں مختلف ہونے کا مختلف علاقوں میں آبادی میں اضافے کی شرح پر بھی اثر پڑا۔ شکار اور ماہی گیری والے علاقوں کے مقابلے میں زرعی خطوں میں آبادی زیادہ تیزی سے بڑھی۔

وادی سندھ میں ''رنگین ظروف'' کے دور میں پیدآور قوتیں بڑی تیزی سے بڑھیں۔ آثار قدیمہ سے پتہ چلتا ہے کہ جب قدیم جرگہ تنظیم ٹوٹنے لگی تو زمین کی کاشت میں اضافہ ہوا۔ اس وقت پتھروں کے اوزار اپنی مکمل ترین حالت میں تیار کئے جاتے تھے۔ ظروف کے جو ٹکڑے

W. A. F.airservis, <<Excavations in the Quetta Valley...>>, <<Archaeolo.* gical Surveys in the Zhob and and Loralai

Districts>>.

حوالے کے لئے دیکھئے۔

G. Mode, <<Das Friihe Indien>>, S.18_37;

J.M. Casal, <<Mundigak as a Link batween Petween Pakistan and Iran in Prehistory>>, pp. I_12; W.A. Fairservis, <<Excavations in the Quetta Valley...>>, p. 169; J.M. Casal, <<Fouilles be Mungigak>>, Vol. I, pp. 98-110 برآمد

برآمد ہوئے ہیں ان سے معلوم ہوتا ہے کہ اس زمانے میں کوزہ گری اپنے عروج پر تھی۔ اسی طرح فن تعمیر نے بھی کافی ترقی کر لی تھی۔ اسی دور کے آخر میں تانبے اور کانسے کی مصنوعات شروع ہوئیں☆۔

کوٹ ڈیجی (دریائے سندھ کے مشرق اور خیر پور کے جنوب میں 15 میل کے فاصلے پر) میں کھدائی کے بعد اس عہد کی ایک مثالی نو آبادی کا پتہ چلا ہے۔ کاربن کے تجزیے سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ آبادی 28ویں صدی اور 26ویں صدی قبل از مسیح میں تھی☆☆۔ یہی وہ زمانہ ہے جس کے بعد وادی سندھ میں طبقاتی معاشرے کی تہذیب ابھری۔ اس سلسلے میں یہ بات دلچسپ ہے کہ اس آبادی کے پتھر اور کچی اینٹوں سے بنے ہوئے مکانات کے چاروں طرف قلعہ کی دیوار ہے☆☆☆۔

جتنی شہادتیں دستیاب ہیں ان کی بنا پر ہم اس ثقافت کے بانیوں کی نسلیاتی خصوصیات معین نہیں کر سکتے۔ یہ قبل از مسیح 4 ہزار سالہ عہد کے آخر اور 3 ہزار سالہ عہد کے شروع میں وادی سندھ میں آباد تھے۔ لیکن ثقافت کی طرز سے اس پر کوئی شبہ نہیں کیا جا سکتا کہ قلعہ بند آبادیاں (جیسے کوٹ ڈیجی) قبائلی اتحاد یا وفاق کا مرکز تھیں جو علاقائی طور پر متعلق قبائل نے قائم کئے تھے۔ اور یہ اس دور کی بات ہے جب قدیم جرگہ تنظیم ٹوٹنے لگی تھی۔

3 ہزار سال قبل از مسیح کی ابتدا میں سندھ اور اس کے معاون دریاؤں کی وادیوں میں طبقاتی معاشرہ ابھرنے کا عمل شروع ہو گیا تھا اور ریاست کی پہلی تشکیلوں کا ظہور ہونے لگا تھا۔ برصغیر کے شمال مغرب میں ایک قدیم ترین انسانی تہذیب ___ وادی سندھ کی تہذیب ابھری۔ اسے ہم عارضی طور پر ہڑپہ تہذیب کہیں گے۔

☆☆☆

ہڑپہ تہذیب بے حد وسیع رقبے پر پھیلی ہوئی تھی۔ شمال سے جنوب تک (سیوالک پہاڑوں کے دامن سے لے کر تاپتی دریا تک) جس کا فاصلہ 1100 کلومیٹر تھا، اور مغرب سے مشرق تک (کوئٹہ سے بیکانیر اور گنگا جمنا کے دوآبے میں عالمگیر پور تک) بھی اتنا ہی فاصلہ تھا۔

W.A. Fairservis, <<Excavations in the Quetta Valley...>>, p. 231.*

R.E.M. Wheeler, <<The Indus Civilization>>, p. 15.**

F.A. Khan, <<Preliminary Report on Kot Diji Excavations>>.**

اس علاقے میں کئی شہری اور دیہی آبادیاں کھودی گئی ہیں۔ ہڑپہ تہذیب کے اہم ترین مرکز ہڑپہ (مغربی پنجاب کے ضلع ساہیوال میں راوی دریا کے کنارے)، موہنجوڈارہ (سندھ کے ضلع لڑکانہ میں)، چانھوڈارو (سندھ کے ضلع نواب شاہ میں)، روپڑ (مشرقی پنجاب کے ستلج دریا کے جنوب میں)، رنگپور (کاٹھیاواڑ جزیرہ نما میں) اور کالی بنگن (شمالی راجھستان میں) تھے۔ کیچ کی وادی میں (مکران) شاہی تمپ مغرب میں ہڑپہ تہذیب کی غالباً سب سے آخری بستی تھی۔

اس لحاظ سے وادی سندھ کی تہذیب وادی نیل اور دجلہ وفرات کی وادیوں کی قدیم تہذیبوں کے مقابلے میں زیادہ بڑے علاقے پر محیط تھی۔ اب اس کی تصدیق ہوچکی ہے کہ وادی سندھ ہی وہ مرکز تھا جہاں سے مشرق کی جانب اس کے بائیں جانب والے معاون دریاؤں کے کنارے، جنوب کی طرف برصغیر کے مغربی ساحل پر اور مغربی میں مکران کے ساحل پر یہ تہذیب جا کر پھیلی۔

آثار قدیمہ کی شہادتیں بتاتی ہیں کہ ہڑپہ تہذیب مختلف دوروں سے گزری، اور وہ اگرچہ مربوط وحدت تھی لیکن الگ الگ علاقوں میں مقامی ثقافتی امتیازات اور خصوصیات بھی موجود تھیں۔ ان میں سے جن علاقوں کو ہم ایک دوسرے سے ممیز کر سکتے ہیں وہ یہ ہیں: کالی بنگن، رنگپور لوتھال، روپڑ عالمگیر پور، شمال مشرقی بلوچستان وغیرہ۔ بعض عالموں کی یہ رائے کہ سندھ کی تہذیب یکساں اور جامد تھی صحیح نہیں ہے۔

ہڑپہ تہذیب کی ابتدا ایک مدت سے نزاعی مسئلہ بنی ہوئی ہے۔ بعض عالم اس خیال کے حق میں دلائل پیش کرتے ہیں کہ وہ مقامی سرزمین پر پروان نہیں چڑھی بلکہ بیرونی حملہ آور اسے وادی سندھ میں لائے۔ یہ ثابت کرنے کی کوشش کی جاتی ہے کہ حملہ آور ایسے "قدیم ہند یورپی لوگوں سے تعلق رکھتے تھے جنہوں نے تاریخ میں اپنا مقام بنالیا تھا"، اور وہ 3 ہزار سال قبل از مسیح کے شروع کے برصغیر کے شمال مغربی علاقے میں داخل ہوئے۔ بعض پاکستانی مورخین کی رائے میں ہڑپہ اور موہنجوڈارو کی تہذیب ان آریائی قبیلوں کی مرہون منت ہے جو قدیم زمانے میں وادی سندھ میں وارد ہوئے تھے☆۔ کچھ عالم

K.A. Rashid, <<New Light on Ancient History of Pakistan>>, p. 67.*

سمجھتے ہیں کہ اصل ہندستانی تہذیب کے سوتے مغربی ایشیا کی قدیم تہذیب سے نکلتے ہیں، خاص کر سمیری تہذیب سے۔ وہ سندھ کی تہذیب کو اصل ماننے سے انکار کرتے ہیں اور ہڑپہ تہذیب کو سمیری تہذیب کی مشرقی شاخ یا اس کی صوبائی شکل سمجھتے ہیں☆۔

حالیہ علمی معلومات کی روشنی میں ضرورت اس بات کی ہے کہ تمام نظریات پر نظر ثانی کی جائے۔ آثار قدیمہ کے شواہد سے ثابت ہوتا ہے کہ سندھ کی تہذیب اپنی ہی سرزمین پر پروان چڑھی، اور وہ برصغیر کے شمال مغربی علاقے میں اصلی زرعی ثقافتوں کے ترقی پسند تاریخی ارتقا کا نتیجہ تھی☆☆،

سندھ کی تہذیب اصل تھی۔ اس کے مغربی ایشیا کی ہم عصر تہذیبوں اور خاص کر قدیم سمیری تہذیب سے رابطے، یہاں تک کہ میل رشتے ہو سکتے ہیں۔ سندھ کی تہذیب اور سمیری تہذیب میں مماثلت اس لئے نظر آتی ہے کہ ان کی معاشی بنیاد یکساں تھی (وادی سندھ اور دجلہ وفرات کی وادیوں میں معیشت کی ریڑھ کی ہڈی نہری زمین پر کاشت اور مویشی بانی تھی☆☆☆)۔ اس کے علاوہ سمیر کے شہروں اور شمال مغربی ہندستان کے قدیم مرکزوں کے درمیان باقاعدہ اور مسلسل رشتے بھی تھے۔ اگر یہ تسلیم کر بھی لیا جائے کہ ان تعلقات کی وجہ سے سندھ کی تہذیب نے سمیری تہذیب کی چند ممتاز خصوصیات جذب کر لی تھیں تو اس سے اس کا تابع کردار ثابت نہیں ہوتا۔ اس کا سبب یہ ہے کہ تاریخ کی ترقی کا جوہر معاشرے کا اندرونی معاشی اور معاشرتی ارتقا دوسری تہذیبوں کی بعض ممتاز خصوصیات کو جذب کرنے کا اور اس پر اپنا اثر ڈالنے کا موقع فراہم کرتا ہے۔ اپنے اندرونی ارتقا کے بغیر دوسری تہذیب کے اثرات

قبول کرنا ممکن نہیں ہے۔

وادی سندھ کی ابتدائی تہذیب کے مربوط مطالعہ سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ ''4 ہزار اور 3 ہزار سال قبل از مسیح سمیری شہری ریاستوں کی

H.S. David, <<Some Futher Contacts and Affinities...>>, pp. 59-62.*

R.E.M. Wheeler, <<Harappa 1946...>>, p. 59; A. fairservis, <<Excava-** tions in the Quetta Valley Valley...>>, p. 355; <<Before Mohenjo-Daro>>, p. 866.

V. Gordon Childe, <<New Light on the Most Ancient East>>.***

ثقافت سے کمتر نہیں، تھی۔ ابھی تک قدیم ہڑپہ زبان کو پڑھا نہیں گیا ہے۔ اسی لئے فی الحال سندھ کے معاشرے کے معاشرتی ڈھانچے کے جامع طور پر کردار، ریاست کی بنیادی شکلوں کے تجزیے یا ان کے ارتقا کی تاریخ کو بیان نہیں کیا جا سکتا۔ لیکن جو بھی معلومات دستیاب ہیں ان سے بعض عالم یہ نتیجہ اخذ کرتے ہیں کہ سندھ کی تہذیب ابتدائی غلامی کے معاشرے کی تہذیب تھی☆۔

وادی سندھ میں طبقاتی معاشرے کی تشکیل کے ساتھ ساتھ برصغیر کے شمال مغربی علاقے میں بسنے والی نسلیاتی آبادی کی تاریخی ساخت میں اہم کیفیتی تبدیلیاں بھی ہوئیں۔ وادی سندھ کے تجارت اور دستکاری کے کثیر آباد مرکزوں میں (موہنجوڈارو کی آبادی ایک لاکھ سے کم نہیں تھی) قبائلی علحدگی تیزی سے ختم ہونے لگی۔ شہروں اور پڑوسی دیہات کے باشندوں کے درمیان دیواریں گرنے لگیں کیوں کہ دیہی لوگ بڑے بڑے مرکزوں کا رخ کرنے لگے۔ خون اور شادی کی بنا پر قبائلی رشتے کمزور ہوتے گئے اور ان کی جگہ روز افزوں مضبوط علاقائی تعلقات لینے لگے۔ جب غلامی کی تشکیل قائم ہوگئی تو قبائل اور قبائلی اتحاد، جو قدیم جرگہ طریقہ پیداوار کے ارتقا کی آخری منزلوں میں ترقی کر چکے تھے، اصل سندھ غلامی نظام کی قومیت کی طرح (یا زبان اور ثقافت کے مطابق کئی قومیتوں میں) مستحکم ہو گئے۔

اصل سندھی قومیت یا کئی قومیتوں کے وجود کا ہمیں یقین کیوں ہے؟ سب سے پہلے اس کا اظہار

اصلی سندھی تہذیب کی ہم نوعی میں ملتا ہے۔اس ہم نوعی سے پتہ چلتا ہے کہ اس کے خالقوں کا علاقائی اور ثقافتی فرقہ تھا جس کا تاریخ کے دوران ارتقا ہوا اور ان کے درمیان معین اور نسبتاً مستحکم معاشی رشتے تھے۔

ہڑپہ تہذیب کی ہم نوعی

☆ اکادمیشین استرووے کا خیال ہے کہ ''ہڑپہ کا معاشرہ غلامی نظام کا تھا اور سمیر معاشرے سے ملتا جلتا،،۔وادی سندھ کی ریاست اس وقت وجود میں آئی جب قدیم جرگہ نظام کی بنیادیں ختم نہیں ہوئی تھیں اس لئے اس نے'' آسانی سے مطلق العنانی کی شکل اختیار کر لی ہوگی،،۔پیگولیفسکا یہ کے ساتھ مشترکہ تصنیف میں استرووے وادی سندھ کی ریاست میں تعلقات پیداوار کی بابت لکھتے ہیں کہ وہ ''نیم غلامی اور نیم پدرشاہی،، کے تھے۔

تہذیب کے ایک وسیع علاقے کے اندر مختلف خطوں کے درمیان صدیوں تک معاشرتی اور معاشی رابطوں کے دوران میں ہی پروان چڑھی ہوگی ☆۔'' تاریخ داں معقول اسباب کی ہی بنا پر وادی سندھ کی آبادی کو انفرادی قبائلی کا ایک ایسا گروہ نہیں سمجھتے جو ایک دوسرے سے تقریباً بے تعلق تھے بلکہ اسے سمیری یا قدیم مصری قومیت کی طرح تصور کرتے ہیں جس نے ایسی وسیع ثقافت تخلیق کی تھی۔،،

سندھ وادی میں بسنے والے مختلف قبائلی کے درمیان نوع بنوع رابطوں کا نتیجہ یہ نکلا کہ ایک طرف قرابت والے قبائل کی بولیاں آپس میں متصل ہوگئیں اور دوسری جانب ایک قبائلی گروہ کی زبان کو دوسرے گروہوں نے جذب کر لیا۔آج یہ کوئی نہیں بتا سکتا کہ اصل سندھی قومیت کی زبان کتنی ترقی یافتہ تھی۔ظاہر ہے کہ بات چیت میں مقامی بولیوں کا فرق ختم نہیں ہوا (ایسا ہو بھی نہیں سکتا تھا)۔لیکن ان میں سے ایک مقامی بولی جس کا رسم الخط تھا ہڑپہ تہذیب کی اقلیم میں شاید جگت بھاشا بن گئی ہو۔

قدیم وادی سندھ کی تہذیب کے بانیوں کے نسلیاتی الحاق کا مسئلہ ہنوز طے نہیں ہوا ہے۔اس سلسلے میں علم انسانیات کی معلومات محدود ہیں۔اس لئے سندھ اور اس کے معاون دریاؤں کی وادیوں میں بسنے والی آبادی کے انسانیاتی کردار کے بارے میں قطعاً کچھ نہیں کہا جا سکتا۔صرف ایک حقیقت پر باور کیا جا سکتا ہے __ 4 ہزار اور 3 ہزار سال قبل از مسیح وادی سندھ کی آبادی غیر متوازن تھی ☆☆۔اس میں شبہ نہیں کہ زیادہ تر جنوبی یورپی (یا ہندرومی) اقلیتی نسل سے تعلق رکھنے والی قسمیں وہاں آباد تھیں۔بعض عالموں کی رائے ہے کہ ان انسانیاتی قسموں کی خصوصیات اور دجلہ وفرات اور جنوب مغربی ایران کی قدیم

آبادی کی خصوصیات مشترکہ تھیں☆☆☆۔ یہ بھی یقینی ہے کہ

☆ آثار قدیمہ کی شہادتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ ہم نوعی مقامی ثقافتی روایات کا امتزاج تھی

(حوالے کے لئے: S.K. Dikshall, <<An Introduction to Archaeology>>.)

J. Marshall, <<Mohenjo-Daro and the Indus Civilization...>>, Vol. I, ** pp. 107-108.

E. J. H. Mackay, <<Chanhu-daro Excavations 1935-1936>>,*** pp. 256_257.

اصلی آسٹریلیائی (نیگرو آسٹریلیائی) قسمیں بھی موجود تھیں۔ بعض حقائق سے معلوم ہوتا ہے کہ منگولیائی آمیزش بھی تھی☆۔ لیکن اس کے مزید مطالعہ اور تصدیق کی ضرورت ہے۔ چنانچہ کہا جاسکتا ہے کہ اصل سندھی قومیت کی خصوصیت اس کی انسانیاتی قسموں کی نوع بنوع ساخت تھی۔ چنانچہ مختلف نژادوں سے تعلق رکھنے والے قبائل نے اس قومیت کی تشکیل کی جس نے ہڑپہ تہذیب کو جنم دیا۔ آباد زرعی معیشت کو نہری آبپاشی کی ضرورت ہوتی ہے۔ اس لئے یہ قابل فہم ہے کہ بیچ رنگ عناصر کو شیر و شکر ہوکر ایک ہم نوع قومیت بننے میں زیادہ عرصہ نہیں لگا ہوگا۔ کیا اصل سندھی نسلیاتی فرقے کی لسانی درجہ بندی کرنا ممکن ہے؟

تاریخی ادب میں مدت سے یہ خیال آرائی کی جارہی ہے کہ ہندیورپی (ہند آریائی) لوگوں کے برصغیر کے شمال مغربی علاقے میں آنے سے پہلے کے دور میں یعنی لگ بھگ 2 ہزار سال قبل از مسیح جو آبادی وہاں بسی ہوئی تھی وہ دراوڑی شجرہ کی ایک زبان (یا زبانیں) بولتی تھی☆☆۔ یہ بھی ممکن ہے کہ اس علاقے کے شمال مغرب اور مغرب میں بڑے رقبے پر دراوڑی بولنے والے لوگ رہتے ہوں۔

مندرجہ ذیل حقائق اس خیال آرائی کی تصدیق کرتے ہیں۔

دراوڑی زبانوں اور قدیم مغربی ایشیا کی زبانوں میں رشتے موجود تھے___ اس سے انکار نہیں کیا جاسکتا۔ اس سے یہ نتیجہ نکالا جاسکتا ہے کہ پرانے زمانوں میں ان زبانوں کے بولنے والوں میں علاقائی رابطے بھی تھے۔ اس کی بھی شادتیں ملتی ہیں کہ دراوڑی زبانوں کا اوگری (Ugric) (فنی اوگری) زبانوں

کے شجرہ سے تعلق تھا☆☆☆۔ یہ رابطے ہند یورپی قبائلی اور قومیتوں کے وسطی ایشیا میں داخل ہونے سے پہلے کے عہد میں قائم ہوئے ہوں گے، یعنی 3 ہزار سال قبل از مسیح کے بعد نہیں۔

E.J.H. Mackay, <<Chanhu-Daro Excavations 1935-1936>>, p. 259.*

E.J. Rapson, <<Ancient India>>, p. 42; A. Stein, <<The Indo-Iranian** Borderlands...>>, p. 201.

O. Schrader, <<Drwidisch und Uralisch>>, S 81__112; <<On The ***

<<Uralian>> Element in the Dravida and Munda Languages>>, pp. 751__762.

سوویت عالموں نے جو قدیم انسانیاتی تحقیقات کی ہیں ان سے پتہ چلتا ہے کہ 4 ہزار سال 2 ہزار سال قبل از مسیح تک جنوبی ترکمانیہ اور جزیرہ آرال کے جنوبی علاقوں کی آبادی میں دراوڑی قسمیں موجود تھیں۔ قدیم مورخوں نے بھی لکھا ہے کہ ایران کے جنوب مشرقی حصے اور بلوچستان میں ایشیائی حبشی آباد تھے۔ سیاہ فام ہونے کے سبب ان حبشیوں کا دراوڑی گروہ کی انسانیاتی قسموں سے تعلق معلوم ہوتا ہے۔ ظاہر ہے کہ انسانیاتی قسم کا براہ راست لسانی درجہ بندی سے تعلق نہیں ہوسکتا۔ لیکن ہم یہ حقیقت بھی نظر انداز نہیں کر سکتے کہ قدیم ایرانی رسم الخط پیکانی میں جو لوحیں پائی گئی ہیں ان میں مندرجہ بالا باتوں کا ذکر ملتا ہے۔ وہ ''اکوفاسیہ'' ☆ لوگوں کے بارے میں بتاتی ہیں جنھیں کوفچ (کوفج یا کوج) لوگ شناخت کرنا چاہئے۔ قرون وسطی میں مسلم عالموں نے ان کا اکثر ذکر کیا ہے☆☆۔

''حدود العالم'' کے مصنف نے لکھا ہے کہ کوفج سات قبائل میں منقسم تھے اور اپنی ہی زبان بولتے تھے۔ غالباً اس کا تعلق دراوڑی سے تھا۔ آج بھی اس علاقے میں دراوڑی بولنے والوں کے انفرادی گروہ آباد ہیں۔ بعض محققین کا خیال ہے کہ یہ قدیم باشندے نسلی طور پر اکوفاسیہ کوفج کی ہی اولاد ہیں۔

پرانی ایرانی لوحوں (دارا اول کے تخت جمشید کے دور کی ایک لوح، بے ہستون لوح وغیرہ) میں ماکا لوگوں اور ان کے ملک کے حوالے ملتے ہیں۔ یہ آج بھی ایک جغرافیائی مقام ہے__ مکران (قرون

وسطی

☆قدیم فارسی لفظ''کوفا''(کوہستان) سے اخذ ہے___ کوہستانی۔

☆☆ایک گمنام مصنف کی تصنیف''حدود العالم'' میں جو جغرافیہ کے موضوع پر ہے اور دسویں صدی کے آخر میں لکھی گئی کوفجیان کو ایران کے جنوب مشرقی کنارے کرمان پہاڑ پر آباد بتایا گیا ہے۔نظام الملک نے''سیاست نامے'' میں لکھا ہے کہ کوفجیان کرمان کے قریب رہتے تھے۔عرب جغرافیہ داں الاستخری نے بھی کتاب''مسالک الممالک'' میں ان لوگوں کے علاقے کو کرمان کا مشرقی حصہ کہا ہے۔ ناصر خسرو نے''سفرنامے'' میں لکھا ہے کہ کوفج آبادیاں کرمان کے مغرب میں بیابان نامی علاقے میں غالبًا گیارہویں صدی تک باقی رہیں۔

کے مصنفین نے اسے مکوران یا ماکوران لکھا ہے)☆۔یہ ایران کے جنوب مشرق میں اور پاکستان کے بلوچستان صوبے کے مغرب میں واقع ہے۔ بہت سے عالموں کا خیال ہے کہ ماکا لوگ دراوڑی تھے☆☆۔

اس کا ایک اور ثبوت کہ دراوڑی بولنے والے ایک زمانے میں برصغیر ہندو پاکستان کی مغربی اور شمال مغربی سرحدوں کو پار کر کے دور دور تک پھیل گئے تھے اس حقیقت سے بھی ملتا ہے کہ چند صدیاں پہلے تک سیستان کی آبادی کا ایک حصہ دراوڑی زبان بولتا تھا۔ایک مغربی مورخ سائیکس نے لکھا ہے کہ موجودہ سربندیوں کا ایرانی بولنے والا نسلیاتی گروہ جس کے بروہیوں سے نسلی رشتے ہیں سیستان کے قدیم باشندوں سے ہی تعلق رکھتا ہے۔ممکن ہے کہ دسویں صدی میں خوزستان میں بولی جانے والی انجانی زبان خوز یا دراوڑی زبان ہو جسے الاستخری نے غیر عبرانی، غیر سریانی اور غیر فارسی (''لیس بعبرانی ولا سریانی والا فارسی'') کہا ہے☆☆☆۔

آج کل کے پاکستان میں بروہی قومیت جو بلوچستان کے مرکز میں آباد ہے قدیم دراوڑی بولنے والی آبادی کی ہی باقیات ہے۔بروہی زبان کے علمی مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کا ارتقا طویل عرصے تک دوسری دراوڑی زبانوں سے بے تعلق علحدہ ہوتا رہا۔

جنوبی ہندستان میں دراوڑی زبانیں بولنے والوں کی موجودہ تقسیم سے ظاہر ہوتا ہے کہ ایک زمانے میں دراوڑی لوگ ایسے علاقوں میں آباد تھے جو ان کی موجودہ سکونت گاہوں کے شمال اور مغرب بعید میں

تھے☆☆☆☆۔

☆مارکو پولو نے اسے ''مکوران کی بادشاہت'' بتائی ہے اور ''مغرب اور شمال مغرب میں ہندستان کی آخری اقلیم'' (مارکو پولو کی کتاب)۔

R.N.Rrye, <<Remarks on Baluchi History>>, pp. 45_46**

☆☆☆الاستخزی، ''کتاب مسالک الممالک،،، صفحہ 91۔

☆☆☆☆لسانی طور پر تامل اور یلیگو اور دوسرے سے بہت مختلف دراوڑی زبانیں ہیں، حالانکہ 2 ہزار سال تک ان کی مشترک سرحد تھی۔ ساتھ ہی گونڈوں کی زبان جو آج کل تیلیگو کے شمال میں رہتے ہیں ان دونوں زبانوں کی کھچڑی ہے۔ اس لئے یہ نتیجہ اخذ کیا جا سکتا ہے

مزید برآں، ہند آریائی زبانوں کے ابتدائی دور کے مطالعہ سے بھی اس نظریے کی تصدیق ہوتی ہے کہ ہڑپہ تہذیب کے عہد میں برصغیر کے شمال مغربی علاقے کی آبادی دراوڑی تھی۔ یہ ثابت ہو چکا ہے کہ اس دور میں ان زبانوں پر ذیلی لحاظ سے اثر انداز نہیں ہوئی ☆۔ اگر سندھ اور اس کے معاون دریاؤں کی وادیوں کے لوگوں کی زبان دراوڑی زبانوں کے علاوہ کوئی دوسری ہوتی تو یہ ممکن نہیں ہوتا۔

جدید معنوں میں اصطلاح دراوڑی کا 3 ہزار سے 2 ہزا سال قبل از مسیح تک برصغیر کے شمال مغربی علاقے میں رہنے والے لوگوں پر اطلاق نہیں کرنا چاہئے۔ زیادہ صحیح یہ ہوگا کہ اسے ابتدائی نسلیاتی مجموعہ یا ابتدائی نسلیاتی فرقہ کہا جائے۔ ہم اسے اصل دراوڑی کہہ سکتے ہیں۔ اصل دراوڑی فرقہ جس نے قدیم ترین تہذیب کی داغ بیل ڈالی اس کا تولیدی رشتہ دریائے سندھ کی وادی میں اس آبادی سے ملتا ہے جو وہاں جدید حجری عہد میں بسی ہوئی تھی۔ یہاں ہمیں دراوڑی مسئلے کے حل کے سلسلے میں انتہائی سوفسطائی پہلوؤں سے بحث کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ عالموں نے جو معلومات جمع کی ہیں ان کی روشنی میں بعض دعووں کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے: دراوڑی 2900 سال قبل از مسیح شمال مغربی دروں بولان اور خیبر سے برصغیر پہنچے جس طرح کہ ایک ہزار برس بعد آریہ وہاں آئے ☆☆۔ نقل مکان کے ان نظریات کے مطابق جن لوگوں نے قدیم ہندستان میں پہلی تہذیب کی بنیاد ڈالی وہ دراصل بحیرہ روم کے علاقے سے آئے تھے۔ ان نظریات کی بنا پر نسل کے لحاظ سے مقامی قدیم آبادی نے، جو زیادہ تر ویدوئی (Veddoid) عنصر پر مشتمل تھی، ہندستان کی تاریخ میں مثبت رول ادا نہیں کیا۔ وجہ

کہ تیلیگو بولنے والوں کے جدامجد کبھی گونڈوانے کے شمال میں رہتے ہوں گے، شاید مغربی ہندستان میں، اورنو واردوں نے ان کو وہاں سے بھگا دیا ہوگا۔

G.A. Grierson, <<Linguistic Survey of India>>, Vol. IV. p. 278.*

E.J. Rapson, <<Ancient India>>, pp. 28_29, 41; H.S. David, <<The** Original Home of the Dravidians...>>, p. 80.

یہ تھی کہ اس نے جو جدید حجری تہذیب قائم کی تھی اسے شمال مغرب سے آنے والے نو واردوں کی بلند تر تہذیب نے تتر بتر کی دیا☆۔

نئے نسلیاتی عناصر کے ظہور سے (جس کا نتیجہ بعض اوقات اصلی مقامی آبادی کے انفرادی گروہوں کے بھگانے یا انہیں جذب کرنے میں نکلتا ہے) ہر علاقے میں تہذیبی تبدیلی ہوتی ہے۔ لیکن وادی سندھ میں نئی بلند تر تہذیب ابھرنے کا سبب بحیرہ روم کے ترقی پذیر لوگوں کی آمد نہیں بلکہ مقامی اصلی معاشرے میں پیدا آورقوتوں کی نشو ونما تھا اس سلسلے میں غذا جمع کرنے کی معیشت سے پیدا کرنے کی معیشت کا عبور بنیادی اہمیت کا حامل ہے__ یعنی شکار، ماہی گیری اور جنگلی پھل وغیرہ جمع کرنے سے زمین پر کاشت کرنے اور مویشی بانی کا، حجری صنعت سے دھات کے اوزار بنانے کا عبور۔ پیدا آور قوتوں کی نشو ونما کی وجہ سے معاشی زندگی، کنبے، نظریے اور فن میں تبدیلیاں ہوئیں۔ 4 ہزار سال اور 3 ہزار سال قبل از مسیح کے درمیان ان تبدیلیوں کا مجموعی طور پر نتیجہ اور تہذیب کی تبدیلی میں نکلا جس سے ہم بحث کر رہے ہیں۔

☆☆☆

3 ہزار سال اور 2 ہزار سال قبل از مسیح برصغیر کے شمالی علاقے میں صرف ہڑپہ اور موہنجوڈارو کی مقامی تہذیب ہی پروان نہیں چڑھی۔ اس کے مشرق میں جب مشرقی ہند میں جدید حجری تہذیب نے ترقی کی تو کاشتکاری کی ثقافت ظہور میں آئی جو ہڑپہ تہذیب کے ہم عصر اور متوازی تھی۔ اسے ہم عارضی طور پر ”تانبے کے ذخیروں اور پیلے ظروف کی تہذیب،، کہیں گے☆☆۔

اس تہذیب کا گہوارہ نشیبی گنگا کی جنوبی سرزمین سے ہوتا ہوا شمال مغرب کی جانب پہنچتا تھا۔ اپنے عروج کے وقت ”تانبے کے ذخیروں

Ch. Furer-Haimendorf, <<New Aspects of the Dravidian Problem...>>,* pp. 129_132.

B.B. Lal, <<Further Copper Hoard from Gangetic Basin...>>, pp. **

33, 38; <<Protohistoric Investigation>>, p. 98; R.E.M. Wheeler, <<Early India and Pakistan to Ashoka>>, pp. 118_127.

اور پیلے ظروف کی تہذیب،، اتنے ہی وسیع رقبے پر محیط تھی جتنی کہ ہڑپہ تہذیب۔

’’تانبے کے ذخیروں اور پیلے ظروف کی تہذیب‘‘ کے خالقوں کے نسلیاتی رشتوں کے متعلق عالموں میں بحث ہوتی رہی ہے۔ بعض کا خیال ہے کہ ان کا تعلق اسی قومیت سے تھا جس نے ہڑپہ تہذیب کی بنیاد ڈالی۔ انہیں ’’مغربی حملہ آوروں‘‘ کے دباؤ کی وجہ سے گنگا کی وادی کا رخ اختیار کرنا پڑا☆۔ دوسروں کی رائے میں یہ ویدی آریاؤں کی تہذیب تھی☆☆۔ جدید ترین شہادتوں سے یہ نتیجہ اخذ کیا جا سکتا ہے کہ ’’تانبے کے ذخیروں اور پیلے ظروف کی تہذیب،، کے بانی ان قبائل سے تعلق رکھتے تھے جن کی بولیاں آسٹریلیائی ایشیائی زبان کے شجرہ سے نکلی تھیں☆☆☆۔

بونگارد لیون اور دیوپک جیسے سوویت عالموں کی رائے ہے کہ یہ قبیلے موجودہ مندا لوگوں کے جد امجد تھے جن کی اکثریت آج کل مدھیہ پردیش کے پہاڑی علاقوں اور بہار اور اڑیسہ میں رہتی ہے۔ یہ دعوی صحیح معلوم ہوتا ہے۔

مندا لوگوں کا ابتدائی نسلیاتی سرچشمہ کئی اجزا پر مشتمل تھا۔ بلاشبہ ان میں خاص عنصر سب سے قدیم نیگرو آسٹریلیائی (ویدوئی) آبادی تھا جو برصغیر میں رہتی تھی۔ اس میں بھی شبہ نہیں کہ ان کے رشتے برصغیر کے شمال مغربی حصے میں رہنے والی اصلی دراوڑی قومیت (قومیتوں)، جنوبی ہند کے دراوڑوں اور ہند چین جزیرہ نما کے منگولیائی قبیلوں سے بھی تھے۔ ان رشتوں کے باوجود یہ بھی صحیح ہے کہ مندا کے جد امجد نے ہی اصلی ’’تانبے کے ذخیروں اور پیلے ظروف کی تہذیب،، کو پروان چڑھایا۔ آثار قدیمہ کی شہادتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ ان آباد قبائل کی تہذیب تھی جو قدیم جرگہ نظام کے انتشار کے دور سے گزر رہے تھے۔

S. Piggott, <<Prehistoric India...>>, p.238.*

D. H. Gordon,<<The Prehistoric Background ofIndian Culture,** pp. 149_152.

S.K. Chatterji, <<Indo-Aryan and Hindi>>, p. 37; B.B. Lal,*** <<Further Copper Hoards from Gangetic Basin>>, pp. 38_39.

تلواروں کے ملنے سے پتہ چلتا ہے کہ اس فرقے میں جنگ اور لوٹ مار عام تھی۔ ہل سے کاشت، شکار، اور ماہی گیری منڈا لوگوں کے جد امجد کا خاص پیشہ تھا اور ان کی ثقافت کی معاشی بنیاد۔ لسانیاتی معلومات بتاتی ہیں کہ برصغیر کے شمال مشرقی علاقے میں رہنے والے قدیم قبائل سبزیاں اگاتے تھے اور مرغ بانی کرتے تھے۔ اور غالباً وہ پہلے لوگ تھے جنھوں نے ہاتھیوں کو پالنا شروع کیا۔ قیاس کیا جاتا ہے کہ ان قبائل سے ہی ہڑپہ تہذیب کے بانیوں نے ماتر دیوی کا عقیدہ حاصل کیا جو وادی سندھ میں قبل از مسیح 3 ہزار سال اور 2 ہزار سال کے پہلے نصف میں وسیع پیمانے پر رائج تھا۔

ہمارے پاس جو شہادتیں موجود ہیں ان سے یہ نتیجہ نکالا جاسکتا ہے کہ 2 ہزار سال قبل از مسیح کے درمیان برصغیر ہندو پاکستان کے شمالی علاقے میں پیچیدہ نسلیاتی عمل کے بعد دو قدیم ترین نسلیاتی مجموعے ابھرے: مغرب میں اصل دراوڑی اور مشرق میں اصل مندا۔ ان دونوں کے درمیان سرحدی لکیر دھلی پر سے گزرتی تھی۔ لیکن ان کی باہمی رسائی سے بالکل انکار نہیں کیا جاسکتا۔ ہوسکتا ہے کہ مندا کے جدامجد کے بعض انفرادی گروہ مغرب کی طرف چلے گئے ہوں اور اصل درواڑی مشرق کی جانب آ گئے ہوں۔

☆☆☆

برصغیر ہندو پاکستان کے شمالی علاقے میں قدیم ترین نسلیاتی فرقے اصل دراوڑی اور اصل مندا تھے۔ ان کے بعد ہند آریائی فرقے کی تشکیل ہوئی۔ یہ قبل از مسیح دو ہزار سال کے آخر اور ایک ہزار سال کے شروع کی بات ہے۔ اسی نسلیاتی فرقے سے تمام موجودہ ہند آریائی قوموں اور قومیتوں کا تولیدی رشتہ ہے۔ اس کی تشکیل زیادہ تر ان قبائل سے ہوئی جو ہند یورپی زبانوں کے شجرہ کی بولیاں بولتے تھے اور برصغیر میں جن کی آمد تقریباً دو ہزار برس قبل از مسیح کے درمیان شروع ہوئی تھی۔

وہ آبائی علاقہ جہاں سے ان قبائل نے ہجرت کی عام خطوط پر بیان کیا جاسکتا ہے۔بعض عالموں نے ہندویورپی زبانوں کے بالموازنہ تاریخ مطالعہ کے بعد مرکزی اور مشرقی یورپ کوان کا گہوارہ بتایا ہے، یا زیادہ ٹھوس طور پر مغرب میں دریائے رائن اور مشرق میں دریائے دون کے درمیان۔ ہندیورپی زبانوں نے کب اپنے الگ گروہ بنائے اور کب ہندایرانی شاخ پھوٹی، اس کے متعلق ہم کچھ نہیں جانتے۔صرف ایک بات ہم یقین سے کہہ سکتے ہیں: یہ عمل 3 ہزار سال قبل از مسیح تک مکمل ہو چکا تھا۔

پیداآور قوتوں پر زائد آبادی کے دباؤ کی وجہ سے (جسے مارکس نے معاشرتی مردم نگاری کا عمل کہا ہے) اصل ہندایرانی قبائل منقسم ہونے لگے۔ابتدا میں یہ ہندیورپی علاقے کے جنوب مشرق میں۔بعض علما کی رائے میں یہ قبائل زیادہ تر وسطی ایشیا کے علاقے میں پھیلے ہوئے تھے۔یہیں سے انہوں نے ایران اور شمال مغربی ہندستان کی طرف نقل مکان کی۔

چند صدیوں تک اصل ہندایرانی قبائل مکان جاری رہی۔اصل ہندایرانی اور مقامی غیر ہندیورپی عناصر کے درمیان قبائلی اتحاد ہوتے رہے، جب وہ ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل ہوئے اور نئے علاقوں کوانہوں نے اپنا گھر بنایا۔مقامی غیر ہندیورپی آبادی نے نوواردوں کی زبان اختیار کر لی اور آہستہ آہستہ ان میں ضم ہوگئی۔نوواردوں نے مقامی آبادی کی بعض روایات اپنائیں اور اسے اپنی حاصلات دیں۔اس طرح ہم جذبی اور تہذیبوں اور کا امتزاج عمل میں آیا۔اس عمل سے اس ہندایرانی نسلیاتی لسانی فرقے نے تشکیل پائی جس کی ہلکی سی جھلک ہمیں ''رگ وید'' اور ''اویستا'' کے ابتدائی حصوں میں ملتی ہے☆☆۔

ہندایرانی نسلیاتی لسانی فرقے کے وجود کا مطلب یہ نہیں تھا کہ اس کے اندر مادی ثقافتی فرق اور زبان میں مختلف بولیوں کے درمیان امتیازات نہ بڑے ہوں۔وجہ یہ ہے کہ ہندایرانی قبائل بہت بڑے علاقے پر پھیلے ہوئے تھے۔بولیوں کے بڑے بڑے گروہ تھے۔

W. Porzig, <<Die Gliederung des Indogermanischen Sprachgebiets>>,* S. 45_49.

A.A. Macdonell, <<Vedic Mythologys>>, pp. 7__8.**

ان ہی دوسرچشموں سے ایرانی اور ہندآریائی زبانیں پیدا ہوئیں۔ جہاں تک داروی زبانوں کا تعلق ہے تو ان کا منبع تیسرا گروہ تھا۔

بعض سوویت اور غیر ملکی ماہرین آثار قدیمہ اور نسلیاتی جغرافیہ کو وسطی ایشیا اور اس کے پڑوسی علاقوں میں پائی گئی انفرادی آثار قدیمہ کی ثقافتوں اور بنیادی نسلیاتی لسانی گروہوں کے درمیان باہمی تعلق نظر آتا ہے۔ جو اس رقبے پر 2 ہزار برس قبل از مسیح کے شروع میں آباد تھے۔ پاکستان کے عوام کی نسلیاتی ابتداد کھانے کے لئے یہ باہمی تعلق بے حد اہم ہے☆۔ اصل ہند آریائی قبائل کی تشکیل وسطی ایشیا کے جنوبی علاقے، شمال مغربی افغانستان اور ایرانی سطح مرتفع کے مشرقی کنارے پر ہوئی۔ اسی خطے سے انہوں نے اور مغربی ایشیا کی جانب پیش قدمی کی۔

اصل ہند آریائی قبائل کی نقل مکان کا ثبوت ہمیں ان الفاظ سے ملتا ہے جنھیں ہند آریائی زبانوں نے مغربی ایشیا اور ایشیائے کوچک کی زبانوں سے حاصل کئے۔ اس کا پتہ دو ہزار سال قبل از مسیح کی دستاویزوں میں ملتا ہے۔ لسانی تجزیہ بتاتا ہے کہ یہ الفاظ ان قبائل سے حاصل کئے گئے تھے جو ویدی آریاؤں سے مختلف لیکن بہت قریبی مخصوص بولی یا بولیاں بولتے تھے۔ اس کے علاوہ مغربی ایشیا کے اصل ہند آریائی قبائل کی زبان رگ وید کی زبان سے زیادہ پرانی نظر آتی ہے☆☆۔

غالبًا یہ اصل ہند آریائی بالواسطہ اثر نتیجہ تھا (ہریتوں کے ذریعے) کہ ہیتیوں کی نئی سلطنت کے عہد میں اگنی کی پرستش پھیلی جو آریاؤں کا آگ کا دیوتا تھا۔ اوگارت کی بعض عبارتوں سیاس پرستش کا ثبوت ملتا ہے۔

یہ اثر باہمی تھا، یک طرفہ نہ تھا۔ چنانچہ اس پر شبہ کرنے کی کوئی گنجائش نہیں ہے کہ اصل ہند آریاؤں نے بعض دیوی دیوتاؤں کے نام مغربی ایشیا سے حاصل کئے، مثلاً ورونا اور اندرا۔

S. Piggott, <<Prehistoric India...>>, pp. 144, 220, 225.*

P. Thieme, <<The <<Aryan>> Gods ofthe Mitanni Treates>>,** pp. 301__316.

بعض ثقافتی تاریخی موازنوں سے ثابت ہوتا ہے کہ اصل ہند آریائی قبائل اور مغربی ایشیا کے لوگوں کے درمیان رابطے تھے☆۔

چنانچہ لسانی اور آثار قدیمہ کی شہادتوں سے یہ واضح طور پر ثابت ہوتا ہے کہ اصل ہند آریائی قبائل کے مغربی ایشیا کے قدیم ترین لوگوں کے ساتھ رشتے تھے۔

مغربی ایشیا میں اصل ہند آریائی قبائل کی نقل مکان کے ساتھ ساتھ ان کی پیش قدمی جنوب مشرق کی طرف، مشرقی ایران، جنوب مغربی افغانستان اور شمالی بلوچستان میں بھی ہوئی۔ یہ تین اور دو ہزار برس قبل از مسیح جنوبی ترکمانیہ کے نخلستانوں میں آباد قبائل کی ثقافت اور کچھ عرصہ بعد قندھار اور کوئٹہ کی قدیم کاشتکار آبادی کی ثقافت کے درمیان بعض مشترکہ باتوں سے ظاہر ہوتا ہے☆☆۔ اس طرح ویدی آریاؤں کے جدامجد برصغیر کی سرحدوں تک پہنچے۔ مشرقی ایران اور بلوچستان میں رہنے والے قبائل کی نقل وحرکت کی ایک وجہ یہ بھی تھی☆☆☆۔

☆☆☆

یہ دعوی کہ وحشی آریاؤں کے جس حملے نے وادی سندھ کی شاندار تہذیب تباہ کی☆☆☆☆ اور برصغیر کا نسلیاتی نقشہ بالکل بدل دیا مختصر مدت کی بات تھی، آج صحیح نہیں معلوم ہوتا۔

آثار قدیمہ کی شادتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ سندھی تہذیب کے شہری مرکز یکا یک تباہ بر باد نہیں ہوئے اور نہ ان کے شہریوں نے انہیں اچانک خیر باد کہا۔ دراصل یہ عمل صدیوں تک

S.K. Dikshit, <<An Introduction to Archaeology>>.*

B. B. Lal, <<Protohistoric Investigation>>, p. 90. **

☆☆☆ آثار قدیمہ کی شہادتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ بلوچستان کے ان علاقوں میں جو ہڑپہ تہذیب کے گہوارے تھے انہوں نے بعد میں جنوب مغربی ایران سے آنے والے قبائل کی ثقافت قبول کر لی۔

R.E.M. Wheeler, <<Iran and India Pre-Islamic Times>>, p. 92. ****

ہوتا رہا۔ صورت یہ تھی کہ وادی سندھ کے بعض شہر پروان چڑھ رہے تھے تو دوسرے بالکل تنزل کی حالت میں تھے☆۔

ان ہی شہادتوں سے ظاہر ہوتا ہے کہ وسیع علاقے میں ہڑپہ تہذیب نے کئی مقامات پر نوع بنوع تہذیبوں کو جنم دیا۔ اکثر ان میں سے ہر تہذیب چھوٹے رقبے کی حدود کے اندر تھی اور دوسری سے بہت کم یا بالکل غیر مشابہ☆☆۔ ان تہذیبوں کے بانی وہ بکھرے ہوئے قبائل تھے جو ابتدا میں ہڑپہ تہذیب کی

مغربی اور شمال مغربی سرحدوں پر رہتے تھے۔ جب ہڑپہ تہذیب کے انفرادی مرکز نیست ونابود ہونے لگے تو وحشی قبائل وادی سندھ پر چھا گئے اور ہر قبیلہ نسبتاً چھوٹے سے علاقے میں بس گیا۔

بسا اوقات ایسا بھی ہوا کہ جن قبائل کی ثقافتوں نے ہڑپہ تہذیب کی جگہ لی ان میں آخر الذکر کا تسلسل رہا۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ وادی سندھ میں آریاؤں کی آمد ہمیشہ جنگوں کے ذریعے نہیں ہوئی اور مقامی لوگوں کو ان کے گھر بار سے بھگایا نہیں گیا۔ رابطے پرامن بھی تھے جب وحشی مہاجر مقامی آبادی کے ساتھ گھل مل گئے اور تہذیبوں کا امتزاج ہوا۔

قبل از مسیح دوسرے ہزار سالہ عہد کے آخری نصف میں ویدی آریاؤں کی معاشرتی تنظیم ایسی تھی کہ اصل ہند آریائی قبائل برصغیر ہندو پاکستان کے شمال مغربی علاقے پر ایک فوجی حملے

☆ ہڑپہ تہذیب کے زوال کے ٹھیک زمانے پر کافی اختلافات رائے ہیں۔ گورڈن کا کہنا ہے کہ آریائی حملہ جس کے ساتھ اس کے خیال کے مطابق وادی سندھ کی تہذیب بھی ختم ہوئی 1750 اور 1300 سال قبل از مسیح میں ہوا۔ فیرسروس اور ہائنے گیلڈرن اسے 1300 بلکہ 1200 سال قبل از مسیح بتاتے ہیں۔ میرے خیال میں یہ صحیح نہیں ہے۔ خاص ہندستانی مہریں جو دجلہ وفرات کی وادی میں پائی گئی ہیں یہ نشاندہی کرتی ہیں کہ اس کے اور وادی سندھ کے درمیان 1500 سال قبل از مسیح تک باقاعدہ رابطے تھے۔ اس لئے قیاس کہتا ہے کہ ہڑپہ اور موہنجوڈارو کی تہذیب کا زوال سولھویں یا پندرھویں صدی قبل از مسیح سے پہلے نہیں ہوا۔

S. Piggott, <<Prehistoric India...>>, pp. 215_240.**

کے ذریعے قبضہ کر ہی نہیں کر سکتے تھے۔ ایک ایسی وسیع وعریض سرزمین پر اچانک حملہ کرنے کے لئے جہاں کئی آباد اور قلعہ بند شہر بکھرے ہوئے ہوں اور بے شمار چھوٹی دفاعی قلعہ بندیاں موجود ہوں معاشرتی اور فوجی تنظیم کی ایک نہایت بلند سطح اور مرضی وعمل کے اتحاد کی ضرورت تھی۔ ہند آریائی قبائل ان دنوں جس معاشرتی اور معاشی ارتقا کی منزل میں تھے اس کے پیش نظر یہ تقاضے پورے کرنا ناممکن تھا۔

ایک اور شہادت جو وادی سندھ اور اس کے معاون دریاؤں کی وادیوں پر اصل ہند آریائی قبائل کے اچانک حملے کی تردید کرتی ہے لسانی مواد ہے (جس کی تصدیق بعد میں تاریخی ذرائع نے کی)۔ برصغیر کے شمال مغربی علاقے پر ہند آریائی حملہ آوروں کی مسلسل یلغاریں ہوتی رہیں۔ اور یہ عمل جو قبل از مسیح

دوسرے ہزار سالہ عہد کے درمیان شروع ہوا تھا ایک ہزار برس تک جاری رہا☆۔

لہذا یہ ثابت کرنے کی کوشش نہیں کرنا چاہئے کہ سندھ کی تہذیب کی تباہی آریاؤں کے ایک حملے کا نتیجہ تھی (یا ان کے متقدمین کے جنھیں انہوں نے پہلے بھگا دیا تھا)۔

ہڑپہ تہذیب کے زوال کے کئی اسباب تھے__ اندرونی اور بیرونی دونوں (لیکن غالب اسباب اندرونی تھے)۔

جن اسباب نے ہڑپہ کے شہری مرکزوں کو تباہ کیا وہ یہ تھے: سندھ اور راوی دریاؤں کی گذر گاہوں میں تبدیلی، بارش کے موسم میں فرق، وحشی قبائل کی نقل وحرکت کی وجہ سے وادی سندھ اور مغربی ایشیا کی قدیم ترین تہذیب کے درمیان تجارتی تعلقات کا ٹوٹ جانا۔

ان اسباب سے بلاشبہ کوئی بھی بستی تباہ ہوسکتی ہے۔ لیکن انہوں نے مجموعی طور پر سندھ کی تہذیب کے انہدام میں بنیادی کردار ادا نہیں کیا۔ آثار قدیمہ کی تحقیقات سے ہمیں اس مفروضے تک پہنچنے میں مدد ملتی ہے کہ کسی اندرونی بحران نے

G.A. Grierson, <<Linguistic Survey of India>>, Vol VIII, pp. 7_9;*

Vol. I, pp. 100_108; G. Morgenstierne, <<Report on a Linguistic Mission to Afghanistan>>, pp. 68_69.

جس کی وجہ ابھی تک واضح نہیں ہوئی ہے، وادی سندھ کی بڑی بڑی شہری آبادیوں کو نیست ونابود کر دیا۔

اس سلسلے میں ایک بات ضروری یہ ہے کہ قبل از مسیح دوسرے ہزار سالہ عہد کے وسط میں ایک مظہر کو پیش نظر رکھا جائے: اس وقت نہ صرف وادی سندھ کی تہذیب کو بلکہ مشرق قریب اور مشرق وسطی میں غلامی کے معاشروں کو بھی شدید اندرونی بحران نے ہلا ڈالا تھا۔ وہاں قرضے کی غلامی کے فروغ اور زرعی برادریوں کے روز افزوں استحصال نے معاشرتی تضادات بڑھا دئے تھے۔ عین ممکن ہے کہ وادی سندھ میں بھی ایسے ہی عوامل کارفام ہوں۔ بحران کی دوسری ہزار سالہ عہد کی ابتدا میں پیداآور قوتوں نے جتنی نشوونما کی ان کے مطابق معاشرتی سیاسی بالائی ڈھانچہ نہیں بدلا جو ہڑپہ تہذیب کی بنیاد پر کھڑا ہوا تھا۔

ہڑپہ تہذیب کے بحران کو براہ راست بیرونی حملے سے جوڑنا صحیح معلوم نہیں ہوتا۔ حقیقت یہ ہے کہ

وادی سندھ میں وحشیانہ قبیلوں کے داخلے سے بہت پہلے اندرونی بحران کے سبب زوال کے آثار نظر آنے لگے تھے۔لیکن اس کا یہ مطلب بھی نہیں ہے کہ ان کی آمد نے ہڑپہ تہذیب کے مکمل انہدام میں کوئی رول ادا نہیں کیا۔بعض اوقات ایسا بھی ہوا ہے کہ اندرونی بحران کی وجہ سے جن شہری آبادیوں کی بنیادیں ہل گئی تھیں وحشیوں کے مسلح حملوں نے انہیں بالکل تباہ کرڈالا۔

ہڑپہ تہذیب کا خاتمہ، اس کے ثقافتی مرکزوں کا تنزل اور ویرانی، اس کے علاقے کے انفرادی خطوں کے درمیان باہمی رابطوں کا انتشار اور وحشی قبائل کی یلغاریں ___ یہ سب ایسے تاریخی واقعات تھے جنھوں نے برصغیر کے شمال مغربی علاقے میں بسنے والی اصل ہندستانی (اصل دراوڑی) قومیت (یا قرابتی قومیتوں) کو منتشر کیا۔اس عریض وسیع سرزمین کے مختلف حصوں کے مخصوص تاریخی ارتقا نے اس قومیت کے انفرادی ٹکڑوں کو کئی نسلیاتی تشکیلوں میں ڈھالا۔ان کا ظہور وادی سندھ میں اصل ہند آریائی قبائل کی آمد سے مربوط ہے۔

☆☆☆

امکان اس کا ہے کہ اصل ہند آریائی قبائل وادی سندھ میں افغانستان کے جنوب مغرب اور جنوب سے درہ بولان سے ہوتے ہوئے بالائی سندھ پہنچے، اور پانچ دریاؤں کے دیس پنجاب درۂ گومل (ژوب وادی پار کر کے) اور درۂ خیبر (کابل وادی پار کر کے) سے گزر کر آئے۔یہ بھی ممکن ہے کہ بعض قبائل موجودہ افغانستان کے شمالی علاقوں سے بھی پہاڑی دروں کو پار کر کے وادی کابل سے ہوتے ہوئے پہنچے ہوں اور کچھ مزید مشرق کی طرف سے خیبر طے کر کے آئے ہوں۔

وہ ابتدائی علاقے جن پر خالص ہند آریہ ہوئے جنوب مشرق افغانستان، وسطی سندھ دریا کا دایاں ساحل (ڈھیرہ جات) اور مغربی پنجاب تھے☆۔لیکن اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ اصل ہند آریائی قبائل پہلے گنگا جمنا کے شمال اور نشیبی سندھ تھوڑی بہت تعداد میں نہ آتے رہے ہوں۔

جیسے جیسے اصل ہند آریائی قبیلے مشرق کی جانب بڑھتے رہے ان کے قرابتی اصل ایرانی قبائل سے تعلقات منقطع ہوتے گئے۔قدیم معاشرے کا تجزیہ کرتے ہوئے مارکس نے (اسی قسم کے حالات کے

☆ ''اویستا،، میں اخورہ مزدہ جن سولہ ملکوں کا ذکر کرتا ہے ان میں ہاپتہ ہندو بھی ہے جو ہند ایرانی دنیا کے بالکل جنوب مشرق میں ہے۔''رگ وید،، سے معلوم ہوتا ہے کہ قدیم ویدی دور میں آریہ سپتا

سندھو (سات دریاؤں کا دیس) میں رہتے تھے۔ ''رگ وید،، میں جن دریاؤں کے نام ہیں ان سے اس علاقے کا اندازہ ہوسکتا ہے: کوبھا (کابل)، سووستو (سوات)، کومو (قوم)، گوماتی (گومل)، سندھو (سندھو)، ویپاس (بیاس)، گنگا وغیرہ۔ اس سے پتہ چلتا ہے کہ قدیم ویدی دور میں (12،11 صدی قبل از مسیح) ہند آریائی قبیلے سندھ کے مغربی معاون دریاؤں سے آبیار ہونے والے علاقے (جنوب مشرقی افغانستان اور ڈھرہ جات)، پنجاب اور بالائی گنگا کے کنارے آباد تھے۔ وسطی گنگا کی سرزمین کو ہنوز ان قبائل کے پیروں نے نہیں چھوا تھا۔ ''رگ وید'' میں ایک ملک کا ذکر ملتا ہے جو غیر آریائی بتایا گیا ہے۔ یہ ہے کی کا تاس جسے آج کل کے علما مغربی بہار (ضلع گیا) قرار دیتے ہیں۔

سلسلے میں) لکھا ہے کہ مکان میں مقامی انتشار سے مخصوص مدت کے دوران لسانی فرق بھی پیدا ہوتے ہیں۔ چنانچہ زبان کی بنیاد پر ہندایرانی تعلقات منقطع ہوگئے اور ہند یورپی زبانوں کے علحدہ علحدہ ایرانی اور ہند آریائی گروہ وجود میں آئے۔

جب اصل ہند آریائی قبیلوں (آئندہ ہم انہیں صرف آریائی لکھیں گے) ☆ کی سندھ وادی میں مقامی آبادی سے مڈبھیڑ ہوئی ☆☆ تو اس کے ایک حصے نے بھاگ کر رسائی سے باہر کوہستانوں اور جنگلوں میں پناہ لی ☆☆☆۔ اور دوسرے نے نوواردوں کی اطاعت قبول کر لی۔ جب اور جہاں وادی سندھ کی مقامی باشندوں نے آریاؤں کی ہتیاروں سے مزاحمت کی تو آریاؤں کا ایک حصہ ڈھرہ جات اور مغربی پنجاب سے دریا کے نشیب میں نہیں بلکہ مشرق اور جنوب مشرق کی جانب گنگا جمنا کے دوآبے میں پیش قدمی کرنے پر مجبور ہوگیا۔ یہاں آبادی گنجان نہیں تھی اور اس میں مندا کے جدامجد کی نسل کے قبائل آباد تھے۔

نوواردوں اور مقامی آبادی میں مسلح تصادموں کے علاوہ پرامن میل جول بھی بڑھا۔ مقامی آبادی کے بعض گروہوں نے اپنی

☆ لفظ آریہ پر مختلف عالموں نے بے شمار لسانیاتی قیاس آرائیاں کی ہیں۔ غالبًا سب سے زیادہ قرین قیاس آر۔ تھیمے کی تشریح ہے: آری کے معنی ہیں اجنبی، نووارد، غیر ملکی، بیگانہ۔ آری سے آریہ بنا ___ یعنی نوواردوں سے متعلق، نوواردوں کا مددگار، میزبان ___ غیر میزبان وحشیوں کے مقابلے میں میزبان۔

☆☆''رگ وید'' میں مسلح جھڑپوں کا ذکر ہے جب آریہ دشمن کی قلعہ بند آبادیوں تباہ کر دیتے تھے۔ اندرا، جنگ کے دیوتا کو اس کے پجاری ''پورن دارہ'' یعنی آبادیاں تباہ کرنے والا بتاتے ہیں۔

☆☆☆ ہنزہ اور نگر میں آباد ایک چھوٹی سی قومیت ''بوریشکی'' (تقریباً 20 ہزار) ان جلاوطنوں کی اولاد ہے۔اس کی بولی کی تشخیص نہیں ہوئی ہے۔لیکن اتنا یقینی ہے کہ اس کا ہندیورپی زبانوں سے تعلق نہیں ہے بلکہ وہ ہندیورپی لوگوں کے بسنے سے پہلے کی زبان کی باقیات ہے۔

قبائلی تنظیم قائم رکھی، کچھ آریائی قبائلی تنظیموں میں شامل ہوگئے۔

آریائی قبائلی اور مقامی آبادی کے درمیان متنوع معاشرتی اور ثقافتی تاریخی روابط کا نتیجہ ایک نئے نسلیاتی فرقے کی صورت میں نکلا۔ یہ تھا ہندآریائی جس کی تشکیل برصغیر ہندوپاکستان کے شمالی حصے کے مرکزی علاقوں میں دوسرے ہزار سالہ عہد قبل از مسیح کے دوسرے نصف میں شروع ہوئی۔ یہ عمل ہزار سالہ عہد قبل از مسیح کی ابتدا میں مکمل ہوگیا۔اس فرقے کی تشکیل مقامی قبل از ہندیورپی نسلیاتی بنیادی پرت کے ارتقا کا نتیجہ تھی۔اس میں اجنبی آریائی قبائل کی آمیزش ایک اہم عنصر تھی لیکن اسے فیصلہ کن نہیں کہا جا سکتا۔دستیاب شہادتوں کی بنا پر کہا جاسکتا ہے کہ ہندآریائی نسلیاتی فرقے کی تشکیل سے آبادی کے انسانیاتی کردار میں کوئی نمایاں تبدیلیاں نہیں ہوئیں۔خاص طور پر اس عمل کا برصغیر کے شمال مغربی حصے میں یورپی نسلیاتی قسمیں پھیلنے سے کوئی تعلق نہیں ہے (جو وہاں غالباً ہندیورپی زبانیں پہنچنے سے بہت پہلے شروع ہوگیا تھا)۔اور اس کا آبادی کے ایک حصے کا رنگ بدلنے سے بھی کوئی واسطہ نہیں ہے☆۔ ہندآریائی نسلیاتی فرقے کی تشکیل کا ایک نتیجہ یہ نکلا کہ اس کے اجزا کے درمیان فرق ختم ہوگئے۔

آریہ بڑے وسیع رقبے پر پھیلے ہوئے تھے۔یہ کوہ سلیمان سے

☆ تبدیلی رنگ اور برصغیر کے شمال مغربی پہاڑی علاقوں میں لوگوں کے ہلکے رنگ کی انسانیاتی قسموں کی تشکیل سوویت عالموں کی رائے میں مقامی بات تھی اور بہت ہوئی تھی۔اس کے ثبوت میں یورپی نسل کی خاص ہندوکش قسم پیش کی جاسکتی ہے جس کی بوریشکی قومیت نمائندگی کرتی ہے۔ہندآریائی نسلیاتی فرقہ ابھرنے سے وادی سندھ کی آبادی کے نسلیاتی کردار پر کوئی اثر نہیں پڑا۔موہنجوڈارو میں کھدائی کے بعد انسان کی جو ہڈیوں ملی ہیں ان کا مقابلہ ٹیکسلا کے باسیوں کی کھوپڑیوں سے کرنے سے یہ ثابت ہوجاتا ہے جو وہاں پانچویں صدی عیسوی کے دوسرے نصف میں رہتے تھے۔

گنگا اور جمنا کی وادیوں تک پہنچتا تھا۔ اس لئے آریائی اور مقامی غیر ہند یورپی قبائلی اتحاد ہوتے رہتے تھے☆۔ آبادی جو مختلف زبانیں (یا ایک زبان کی مختلف مقامی بولیاں) بولتی تھی اس نے آریائی زبان قبول کر لی۔ اس سے آریائی قبائلی کے مقامی طور پر منتشر ہونے کے ساتھ ساتھ بولیوں کی سرحدیں بھی بدل گئیں اور نئی ہند آریائی بولیاں اور بولیوں کے گروہ ابھر آئے۔

جب آریائی قبائل کی زبان کا مقامی آبادی کی بولیوں سے سامنا ہوا (اور ہند آریائی نسلیاتی گروہ وجود میں آ گیا) تو آریاؤں کی زبان نے مقامی بولیوں کو کچل دیا اور انہیں نکال باہر کیا۔ اس نے اپنی بنیادی لغت، اور قواعد کے ڈھانچے میں تسلسل برقرار رکھے۔ بتدریج مقامی لوگوں نے نوواردوں کی زبانیں اختیار کر لیں۔

آریاؤں کی زبان اختیار کئے جانے سے پہلے ایک طویل دور گزرا جب اصل آبادی کا بڑا حصہ دو زبانیں بولتا رہا۔ اس کا ثبوت منجملہ اور باتوں کے ہمیں دریاؤں کے اور دوسرے جغرافیائی ناموں سے ملتا ہے جو پرانی قدیم آبادی کی زبانوں سے میں شامل ہوئے۔ ہند یورپی قبائل کی آمد سے پہلے جو نام استعمال کئے جاتے تھے وہ برقرار رہے۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ برصغیر کے شمالی حصے میں جب ہند آریائی بولیاں پھیلیں تو انہوں نے نہ تو مقامی آبادی کا صفایا کیا اور نہ ہی انہیں بالکل نکال باہر کیا۔ انہیں مقامی آبادی نے آہستہ آہستہ اختیار کیا۔ ایک عرصے تک اصل مقامی آبادی دو زبانیں بیک وقت بولتی رہی۔ اسی دور میں ہی آریاؤں کی زبان نے دوسرے اثر قبول کئے، پہلے دراوری زبانوں سے، اور پھر جب آریاؤں نے مزید مشرق کی جانب پیش قدمی کی تو مندا زبانوں سے☆☆۔

☆ آر۔ شیفر کا تو یہ تک خیال ہے کہ ویدوں کے زمانے میں کورو قبیلے نے اہم رول ادا کیا جو زیادہ تر مندا لوگوں پر مشتمل تھا، جنھوں نے آریائی ثقافت قبول کر لی تھی۔

☆☆ یورپی عالموں گنڈرٹ، کھٹ ٹیل وغیرہ نے 19 ویں صدی کی ساتویں اور آٹھویں دھائیوں میں دریافت کر لیا تھا کہ دراوڑی اور مندا زبانون نے ہند آریائی بولیوں کی لغت، الفاظ کی ساخت، نحو اور صوتیات پر اثر ڈالا ہے۔

مقامی لوگوں کی بولیوں پر آریاؤں کی زبان اس وقت حاوی ہوئی جب آریائی قبائل کی زبانیں ترقی کر کے آریائی قومیت کی زبان بن گئیں۔

آریائی زبان نے کئی وجوہات کی بنا پر برتری حاصل کی۔ پہلے، آریائی زبان کی جو مختلف بولیاں تھیں ان میں غیر محدود طور پر تفریق پیدا نہیں ہو سکتی تھی کیونکہ آریائی قبائل کی حرکت پذیری تیز تھی اور وہ ایک دوسرے سے برابر ملتے جلتے رہتے تھے۔ آریاؤں نے اپنے تمام علاقے میں اپنی زبان پھیلائی جو آسانی سے اس علاقے کے تمام باشندوں کی مشترکہ زبان بن گئی۔ دوسرے، قبائلی وفاقوں میں جو مقبوضہ علاقوں میں ابھر رہے تھے آریائی قبائل پر جرگے کی اشرافیہ کا سیاسی غلبہ تھا۔ چنانچہ مقامی آبادی جرگے کی اشرافیہ بننے کے لئے اپنی زبان کو خیر باد کہنے کے لئے تیار ہوگئی۔ تیسرے، ایک طرف نو واردوں اور مقامی آبادی کے آریہ زدہ حصے اور دوسری طرف غیر اریہ زدہ گروہوں کے حالات زندگی میں فرق تھا۔ اول الذکر نے سب سے اچھے علاقے حاصل کر لئے تھے اور آخر الذکر کو ابتر علاقوں میں بھگا دیا گیا تھا۔ اس فرق کا آبادی کے اضافے کی شرح پر اثر پڑا۔ غیر آریہ زدہ مقامی باشندوں کی تعداد کل آبادی کے مقابلے میں مسلسل کم ہونے لگی۔ اس طرح بتدریج وہ بھی ضم کر لئے گئے۔

نسلیاتی لسانی میدان میں ہند آریائی نسلیاتی فرقے کے قیام کا اظہار اس طرح ہوا کہ کئی مربوط ہند آریائی بولیوں کی تشکیل ہوئی جنھوں نے اصل آبادی کی مقامی زبانوں کا دیس نکالا کر دیا۔ آج ہمارے عصر میں جو تمام ہند آریائی زبانیں موجود ہیں ان کی جڑ یہی ہند آریائی بولیوں کا مجموعہ ہے۔

مادی ثقافت کے شعبے میں ہند آریائی نسلیاتی فرقے کے قیام کا اظہار ''رنگین بھورے ظروف'' کی ثقافت کی شکل میں ہوا۔ یہ قبل از مسیح بارہویں اور گیارہویں صدیوں کے درمیان نمودار ہوئی۔ آثار قدیمہ کی شہادتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ اس تہذیب کا گہوارہ مشرقی پنجاب اور گنگا جمنا کا دوآبہ تھا۔ اس کے بانی آباد زندگی بسر کرتے تھے، ان کا خاص پیشہ کاشت کاری اور مویشی بانی تھا وہ گھوڑوں، بھیڑوں سینگ والے مویشیوں اور سوروں کا پالن پوسن کیا کرتے تھے۔ انہیں کمہار کا چاک استعمال کرنا آتا تھا اور وہ کانسے کے اوزار اور ہتیار بناتے تھے☆۔ ''رنگین بھورے ظروف'' کی ثقافت کے بانی واقعی تاریخی لحاظ سے مستحکم نسلیاتی فرقے کے نمائندے تھے۔ یہ دو باتوں سے ظاہر ہے: برصغیر کے شمال میں ایک وسیع وعریض رقبے پر اس ثقافت کا پھیلا ہونا اور ساتھ ہی اس کا اندرونی اتحاد۔

نظریے کی دنیا میں ہند آریائی فرقے کی روحانی تشکیل کا اظہار ''رگ وید'' میں ملتا ہے جس کے بنیادی رجحانات کا ارتقا اسی علاقے پر دوسرے ہزار سالہ عہد قبل از مسیح کے آخر میں ہوا۔ ''رگ وید'' کے

بھجن منتروں (جادو کے) کی رسوم، رزمیہ داستانوں اور غنائی گیتوں کا عکاسی کرتے ہیں☆☆۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ جہاں تک ذہنی ساخت، نظریے اور روحانی ثقافت کی تشکیل کا تعلق ہے جو تمام عناصر میں مشترک ہیں، ہند آریائی نسلیاتی فرقے کے استحکام کی تکمیل دوسرے ہزار سالہ عہد قبل از مسیح کے آخر اور پہلے ہزار سال قبل از مسیح میں ہوئی۔

ہند آریائی فرقہ پلک جھپکتے ہی ظہور میں نہیں آیا۔ برصغیر کے شمالی حصے میں رہنے والے مختلف نسلیاتی فرقے باہمی اختلاط کے سبب آہستہ آہستہ بدلے اور ان کے فرق بتدریج ختم ہوئے۔ مختلف قبائل اور زبانوں کے شیر و شکر ہونے میں کئی صدیاں صرف ہوئیں۔ جب نیا نسلیاتی فرقہ وجود میں آ گیا تو وہ جامد و ساکت نہیں رہا۔ ہند آریائی معاشرے میں مزید بنیادی معاشرتی معاشی تبدیلیاں ہوتی رہیں۔

☆ یہ کہ ''رنگین بھورے ظروف'' کی ثقافت کے بانی ویدی آریہ تھے اس کا ایک اہم ثبوت ان آبادیوں کی کھدائی کے نتائج ہیں جہاں اس ثقافت نے جنم لیا اور وہ پروان چڑھی۔

(B.B. Lal, <<Protohistoric Investigation>>, pp. 93_97)

☆☆ پروفیسر ریریخ کا خیال ہے کہ قدیم آریاؤں کی رزمیہ نظمیں جو ہم تک نہیں پہنچیں واقعی موجود تھیں۔ ان کی رومانیت ''رگ وید'' میں اندرا کی شان میں گیتوں سے ملتی ہے۔

دوسرا باب

نظام غلامی کے شباب و زوال کے دور میں برصغیر کے شمال مغربی علاقے میں نسلیاتی عوامل

پیداآور قوتوں کی نشوونما___یعنی لوہے اور لوہے کے اوزاروں☆ کے ظہور میں آنے سے ہند آریائی قبیلوں کو نئے غیر آباد علاقوں کو استعمال میں لانے، نہری کاشت بہتر کرنے اور مختلف قسم کی دستکاری اور کاشت کاری کو ترقی دینے میں مدد ملی۔ اس کا قدرتی نتیجہ معاشرتی محنت کی مزید تقسیم اور اس کی بلند تر کارکردگی کی شکل میں نکلا۔ ان عوامل کے نتیجے میں زائد معاشرتی مادی قدریں جمع ہوئیں جو جرگوں کی

اشرافیہ_ سرداروں اور پروہتوں کے ہاتھوں میں رہیں۔ اجناس کے تبادلے اور مسلح تصادموں کی وجہ سے ملکیتیں بڑھیں اور معاشرتی عدم مساوات میں اضافہ ہوا۔ اسی زمانے میں ان دوررس تبدیلیوں کا ایک اثر یہ ہوا کہ اسم معرفہ کے لئے ہتک آمیز اور باعزت دو قسم کے الگ الگ الفاظ استعمال کئے جانے لگے۔ اس سے پتہ چلتا ہے کہ اس زمانے میں طبقاتی تفریق کتنی بڑھ گئی تھی۔ ہند آریاؤں کے مذہبی تصورات میں اس وقت جو تبدیلیاں ہوئیں ان سے بھی اس کی تصدیق ہوتی ہے: دیوتاؤں میں سلسلہ مدارج جو پہلے ناپید تھا شروع ہونے لگا۔

قائم شدہ نظام میں معاشرتی عدم مساوات کا اظہار چار (ابتدا میں غالباً صرف تین) ذاتوں سے بھی ہوتا ہے۔ پہلی بار اس کا ذکر

☆لوہا پگھلانے کے آثار (لوہے کے ڈھیلوں کی شکل میں) ''رنگین بھورے ظروف'' کی ثقافت کے آخری دور میں ملتے ہیں__ نویں اور آٹھویں صدی قبل از مسیح میں۔ (حوالے کے لئے: S.D. singh, <<Iron in ancient India>>, pp. 215_216)

ہمیں ''رگ وید'' کے دسویں (یقینی تازہ ترین) منڈالے میں ملتا ہے۔ غلامی نظام کے طبقاتی تعلقات کے قیام کے دور میں ذاتوں نے جرگے اور قبائلی تقسیم کو بتدریج ختم کرنے اور نئی قسم کے انسانی فرقے کی تشکیل میں مدد دی، جس کی بنیاد علاقائی اور معاشرتی رابطوں پر تھی نہ کہ خونی رشتوں پر۔

برصغیر ہند کے شمالی حصے میں پہلے ہزار سالہ عہد قبل از مسیح کی ابتدا میں غلامی نظام کی ریاستیں ابھریں جن پر اس فوجی اور پروہتی اشرافیہ کا اقتدار تھا جو تولیدی لحاظ سے بڑے ہند آریائی قبائل کے جرگوں کی اشرافیہ سے تعلق رکھتی تھی، مثلاً کورو، پانڈو، شوراسینا، پنچلا، کوشلا، وتسا وغیرہ۔

اس دور کی سیاسی تاریخ مسلسل مسلح تصادموں سے اٹی پڑی ہے جن میں غلامی نظام کی ابتدائی ریاستوں اور قبائلی وفاقوں دونوں نے حصہ لیا۔ اسی دور میں مسلح تصادموں کے علاوہ ہمیں معاشرتی اور معاشی پرامن رابطے بھی ملتے ہیں۔ اس سلسلے میں مشرقی پنجاب اور گنگا جمنا کے دوآبے کے پڑوسی علاقوں میں غلامی نظام والی ریاستوں نے طبقاتی تعلقات کو فروغ دینے میں اہم رول ادا کیا۔

بعد کے ویدی ادب میں ان غیر آریائی قبائل کے وفاقوں کا بھی ذکر ملتا ہے جو پہلے ہزار سالہ عہد قبل از مسیح کے پہلے نصف میں برصغیر کے شمال میں آباد تھے: بنگال میں پنڈرا اور وانگا، راوی چناب کے دوآبے

میں مادرا۔ جب ان علاقوں میں جہاں یہ قبائل رہتے تھے غلامی کے تعلقات قائم ہو گئے اور انہوں نے فروغ پایا تو ان کے جرگوں کی اشرافیہ ہند آریائی معاشرے کے معاشرتی ڈھانچے میں شامل ہوگئی۔ اس عمل کی واضح تصویر وہ عجیب وغریب نسب نامے ہیں (جو ہمیں قدیم ہندستانی دیومالاؤں سے ملے ہیں) جن میں انگا، وانگا، پنڈراوغیرہ کے راجاؤں کو وشنو یا رشی درگھاتما کی اولاد بتایا گیا ہے۔ ان قبائل کی جرگہ اشرافیہ نے چھتریوں کا رتبہ حاصل کرلیا☆۔

☆''مہابھارت'' میں انگا، وانگا اور پنڈرا کے جرگوں کی اشرافیہ کو ''شریف نسل کے بہترین چھتری'' کہا گیا ہے۔

ساتویں صدی قبل از مسیح کے آخر اور چھٹی صدی قبل از مسیح میں شمال مشرق میں غلامی نظام کی کئی راستیں ابھریں اور انہوں نے برصغیر کی تاریخ میں اہم رول ادا کیا۔ یہ تھیں مغربی اور جنوبی بہار میں مگدھ، مشرق بہار میں انگا، بنگال میں وانگا اور پنڈرا اور اڑیسہ میں کالنگا۔ اسی طرح کی غلامی نظام کی ایک ریاست اوانتی راجھستان میں قائم ہوئی۔ یہی وہ زمانہ تھا جب گنگا جمنا کے دوآبے کے مغرب میں بھی ہند آریائی غلامی نظام کی ریاستوں کے حوالے ملتے ہیں۔ مثلاً، گندھارا، ساؤویرا، مادرا وغیرہ۔

ان بعض ریاستوں میں حکمراں حلقوں کا تولیدی لحاظ سے تعلق ان غیر آریہ زدہ مقامی قبائل کی اشرافیہ سے تھا جن کی جڑ ہند یورپی نہ تھی۔

لیکن ان کا معاشرتی اور معاشی ارتقا یکساں نہیں ہوا (خاص کر الگ تھلگ رسائی سے باہر پہاڑی علاقوں میں جہاں ترقی یافتہ ثقافتی اور معاشی مرکزوں کا اثر کم تھا)☆ غلامی نظامی ریاستوں کے آس پاس قدیم جرگے کے معاشرتی نظام آہستہ آہستہ ختم ہونے لگے لیکن وہاں پھر بھی قبائلی وفاق موجود رہے جن میں طبقاتی تعلقات ابھرنے لگے لیکن عسکری جمہوریت کی روایتیں جوں کا توں رہیں۔ ان میں سب سے زیادہ طاقتور وفاق برصغیر کے شمال مشرقی حصے میں تھے: وجی (شمالی بہار) اور مالا (نیپال)۔ دریائے سندھ کی وادی میں ''آزاد ہندستانیوں'' (جیسا کہ قدیم مصنفوں نے بعد میں ان کو اس نام سے پکارا) کے کئی قبائلی اتحاد تھے: اساکینی، استاکینی ابستانی، اگالسسی، ملوئی، اکسیدراکی وغیرہ۔

چنانچہ گنگا جمنا کے دوآبے کے جنوب مغربی اور مشرقی علاقوں میں غلامی نظام کے ارتقا کے ساتھ ساتھ آبادی آہستہ آہستہ آریائی ہوئی۔ اس عمل کا ایک ثبوت یہ ہے کہ ''رنگین بھورے ظروف'' کی ثقافت

کی جگہ ''شمالی سیاہ روغنی ظروف'' کی ثقافت پھیلی۔ یہ

☆ برصغیر ہندو پاکستان غلامی نظام اپنے تمام دور میں غیر یکساں رہا، اور یہ اس کی امتیازی خصوصیت ہے۔ اسی کا نتیجہ یہ نکلا کہ جرگہ نظام کی باقیات کافی عرصے تک موجود رہیں۔ حوالے کے لئے:

D.R. Chanana, <<Slavery in Ancient India>>.

ساتویں صدی قبل از مسیح کے آخر اور چھٹی صدی قبل از مسیح میں ہوا۔ دراصل یہ مقامی ثقافتی روایات کے مزید فروغ کی نشانی تھی۔

برصغیر کے شمال مشرق میں جب ہند آریائی انفرادی گروہ گنگا جمنا کے دوآبے سے بکھر کر مشرق کی جانب بہار، بنگال، اڑیسہ اور وادی برہمپترا کے مغربی حصے میں آباد ہونے لگے تو وہاں بھی مقامی آبادی آریائی ہوگئی۔

پہلے ہزار سالہ عہد قبل از مسیح کے وسط تک برصغیر کے شمالی علاقوں کی اکثر آبادی آریائی ہوگئی۔ نوع بنوع نسلیاتی گروہ جنھوں نے اس باہمی عمل میں حصہ لیا ہند آریائی قومیتوں یا قبائلی اتحادوں میں مدغم ہو گئے۔ اس کی تصدیق اہم جغرافیائی نسلیاتی تصور آریہ ورت ــ آریاؤں کا ملک ــ کی وسعت سے ہوتی ہے جو ابتدا میں صرف شمالی ہندستان (پھر مدھیہ دیش) کو محیط کئے ہوئے تھا اور بعد میں برصغیر کے شمالی حصے کے تمام رقبے پر چھا گیا، ''بحر مشرقی سے بحر مغربی تک'' (خلیج بنگال سے بحیرہ عرب تک)،، ''ان دو پہاڑوں (ہمالیہ اور وندھیاچل) کے درمیان،، ☆۔

اسی دور میں اصل دراوڑی اور اصل مندا کی آباد کاشتکاری کی ثقافت اور آریاؤں کی ثقافت کی جو بنیادی طور پر مویشی بانی تھی (کاشتکاری کا حصہ ضمنی تھا) روایتوں کا امتزاج مکمل ہوا۔ ان ثقافتوں کے مختلف عناصر نظام کی آمیزش اور تبدیلی کے نتیجے میں بعض ہند آریائی غلامی نظام کی قومیتیں جو ایک دوسرے کی قرابت دار تھیں (اپنی اپنی امتیازی خصوصیات کے باوجود) ابھرنے لگیں۔ ان ثقافتوں کی جڑیں ہڑپہ اور مندا کے جدامجدوں کی تہذیبوں میں پیوست تھیں۔ کئی عالموں کا خیال ہے کہ ہندومت کے غالب عناصر قبل از ہند آریائی ـ قدیم اصل دراوڑی اور اصل آسٹریلیائی آبادی سے حاصل کئے گئے ہیں ☆☆۔

ہمیں ہندومت اور وادی سندھ کی تہذیب کے مخصوص مذہبی

☆''منوشاستر'' حصہ 2،صفحہ 22،

Gordon Child, <<New Light on the Most Most Ancient East>>; R.C. Majumdar,**

<<Ancient India>>,p. 17; S.K. Chatterji, <<Indo-Aryan and Hindi>>, p. 33.

تصورات کے درمیان بلاشبہ معین کڑیاں ملتی ہیں۔ مثال کے طور پر ہند آریاؤں نے شیو کی پرستش کی بنیادی خصوصیات اپنائیں اور اس کے تصور کو ویدی دیوتا رودرا کی شبیہ میں اتارا☆۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ''اتھرو وید''__ جادواومنتروں کا وید'' آریاؤں کے نظریہ حیات اور ہندستان کے غیر آریائی باشندوں کے تصورات کا مرکب ہے،،،☆☆۔ رزمیہ نظموں، قصص اور دیومالاؤں کے اصل خیالات جو سنسکرت میں لکھے گئے ان کا گہرا تعلق قبل از آریائی تہذیب کے ورثے سے ہے۔ ہوسکتا ہے کہ برہمی رسم الخط اور اعداد کا سرچشمہ کسی حد تک ہڑپہ کی تحریر ہو۔ منجملہ اور باتوں کے اس کا ثبوت ہمیں قدیم ہند آریائی ریاستوں کے سکوں کے نشانات اور موہنجوڈارو کی مہروں کے نشانات کے درمیان مماثلت سے ملتا ہے۔ یہاں یہ بتانا ضروری ہے کہ یہ قدیم سکے پانچ صدی قبل از مسیح پرانے ہیں اور سندھ اور جہلم کے دوآبے میں ٹکسیلا کی کھدائی کے بعد دریافت ہوئے ہیں۔ یہ خطہ ہڑپہ تہذیب کے علاقے میں تھا۔

ہند آریاؤں نے وزن کی وحدتوں کا وہی نظام اختیار کیا جو برصغیر ہند و پاکستان کے شمال مغرب میں قبل از آریائی مرکزوں میں رائج تھا۔ یہی نہیں بلکہ انہوں نے مقامی آبادی کی تہذیب کے کئی عناصر اپنائے☆☆☆۔

قبل از ہند یورپی کاشتکار آبادی نے قدیم ہند آریائی قومیتوں کی تشکیل میں اہم رول ادا کیا۔ یہ صرف اس لئے نہیں ہوا کہ اس کی تعداد زیادہ تھی، بلکہ اس کا خاص سبب یہ تھا کہ اس آبادی نے معاشی سر گرمی کا بنیادی عنصر معین کیا__ قومیتوں کی پیداواری بنیادی، یعنی آبادی کا شتکاری۔ اس سے ایک اور راز کھلتا ہے_ بعد

J. Marshall, <<Mohenjo-Daro and the Indus Givilization...>>, Vol. I,*

pp. 52_58; S.S. Piggott, <<Prehistoric India...>>, pp. 202_203; A. Stein, <<The Indo-Iranian Borderlands...>>, p. 198.

S.K. Chatterji, <<The Origin and Develipment of the Bengli** Language>>, Vol.I, pp. 41_42.

J. Marshall, <<Mohenjo-Daro and the Indus Givlization....>>***

کے ویدی مذہبی تصورات میں آریاؤں کے خاص خاص دیوتا (جیسے اندرا، ورونا، مترا اور پرجاپتی) آہستہ آہستہ پس پشت ڈال دئے گئے☆۔

سنسکرت نے ابتدا میں دراوڑی زبانوں اور خاص کر اصل منداز بانوں سے جو چیزیں حاصل کیں ان کے تجزیے سے ثابت ہوتا ہے کہ قبل از آریائی آبادی نے ہند آریائی غلامی نظام کی قومیتوں کی ثقافت کو بہت کچھ عطا کیا۔ شیفر بتاتے ہیں کہ سنسکرت میں کئی ثقافتی کو بہت کچھ عطا کیا۔ شیفر بتاتے ہیں کہ سنسکرت میں کئی ثقافتی اصطلاحات دراوڑی زبانوں کی ہیں☆☆۔ چٹر جی لکھتے ہیں کہ سنسکرت نے اصل مقامی آبادی سے یہ الفاظ حاصل کئے: کرمارہ (لوہار)، کوٹہ (کٹیہ)، پوجنہ (پرستش، عبادت)، پھلہ (پھل)، بیجہ (بیج)، وری ہی (چاول) وغیرہ☆☆☆۔

ایک اور یورپی عالم کوئی پر کی تحقیق سے معلوم ہوتا ہے کہ سنسکرت نے اصل مندا سے اس قسم کے الفاظ لئے: اپیڈہ (تاج)، کوونده (پارچہ باف)، جالہ (جال، کپڑا)، کھڈ گہ (تلوار)، گنا (گروپ)، گھاٹہ (صراحی)، ڈنڈہ (ڈنڈا)، ڈنڈوبھی (ڈھول)، بدیسہ (ماہی گیر کا کانٹا)، ھالہ (ھل)، سرنکھالہ (زنجیر) وغیرہ۔

اس سے بخوبی ثابت ہوتا ہے کہ دراوڑی اور مندا کے جدامجدوں نے ہند آریائی ثقافت کو کافی مالا مال کیا۔ اس سلسلے میں سوویت عالم ولادیمیر تسوف نے بڑی گہری بات کہی ہے: ''جب لوگ ایک دوسرے سے الفاظ لیتے ہیں تو ان کے ساتھ وہ خیالات اور مادی اشیا کو بھی اپناتے ہیں جن کی یہ الفاظ نمائندگی کرتے ہیں''۔

''جب طبقاتی تعلقات اور ان کے فروغ کے ساتھ ساتھ ہند آریائی غلامی نظام کی ریاستیں قائم ہوئیں تو اس سے ایک ہند آریائی بولی کو تحریری زبان بننے میں بہت مدد ملی۔ یہ ریاست اور غلامی کے معاشرے کے چوٹی کے لوگوں کی ضروریات کا تقاضہ تھا۔بعض عالموں کا خیال ہے کہ یہ تحریری زبان برصغیر کے شمال مغربی علاقے کی بولی تھی۔تحریری زبان __ سنسکرت نے (جس کی کلاسیکی

☆مزید تفصیلات کے لئے دیکھئے: D. Chattopadhaya, <<Lokayata>>

R. Shafer, <<Ethnoraphy of Ancient India>>, p. 9.**

S.K. Chatterji, <<The Origin and Development of the Bengali Lan-*** Guage>>, Vol. I, p. 42.

شکل پانچویں اور چوتھی صدی قبل از مسیح میں ابھری) نسبتاً تیزی سے دوسری بولیوں کے مقابلے میں بلند مرتبہ حاصل کرلیا۔لیکن پھر تحریری شکل اختیار کرنے کے بعد سنسکرت کا ارتقا بہت آہستہ ہوا اور اس نے بولیوں کا زیادہ اثر قبول نہیں کیا۔

☆☆☆

آریہ ورت کی سرزمین پر پہلے ہزار سالہ عہد قبل از مسیح کے پہلے نصف میں نسلیاتی عمل کن منزلوں سے گزرا اس کے بارے میں ضروری ذرائع بہت کم ہیں۔اس لئے انہیں کافی صحت اور مربوط طریقے سے بیان نہیں کیا جا سکتا۔

تاریخ دانوں، لسانیات، آثار قدیمہ، نسلیاتی جغرافیہ وغیرہ کے ماہرین نے کئی نسلوں تک جو تحقیقات کی ہیں ان کی مدد سے یہ تسلیم کیا جا سکتا ہے کہ برصغیر کے شمالی حصے میں آباد لوگوں کی نسلیات سازی میں اہم تبدیلیاں ہوئیں۔ان تبدیلیوں کا تعلق غلامی کے تعلقات کے ارتقا سے تھا۔

ہند آریائی قومیتوں اور قبیلوں کے مختلف گروہ مقامی غیر ہند یورپی اور ہند آریائی عناصر کے پیچیدہ امتزاج کے بعد وجود میں آئے۔ان میں سے خاص خاص (ان کے مسکنوں کے لحاظ سے) یہ تھے: پنجاب، ڈیرہ جات، سندھ اور وادی کابل کے مشرقی حصے پر شمال مغربی گروہ۔ گجرات اور راجھستان میں جنوب مغربی گروہ۔ وسطی ہند (مدیہ دیش) میں مرکزی گروہ۔ بہار، بنگال، شمالی اڑیسہ اور مغربی آسام میں مشرقی گروہ۔قدیم مہاراشٹر کی سرزمین پر جنوبی گروہ۔

وسیع اور نسبتاً بند جغرافیائی علاقوں میں عرصے تک رہنے کی وجہ سے قبائل اور قومیتوں کے ان گروہوں میں ہر ایک کا الگ الگ ارتقا ہوا۔ تولیدی رشتوں اور باہمی میل جول نے ان قومیتوں اور قبائل کے درمیان ثقافتی اور لسانی اتحاد کو بڑھایا جوان گروہوں میں شامل تھے۔

پہلے ہزار سال قبل از مسیح کے وسط کے بارے میں قدیم ہندستانی ذرائع سے ثابت ہوتا ہے کہ برصغیر کے شمال میں چند درجن (لگ بھگ 30) سیاسی وحدتیں (جن پدا) تھیں☆۔ ہر جن پدا کی آبادی کی امتیازی خصوصیت نہ صرف مخصوص علاقہ بلکہ ثقافتی وحدت بھی تھی۔ اس کا اظہار رسوم، رکھ رکھاؤ کے طریقوں اور مذہبی عقائد سے ہوتا تھا جن کی بنیاد مقامی دیوی دیوتاؤں کی پرستش تھی۔ یہاں یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ ہر جن پدا کے لوگوں کی اپنی زبان یا بولی تھی۔

اس سے یہ نتیجہ نکالا جا سکتا ہے کہ معاشرتی معاشی ارتقا کی سطح کے مطابق ہر جن پدا کی آبادی یا تو قومیت تھی یا قرابتی قبائل کا اتحاد (وفاق)۔ یہ بھی ممکن ہے کہ بعض جن پدا ایک ہی بڑی قومیت کے علحدہ علحدہ حصے ہوں۔

طبقاتی معاشرے کے قیام کے ساتھ ساتھ قبائلی بولیوں کا مقامی زبانوں ___ قومیتوں کی زبانوں میں اختلاط ہوا۔ اس کا ثبوت یہ ہے کہ اصطلاح دیشہ بھاشا (قومی زبان) نے رواج پایا۔ اس سے قومیتوں کی ہی زبانیں مراد ہیں۔

برصغیر کے شمال مغربی علاقے میں قبائل اور قومیتوں کے ایک گروہ نے شمال مغرب کی پراکرت کی قرابتی بولیاں (جیسا کہ عالموں کونوف، برو وغیرہ کا خیال ہے) یا گندھارا کی زبان (جیسا کہ بعض ماہرین لسانیات کہتے ہیں) بولنا شروع کر دی تھی۔ یہ پہلے ہزار سالہ عہد قبل از مسیح کے وسط کی بات ہے۔ ان قبائل، اور قومیتوں کی تشکیل قبل از یورپی مقامی آبادی، ہند آریائی قبائل، داردی اور مشرقی ایرانی نسلیاتی عناصر سے ہوئی۔ ان قبائل اور قومیتوں کی زبان کا پتہ ہمیں اشوک کے کتبوں (273-232 قبل از مسیح) اور خاروشتھی تحریر میں بعض مسودوں سے ملتا ہے جو برصغیر سے بہت دور پچھلی صدی کے آخر میں پائے گئے ہیں۔ اپنے ارتقا کی ابتدائی منزل میں شمال مغربی پراکرت کی بولیوں پر قبل از ہند یورپی دراوڑی زبانوں کا اثر پڑا۔ دستیاب شہادتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کا نتیجہ ان اثرات سے کم تھا جنھیں برصغیر کے شمال مشرقی حصوں میں مقامی بولیوں نے پراکرتوں پر ڈالا تھا۔ یہی وجہ ہے۔

Panini, <<Ashtadhyayi>>, IV, I, 148; IV, 2, 76; IV, 2, 118;*
IV, I, 171.

کہ شمال مغرب کی پراکرت نے صوتیات اور شکلیات کے لحاظ اسے بڑی حد تک اپنی قدیمیت محفوظ رکھی (اس کی تصدیق اشوک کے مشرقی اور مغربی کتبوں کے موازنے سے ہوتی ہے)۔

بعد میں داردی اور ایرانی زبانوں نے بھی گندھارا زبان کے ارتقا پر اتنا اثر ڈالا۔ اس کی مشرقی بولیاں شوراسینی پراکرت سے متاثر ہوئیں جو مدیہہ دیش کے مغربی علاقوں کی زبان تھی۔

مدیہہ دیش میں بھی قرابتی ہند آریائی قومیتیں ابھر آئیں جن کا ہند آریائی نسلیاتی فرقے سے تناسلی رشتہ تھا۔ اس فرقے وہاں پہلے (بارھویں اور آٹھویں صدی قبل از مسیح) تشکیل پائی تھی۔ چٹر جی کے خیال کے مطابق ان قومیتیوں کی زبانوں کو آریہ ورت میں کوئنی (یونانیوں کی قدیم ادبی زبان) کا درجہ حاصل تھا۔ اس کی وجہ یہ بھی تھی کہ گوناگوں پراکرتی گروہوں کے درمیان ان کی جگہ (لسانی لحاظ سے) وسط میں تھی: شمال مغرب اور شمال مشرق کے درمیان۔ ہوسکتا ہے کہ یہ مدیہہ دیش کی ایک دیسی زبان پالی ہو جس سے بدھمت کی مذہبی تعلیمات کی زبان نکلی۔ مدیہہ دیش کے مغربی حصے میں زبان دوسری تھی اور اس کا نام تھا شوراسینی۔ بعد میں یہ تحریری زبان بن گئی اور اسے ڈگمبری جینوں نے استعمال کیا۔

برصغیر کے شمال مشرق میں قرابتی ہند آریائی قومیتوں اور قبائل کے ایک گروہ کی تشکیل ہوئی۔ اس میں زیادہ تر مقامی قبل از ہند یورپی (خاص کر اصل مندا) اور ہند آریائی عناصر شامل تھے۔ بعد میں (غالباً پہلے ہزار سالہ عہد قبل از مسیح کی آخری صدیوں میں) جنوب مغرب سے آنے والے دراوڑی قبائل اور شمال مشرق کے تبّتی برمی قبائل بھی اس گروہ میں گھ متھ گئے۔ یہ آخر الذکر قبائل جو برصغیر میں داخل ہوئے تھے ان کا آبائی علاقہ بالائی دریائے یانگ تسی تھا۔ جب وہ وادی برہمپترا کے ساتھ ساتھ گزرے تو ان کا ایک حصہ آسام میں بس گیا (آج کے بودو اور قرابتی قومیتیں اور قبائل ان کے پرانے موروث تھے) دوسرا حصہ بنگال کے شمال اور مشرق میں اور بہار کے شمال میں داخل ہوگیا۔

ان تمام نسلیاتی عناصر کے امتزاج سے قرابتی ہند آریائی قبائل اور قومیتوں کا جو گروہ بنا پراچین ہند اسے پراچی کہا جاتا تھا۔ پراچی کی اقلیم موجودہ بنگال، شمال مشرقی اڑیسہ اور مشرقی اتر پردیش پر محیط تھی اور اس کی مغربی سرحد بنارس سے ملتی تھی ☆۔ پراچیا میں رہنے والے ہند آریائی لوگوں کے نسلیاتی اتحاد کا

احساس یقینی پہلے ہزار سال قبل از مسیح کے وسط میں مکمل ہوا۔اس کا ثبوت وہ ہندستانی داستان ہے جس میں پراچیا کے لوگوں کو پانچ سگے بھائیوں کی اولاد کہا گیا ہے۔دوسری طرف اسی داستان میں ان لوگوں کی ابتدا کے بارے میں ایک کنایہ ہے:منسوب بھائیوں کی ولادت کو وحشی ملیچھوں کے راجہ کی بیوی کے ساتھ ایک داستان گو کی مباشرت کا نتیجہ بتایا گیا ہے۔

برصغیر کے شمال مشرقی علاقے میں بسنے والی ہند آریائی آبادی کی زبانوں کے متعلق کچھ اندازہ اشوک کے مشرقی فرمانوں اور اردھا مگدھ کی پراکرت (پراچیا کے مغربی حصے کی زبان) سے ہوسکتا ہے جو جین مت کی تعلیمات میں استعمال کی جاتی تھی۔بعض ماہرین لسانیات کی تحقیقات میں استعمال کی جاتی تھی۔بعض ماہرین لسانیات کی تحقیقات سے پتہ چلا ہے کہ دوسری پراکرتوں کے مقابلے میں یہ زبانیں ویدی زبان کی بولیوں سے زیادہ دور ہٹ گئیں۔ پہلے ہزار سالہ عہد قبل از مسیح کے آخری نصف میں یہ برصغیر کی سیاسی اور ثقافتی زندگی میں برہمن مخالف تحریک کی زبانوں کی طرح ابھریں جس کا بدھ مت اور جین مت سے تعلق تھا۔ یہ وہی دور تھا جب مگدھ ایک بڑی ریاست کا مرکز بنا اور اس کی زبان نے اہم رول ادا کرنا شروع کیا۔

☆☆☆

پہلے ہزار سالہ عہد قبل از مسیح کے وسط میں وادی سندھ کے شمالی اور شمال مغربی سرے پر کوہستانوں اور پہاڑیوں کے دامنوں میں داردی زبانیں بولنے والے قبائل اور قومیتوں کے گروہ نے تشکیل پائی۔

داردیوں (قدیم ہندستانی دستاویزوں میں دارادا) کو دادائیوں سے شناخت کیا جا سکتا ہے۔ ہیروڈوٹس نے ان کے ملک کے بارے

D.C. Sircar, <<Studies in the Geography of Ancient and Medieval* India>>, pp. 172_173.

میں بتایا ہے جو گندھارا کے شمال میں پہاڑوں میں واقع تھا۔میگس تھینس نے انہیں دیردائی کہا ہے اور ان کا حال اسٹرابون (جلد 15،صفحہ 44) نے ان الفاظ میں بیان کیا ہے ''بڑا ہندستانی قبیلہ جو کوہستان میں رہتا ہے،،۔پلی نیس اور پٹولے مالیس کے یہاں بھی ان کا حوالہ ملتا ہے۔گندھارا کی آبادی (گندھاری، گندھارائی)، وادی گومال میں رہنے والے ساتاگیدی (گندھارا کے جنوب مغرب میں اور

آپریتائی___ ان سب پر دادائی لوگ مشتمل تھے جو ہخامنشی سلطنت کے ساتویں صوبے میں رہتے تھے۔ اس کا ایک اور ثبوت کہ داردی گندھارا کے پڑوسی علاقوں میں رہا کرتے تھے یہ ہے کہ انہوں نے ایرانی فوج میں ایک ہی دستے میں گندھاریوں کے شانہ بشانہ ایک سپہ سالار کے تحت کئی لڑائیاں لڑیں☆۔ داردی وادی کشمیر☆☆ اور اس کے جنوب مشرقی پہاڑوں اور پہاڑیوں کے دامنوں میں بھی آباد تھے (اس علاقے میں ان کے جانشین وہ قومیتیں ہیں جو مرکزی اور مشرقی پہاڑی زبان کی بولیاں بولتی ہیں)۔

سندھ کے مغربی علاقوں میں پہلے ہزار سالہ عہد قبل از مسیح کے وسط میں جو لوگ رہتے تھے ان کی نسلیاتی ساخت کے متعلق ہمیں بہت کم علم ہے۔لیکن ایک بات یقین سے کہی جاسکتی ہے___ اس دور میں اکثر آبادی ایرانی زبانیں بولتی تھی۔

موجودہ ڈھیرہ جات، افغانستان اور شمالی بلوچستان میں ایرانی زبانیں پھیلنے کی وجہ یہ تھی کہ بعض ایرانی قبائل اپنے جدی علاقے وسطی ایشیا سے وہاں آ کر آباد ہو گئے تھے۔ اس پیش قدمی کی علحدہ علحدہ منزلوں اور راہوں کے بارے میں کوئی شہادت نہی ملتی۔ غالبًا یہ دوسرے ہزار سالہ عہد قبل از مسیح کے آخر اور پہلے ہزار سالہ عہد قبل از مسیح کی بات ہے☆☆☆۔

Herodotus,<<Istoria>>, VII, 66.*

D.C. Sircar,<<Studies in the Geogaphy of Ancient and Medieval** India>> p. 25, Note 4.

☆☆☆ایرانی قبائل کے سفر کے راستوں اور مغربی ایران میں ان کی آمد کے متعلق کافی مطالعہ کیا گیا ہے اور اس پر خاصا مواد ہے لیکن تاریخ دانوں کا متفقہ نقطہ نظر نہیں ہے۔

''اویستا'' اور قدیم فارسی رسم الخط میں لکھے ہوئے کتبوں اور پرانے جغرافیہ دانوں اور مورخوں کے ذرائع سے بھی ان لوگوں کا حوالہ ملتا ہے جو سندھ کے مغربی علاقوں میں رہتے تھے۔ چنانچہ یونانی جغرافیہ داں ایراتوس تھے نیس نے جو تیسری صدی قبل از مسیح میں رہتا تھا (جیسا کہ اسٹرابون نے لکھا ہے) بیان کرتا ہے کہ اس کے زمانے میں یہ لوگ یہاں رہا کرتے تھے: ہندوکش کے جنوبی دامنوں میں پاروپامی ساڈی، ان کے جنوب میں آراخوتی اور مزید جنوب میں گیدروسی (موجودہ بلوچستان)۔''سندھ جوان ملکوں کے عرض البلد پر سے گزرتا ہے ان سب کو چھوتا ہے....آریہ مغرب میں پاروپامی ساڈیوں کے

قریب ہیں، اور درانگی (زرانگی) آراخوتیوں اور گیدروسیوں کے نزدیک،،☆۔جس ملک میں یہ لوگ آباد تھے اس کے مشرق میں سندھ، شمال میں ہندوکش، جنوب میں بحیرہ عرب اور مغرب میں میدیا اور ایران تھے۔اس علاقے کو آریانا کہا جاتا تھا۔''لیکن آریانا ایران کے ایک حصے اور میدیا اور باختر اور آریا کے شمالی علاقوں پر محیط ہے کیونکہ یہاں لوگ مختلف زبانیں نہیں بولتے۔،،☆☆

ان لوگوں کی زبانوں کے متعلق ہم کیا جانتے ہیں؟

افغانستان کے جنوبی اور جنوب مشرقی علاقوں میں اشوک کے جو کتبے ملے ہیں ان پر قدیم ایرانی زبان کے الفاظ کندہ ہیں۔سوویت مورخ فری مان کا خیال ہے کہ بعض کتبوں کے تجزیے کے بعد یہ نتیجہ نکالا جاسکتا ہے کہ ان کا خطاب اس آبادی سے ہے جو ایرانی زبان بولتی تھی اور زرتشتی مذہب مانتی تھی۔

سوویت مورخ بیر تیلس کی رائے ہے کہ اس آبادی کی زبان کا ''اویستا'' کی زبان سے تعلق ہوسکتا ہے۔

مغربی تاریخ داں اسٹین کا کہنا ہے کہ ''اویستا'' کی زبان

Strabon, <<Geographika>>, XV, 2,9,☆

☆☆ چینی سیاح چانگ چین نے 135 اور 115 برس قبل از مسیح کے درمیان ''مغربی ملکوں،، کا دورہ کیا اور دیکھا کہ فرغانہ اور پارتھیا کے درمیان علاقوں میں لوگ مختلف بولیاں بولتے ہیں لیکن ان کا طرز زندگی یکساں ہے اور وہ ایک دوسرے کو سمجھتے ہیں۔کا (خاص کر قدیم جوگا تھاؤں میں تحریر ہے) ویدی بھجنوں کی زبان سے گہرا رشتہ ہے۔اس سے ایک اور ثبوت فراہم ہوتا ہے کہ اس علاقے میں قدیم ایرانی بولیاں بڑے پیمانے پر بولی جاتی تھیں۔یہ رشتہ غالباً پہلے ہزار سالہ عہد قبل از مسیح کی ابتدا میں تھا۔ اس سے رابطہ ثابت ہوتا ہے۔اور رابطے کا خطہ ہلمند دریا کی وادی کے قریبی علاقے ہوسکتے ہیں۔

پہلے ہزار سالہ عہد قبل از مسیح کے وسط میں مشرقی ایرانی بولیاں جو وادی سندھ کے مغربی علاقوں میں عام تھیں چند گروہوں میں بٹ گئیں اور ان میں سے ہر گروہ معین رقبے کے لئے مخصوص ہو گیا: باختر، آراخوزیا (ہاراہوواتش)، درانگیانہ اور گدروسیا۔ان میں سے پہلے گروہ___باختر کے متعلق کچھ اندازہ سرخ کوتل کتبے سے ہوسکتا ہے جسے آثار قدیمہ کی ایک فرانسیسی مہم نے افغانستان میں مئی 1957 میں دریافت کیا☆۔

آراخوتی، درانگی یا گدروسی بولیوں میں کتبے ابھی تک نہیں ملے ہیں۔ان علاقوں میں قدیم ایرانی بولنے والے لوگوں کے جدامجد غالبًا دوچھوٹی قومیتوں ___ اورمری (باراکی) اور پراچی سے تعلق رکھتے تھے۔ یہ ہندوکش کے جنوبی دامنوں، موجودہ افغانستان کے جنوب مشرق اور پاکستان میں پھیلے ہوئے تھے☆☆۔

پہلے ہزار سالہ عہد قبل ازمسیح کے آخری نصف میں ان قبائل اور قومیتوں کے درمیان جو ہندآریائی اورمشرقی ایرانی اورمشرقی ایرانی زبانیں اور بولیاں بولتے تھے، قدرتی سرحد سلسلہ کوہ سلیمان تھی۔ جنوب مغرب میں یہ سرحد حب دریا تھی جو بحیرہ عرب میں موجودہ

☆ سرخ کوتل کے کتبے سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ پہلی عیسوی صدی کے آخر اور دوسری عیسوی صدی میں کندہ کیا گیا تھا۔ یہ مشرقی ایرانی زبان میں ہے جو ایک طرف پشتو اور یدگا منجی اور دوسری جانب سوگ دی، خوارزمی اور پارتھی زبانوں کے بین بین تھی۔

G. Morgenstieme, <<Report on a Linguistic Mission to Afghanistan>>,** pp.16,36

کراچی سے 50 کلومیٹر کے فاصلے پر گرتا ہے۔شمال مغرب میں کابل اور اس کے معاون دریاؤں کی وادیوں میں جو لوگ رہتے تھے ان کا ایک بڑا حصہ ہندآریائی تھا۔قدیم یونانی مورخ اریانوس لکھتا ہے کہ ہندستانی باختریوں اور آراخوتیوں کے پڑوسی تھے۔لیکن مشرقی ایرانی قبائل نے ان علاقوں میں پہلے داخل ہونا شروع کر دیا تھا (غالبًا پہلے ہزار سالہ عہد قبل ازمسیح کے اول نصف میں)۔

پاکتی جو کابل کے نشیب میں آباد ہو گئے تھے غالبًا ان قبائل میں سے ایک تھے۔ ہیروڈوٹس نے ہندستانیوں کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ ''دوسرے ہندستانی شہر کاس پاتیر (کاس پاپیر) اور پاک تیوں کے قریب رہتے ہیں،،☆۔اس سے یہ نتیجہ نکالا جا سکتا ہے کہ پاک تی ہندستانی نہیں تھے۔ وہ ایرانی ہوسکتے ہیں۔اس کا ثبوت یونانی مورخ ہے کا تائی می لے سی کے اس بیان سے ملتا ہے کہ کاس پاتیر (کاس پاپیر) جو گندھارا کا ایک شہر تھا سیتھیا کے کنارے پر تھا۔اس کا مطلب ہوا کہ وہ سیتھیا یا مشرقی ایران کی سرحد کے قریب ایک آبادی یا شہر تھا۔

وادی سندھ کی سرحد کے مغربی اور شمال مغربی علاقوں میں جرگہ تنظیم کے ٹوٹ جانے کے بعد ایک

قسم کے قبائلی اتحاد قائم ہوئے۔ یہ کمزور اتحاد تھے جو اس علاقے میں طبقاتی معاشرے اور غلامی کے نظام کی پہلی ریاستوں کے پیش رو تھے۔ مشترکہ وفاق کے ڈھانچے کے اندر ان اتحادوں میں نہ صرف قرابتی بلکہ دور کے رشتے اور نسل سے تعلق رکھنے والے قبائل اور ایک ہی علاقے میں رہنے والے قبائل بھی شامل تھے۔ ان میں سب سے بڑا اتحاد وہ وفاق تھا جس کا مرکز ایک مشرقی ایرانی قبیلہ کمبوجہ تھا☆ ☆۔ اس وفاق کی سرحدیں اور راجوری کی وادی (کشمیر کا جنوب مغربی حصہ) سے لے کر سلسلہ ہندوکش تک پھیلی تھیں، جنوب مغرب میں وہ کابل اور غزنی اور بعض اوقات قندھار تک پہنچتی تھیں۔

☆ بعد میں یہ قبیلہ دوسرے لوگوں میں ضم ہو گیا، چنانچہ پھر اس کا کہیں ذکر نہیں آتا۔

☆ ☆ قدیم ہندستانی ذرائع سے معلوم ہوتا ہے کہ کمبوجہ کی زبان ہند آریائی زبانوں سے مختلف تھی، اس کا تعلق ایرانی زبانوں سے تھا۔

کچھ عالموں کا خیال ہے کہ قبیلے کمبوجہ کے نام کو ملک اور شہر کاپی شا سے وابستہ کیا جا سکتا ہے۔ اگر یہ وابستگی درست ہے تو پھر ہم یہ دعوی کر سکتے ہیں کہ کمبوجہ کے زیر رہنما وفاق کا مرکز موجودہ کابل کے شمال مشرق میں سلسلہ ہندوکش اور کونار دریا کے درمیان تھا۔

مشرقی ایرانی قبائل نے قدیم زمانے سے سندھ علاقوں میں داخل ہونا شروع کر دیا تھا۔ پانی نی نے ''اشٹ دھیائی'' میں لکھا ہے کہ شہر کے نام کا کانتھا پر خاتمہ (مشرقی ایرانی کاندا سے: سمرقند، یارقند، تاشقند وغیرہ) مقامات (شہر، آبادیاں) کے نام کو ظاہر کرنے کے لئے استعمال کیا جاتا تھا۔ اور یہ وارنو (نشیبی قرم ــــ موجودہ بنوں) اور اشی نارا (پنجاب میں راوی کے نشیب میں) دونوں علاقوں میں رائج تھا۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ پہلے ہزار سالہ عہد قبل از مسیح کے وسط پر زیر بحث علاقوں میں مشرقی ایرانی بولنے والے لوگ موجود تھے۔ ٹکسیلا میں بھی ایرانی آبادی تھی۔ اسٹرابون لکھتا ہے کہ اس شہر کے بعض باشندے مردہ لوگوں کو کھلی جگہ شکاری پرندوں کے لئے چھوڑ دیتے تھے☆۔

جو ایرانی قبائل سندھ کے مشرق سے آئے تھے انہیں مقامی ہند آریائی آبادی نے تیزی سے جذب کر لیا۔ مے گاس تھے نیس جس نے چوتھی اور تیسری صدی قبل از مسیح میں ہندستان کا کئی بار سفر کیا اور جو شمالی علاقے سے بخوبی واقف تھا لکھتا ہے کہ ہندستان میں بسنے والے لوگوں میں ''کوئی اجنبی نہیں۔ سب بظاہر ملک کے اصلی مقامی باشندے ہیں''۔

پہلے ہزار سالہ عہد قبل از مسیح کے وسط کے بعد سے شمال مشرق گروہ کے ایرانی قبائل نے ___ جنھیں ساکا کہا جاتا ہے ___ سندھ کی وادی میں داخل ہونا شروع کیا۔ آثار قدیمہ کے شواہد بتاتے ہیں کہ ساتویں اور چھٹی صدی قبل از مسیح میں بھی ساکا قبائل برصغیر کی شمالی سرحدوں کے پاس پامیر کے علاقے کی بادیہ پیمائی کیا کرتے تھے۔ قدیم مورخوں نے بعد میں اس کی تصدیق کی ہے۔ مشرقی پامیر میں ساکا قبائل کے جو مقبرے کھودے گئے ہیں ان

☆ یہ آتش پرست ایرانیوں کی رسم تھی۔ (ایڈیٹر)

سے ثابت ہوتا ہے کہ وہ پانچ سو چار سو سال قبل از مسیح پرانے ہیں۔ ان میں ہندستان کی بنی ہوئی اشیا بھی پائی گئی ہیں جو اس کا بین ثبوت ہیں کہ ایک زمانے میں وادی سندھ کی آبادی اور شمال مشرق ایرانی قبائل کے درمیان رابطے تھے۔

ان قبائل کی ابتدا کے مطالعے میں سوویت عالموں نے بیش بہا اضافہ کیا ہے۔ جنوبی پامیر میں ان کے 5 سو سال قبل از مسیح پرانے کچے قبرستان ہیں۔ ان کی تحقیقات سے پتہ چلتا ہے کہ ان لوگوں کا انتہائی مشرقی حصے والی دراز سر والی نسل سے تعلق تھا جس کے رشتے یورپی رومی (ہندرومی) چھوٹی نسل سے تھے۔ نسلیاتی تولیدی لحاظ سے ان کا تعلق ماورائے خزری سیتھیا کے لوگوں کے جنوبی اور مغربی نسلیاتی گروہوں سے تھا۔

پہلے ہزار سالہ عہد قبل از مسیح کے وسط میں پامیر اور اس کے آس پاس کے علاقوں کی آبادی ایک گتھے ہوئے مشرق ایرانی نسلیاتی فرقے میں ضم ہوگئی۔ اس کی ثقافت مشترکہ تھی۔ اس نسلیاتی فرقے کو ساکا ھاؤ ماوارگا سے شناخت کیا جا سکتا ہے جو نقش رستم اور دارا کے دوسرے کتبوں میں درج ہے۔ اسے آمورگی سیتھیا والوں سے بھی پہچانا جا سکتا ہے جن کا ذکر ہیروڈوٹس نے کیا ہے جو سیتھیا خطے کی جنوب مشرقی سرحد پر آباد تھے۔ اس سلسلے میں ہیروڈوٹس کے یہ الفاظ بڑے پر معنی ہیں: ''ساکاؤں کا مطلب اصل آمورگی سیتھیا والے ہیں''۔ اسٹرابون کا خیال ہے کہ ماس ساگیتی اور ساکا سیتھیا کے انتہائی مشرق علاقے کے لوگ تھے، حالانکہ ہر ایک کا اپنا اپنا نام جدا تھا۔

ساکاؤں کی آمد سے پہلے پامیر کے جنوبی علاقوں اور ہندوکش کے مشرق میں جو چند غیر ایرانی قبائل آباد تھے وہ مشرقی ایرانی قبائل کے علاوہ ساکا ھاؤ ماوارگا کے وفاق میں شامل تھے۔ اس کا ثبوت

انسانیاتی اور آثار قدیمہ کے شواھد سے ملتا ہے اور قدیم ذرائع کے اندراجات سے بھی۔ پٹولے مالیس نے ساکا دیس میں رہنے والے قبائل میں بل تا کا ذکر کیا ہے۔ اس کا نسلیاتی نام بالتستان سے وابستہ ہے جو مزید مشرق میں واقع تھا۔ یہاں بڑی تعداد میں داردی رہتے تھے۔ یہ بھی ہوسکتا ہے کہ بل تا داردی قبیلہ ہو جسے ساکاؤں نے جزوی یا کلی طور پر جذب کر لیا ہو۔

پہلے ہزار سالہ عہد قبل از مسیح کے وسط میں ساکاؤں کی زبان کیا تھی اس کے متعلق معلومات انتہائی محدود ہیں۔ وہ صرف چند ذاتی اسموں، بعض ساکا قبائل کے ناموں اور علم تسمیے تک محدود ہیں۔ بعد کے دور میں اس کی بابت سکوں اور خاروشتھی اور برہمی رسم الخطوط میں چند عبارتوں سے کچھ اشارے ملتے ہیں۔ تمام معلومات جمع کرنے کے بعد یہ نتیجہ اخذ کیا جاسکتا ہے کہ ساکاؤں کی زبان کا کسی مشرقی ایرانی بولی سے تعلق تھا۔

موجودہ پاکستان کی سرزمین پر بعض علیحدہ علیحدہ خطوں میں ایسے قبل از ہند آریائی لوگ آباد تھے جس کسی وجہ سے دوسروں میں جذب نہیں ہوئے۔ ان میں سے ایک خطہ شمال مشرقی بلوچستان کے بیچوں واقع تھا جہاں پاراتا یا پارادا لوگ رہا کرتے تھے۔ بعض عالموں کا خیال ہے کہ موجودہ بروہی قبیلے جدامجد یہی تھے۔

☆☆☆

چھٹی صدی قبل از مسیح کے آخر میں موجودہ پاکستان کا ایک حصہ اور افغانستان کے جنوبی اور جنوب مشرق علاقے قدیم ایرانی ہخامنشی سلطنت میں شامل کر لئے گئے۔ دارا اول کے پہلے ستوں پر جو ہس تون کتبہ ہے اس کی چودھویں سے سترہویں سطر تک میں اس کے ماتحت ملک گندارا (گندھارا)، ماکا (مکران)، ساتا گوش (ساتا گیدیا)، ھاراھوواتش (آراخوزیا) کے نام ملتے ہیں۔

پرسیپولس کے کتبے اور نقش رستم کے لوح مزار پر جو دارا کے آخری عہد سے تعلق رکھتے ہیں باجگزار ہندو (ہندوش) یعنی برصغیر ہند کا حوالہ ہے۔ یہ علاقہ دریائے سندھ کے درمیانی اور نشیبی علاقوں اور پنجاب کے مغربی حصے پر مشتمل تھا۔

ہخامنشی اقلیم میں داردی ملک کا مغربی حصہ بھی شامل تھا۔ یہ دارا کے جانشینوں خرخس (486-465 قبل از مسیح) اور ارتاخرخس (465-423 قبل از مسیح) کے عہد کی بات ہے۔ اس سے ایک اور بات واضح

ہوتی ہے ___ جن علاقوں میں داردی رہتے تھے انہیں قدیم ایرانی سلطنت میں کافی بعد میں شامل کیا گیا۔
قبائل اور عوام میں اتحاد نہ ہونے کے باعث اور بعض ریاستوں کے حکمرانوں ی غداری اور بزدلی کی وجہ سے ہخا منشی سلطنت کی سرحدیں موجودہ پاکستان اور جنوب مشرقی افغانستان تک پھیلی گئیں۔ پانچویں صدی قبل از مسیح کے آخر اور چوتھی صدی قبل از مسیح میں جب ہخا منشی سلطنت کمزور ہوگئی تو سندھ کے پار علاقے آزاد ہوگئے۔ اور سندھ کے مغرب میں سکندر اعظم نے ایرانی مملکت کو تہس نہس کر ڈالا۔

ہخا منشی سلطنت میں برصغیر کے شمال مغربی حصے کے شامل ہو جانے سے پرانے رشتے پھر بحال ہو گئے اور ان علاقوں کے درمیان رابطے مزید بڑے جن کا مرکز وادی سندھ تھا۔ اس نے مغربی ایشیا، خاص کر قدیم ایران، ایلام، دجلہ وفرات کی وادیوں اور شام کے غلامی نظام کی معاشرتوں سے رابطوں کو ترقی دی۔ ان ہی رابطوں کے سبب برصغیر ہندو پاکستان کے شمال مغربی حصے نے اس ثقافت کے بعض عناصر حاصل کئے جسے ہم ہخا منشی ثقافت کہہ سکتے ہیں۔

ہخا منشی سلطنت میں نظم ونسق اور بین الاقوامی امور کی زبان آرامی تھی☆۔ یہ بات دلچسپ ہے کہ ہخا منشی سلطنت کے خاتمے اور برصغیر کے شمال مغربی علاقوں کے موریہ سلطنت میں شامل ہونے کے بعد بھی آرامی زبان کا استعمال جاری رہا۔ اس کا ثبوت اشوک کے آرامی زبان میں لکھے ہوئے کتبوں سے ملتا ہے جو پاکستان اور جنوبی افغانستان میں پائے گئے ہیں۔

آرامی رسم الخط کے زیر اثر ہی خاروش تھی کا تہجی رسم الخط شروع ہوا جو پانچویں صدی عیسوی تک جاری رہا۔ یہ بھی ممکن ہے کہ آرامی تحریر نے برہمی رسم الخط پر بھی اثر ڈالا ہو جو موجودہ تمام ہندستانی حروف تہجی کا سر چشمہ ہے۔

R.E.M. Wheeler, <<Early India and Pakistan to Ashoka>>,* pp. 171_172.

یہ قدیم ایران کے اثر ہی کا نتیجہ تھا کہ اشوک کے عہد میں تمام ہندستان میں ریاست کے بنیادی قوانین اور فرمان چٹانوں اور ستونوں پر کندہ کئے گئے۔ اس سلسلے میں یہ یاد رکھنا ضروری ہے کہ تخت نشین ہونے سے پہلے اشوک گندھارا کا گورنر تھا۔ بعض عالمون نے لکھا ہے کہ اشوک کے فرمانوں کی تمہید پر ایرانی اثر کی چھاپ ہے اور ان کی اصطلاحوں پر بھی۔ ایک اور ثبوت یہ ہے کہ موریہ سلطنت میں کاتب

(لیپی کار) شمال مغربی علاقے سے آتے تھے جہاں ایرانی آرامی روایات کا بول بالا تھا۔خود لفظ لیپی کار ایران سے لیا گیا ہے۔

موریہ خاندان کے راجاؤں نے ایک حد تک ایرانی دربار کے آداب اور مذہبی رسوم اختیار کیں۔ ہخامنشی نظم ونسق کے اثرات بھی برصغیر کے شمال مغربی علاقے نے قبول کئے اور زر کے بعض اصول بھی☆۔اس کے فن تعمیر اور دستکاری پر ایران کا اثر نمایاں ہے☆☆۔

لیکن برصغیر کے شمال مغربی علاقے پر ایران کا اثر بہت گہرا نہیں تھا اور وہ معاشرے کے چوٹی کے لوگوں تک محدود تھا۔ہخامنشی نے ہندستان کے جو علاقے فتح کئے تھے ان پر ایرانیوں کی دوسو سال تک حکمرانی رہی لیکن وہ ایرانی نہیں بنے۔عوام (جیسا کہ ٹکسیلا میں دریافت شدہ اشوک کے کتبوں سے ظاہر ہوتا ہے) اور تعلیم یافتہ لوگوں کی بھی مادری زبان شمال مغربی پراکرت رہی۔اس کا ایک اور ثبوت یہ ہے کہ گندھارا کی بولی کا راجہ کالنگا کے فرمانوں کی زبان پر کافی اثر ہے۔ برصغیر کے شمال مغربی علاقے پر غیر ملکیوں کا عرصے تک غلبہ رہا لیکن اس کی ثقافتی روایات کی توانائی قائم رہی۔اس کا زندہ ثبوت عظیم

J. Marshall, <<Taxila,an Illustrated Account of Archaeological Exca-* Vations...>>, Vol. I, p. 14.

R.E.M. Wheeler,<<Iran and India in Pre-Islamic Times>>, pp. 94_** 101; S.Piggott, <<Throne-Fragment from Pataliputra>>, p. 103; R.E.M. Wheeler, <<Early India and Pakistan to Ashoka>>, pp. 173_175.

پانی نی ہے جو کلاسیکی سنسکرت کے قواعد کا مصنف ہے۔وہ اسی خطے میں پیدا ہوا تھا۔

قدیم جغرافیہ دانوں اور مورخوں کی تصانیف میں (پانچویں اور چوتھی صدی قبل از مسیح) برصغیر کے شمال مغربی علاقے کا جو ذکر کیا گیا ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ عوام کی ثقافت بنیادی طور پر مقامی تھی۔ ماہرین آثار قدیمہ نے گذشتہ دھائیوں میں مادی ثقافت کی جو یادگاریں کھودی ہیں ان سے بھی یہی ثابت ہوتا ہے۔

ہخامنش کے حملوں کی وجہ سے موجودہ پاکستان اور جنوبی افغانستان ایران کی نوآبادیاں نہیں

بنے۔ یہ ٹھیک ہے کہ ہمیں اس علاقے میں قلعوں کی تعمیر کے حوالے ملتے ہیں۔ دراصل یہ حملہ آور کی قوت کے گڑھ تھے۔ مارشل کا خیال ہے کہ ٹکسیلا کی بنیاد دارا اول نے ڈالی تھی جو مشرقی گندھارا کا بڑا ثقافتی اور سرکاری مرکز تھا☆۔ اگر ایرانی فوج نے بعض قلعوں میں پڑاؤ ڈالا بھی ہو تب بھی دستیاب شہادتوں سے ثابت ہوتا ہے کہ موجودہ پاکستان اور جنوبی افغانستان کے علاقے میں اس کا نسلیاتی عوامل پر بہت کم اثر پڑا۔ اگر موجودہ پاکستان اور اس کے پڑوسی علاقوں کے لوگوں کے جدامجد نے چند ایرانی عناصر جذب کر بھی لئے ہوں تو ان کا عوام کی نسلیات پر کوئی رنگ نہیں چڑھ سکا۔

☆☆☆

پاکستان کے لوگوں کے تاریخی مقدر پر ھخامنشی حکمرانی کے مقابلے میں یونان ومقدونیہ کا حملہ زیادہ اثر انداز ہوا۔

سکندر اعظم کی فوج ہندستان کی سرحد پر 327 سال قبل از مسیح کی بہار میں پہنچی۔ دریائے سندھ سے دریائے بیاس تک کی سرزمین کو فتح کرنے میں اسے دو سال لگے۔ چھوٹے چھوٹے ہندستانی حکمرانوں کی آپس میں رقابتیں__ ٹکسیلا کا راجہ آمبھی تو حملہ آوروں سے گیا تھا__ اتحاد کی کمی، مقامی قبائلی وفاقوں میں

J. Marshall, <<Taxila, an Illustrated Acount of Archaeological* Excavations...>>, Vol. I, p. 12.

باہمی چشمک__ ان سب باتوں نے یونان ومقدونیہ کی فوج کو فتح حاصل کرنے میں مدد دی۔

یکے بعد دیگرے اپنے دشمنوں کو شکستیں دے کر سکندر نے مفتوحہ علاقے کو تین صوبوں میں تقسیم کر کے انہیں اپنی سلطنت میں شامل کر لیا۔ سکندر کا انتقال 323 سال قبل از مسیح میں ہوا۔ اس کے فوراً بعد موریہ خاندان کے چندر گپت نے سندھ کی دونوں جانب یونانی صوبیداروں کا اقتدار الٹ دیا۔ چندر گپت کا ایک جانشین اشوک ان علاقوں کا حکمراں بنایا گیا۔ ان کے علاوہ مغربی گندھارا، ساتا گیدیا، آراخوزیا اور گیدروسیا بھی اس کی زیر حکمرانی تھے۔ اس کا ثبوت اشوک کے زمانے کے دو زبانوں میں وہ کتبے ہیں جو قندھار میں پائے گئے ہیں۔ اشوک کی موت کے بعد یہ علاقے آزاد ہو گئے۔ کہا جاتا ہے کہ تیسری صدی قبل از مسیح میں سوبھا گاسینا کی گندھارا پر حکمرانی تھی۔ یونانی مورخ پولی بیس نے اپنی تصنیف میں اس کا

ذکر کیا ہے۔ یہ انتی اوخ سوم کی مشرق کی جانب پیش قدمی سے عین پہلے کی بات ہے۔سکوں سے پتہ چلتا ہے کہ گیدروسیا کے کئی آزاد حکمراں گزرے ہیں۔

موریہ سلطنت کے خاتمے سے دوسرے یونانی فاتح کو وادی سندھ پر قبضہ کرنے کا موقع ملا۔ یہ دے میت ریس تھا یوتھی ڈے مس کا بیٹا، اس آزاد ھیلینی ریاست کا حکمراں جو تیسری صدی قبل از مسیح کے آخر میں باختر میں ابھری تھی۔ دے میت ریس نے وادی سندھ کے خاصے حصے پر قبضے کرلیا۔

باختر کے ھیلینی حکمرانوں نے سکندر کے مقابلے میں زیادہ لوگوں کو مفتوح کیا۔ان کی توسیع پسند پالیسی کا نتیجہ یہ نکلا کہ برصغیر کے شمال مغرب میں ہندو یونانی سلطنت قائم ہوئی۔ یہ کشمیر سے لے کر بحیرہ عرب کے ساحل تک پھیلی ہوئی تھی۔اسٹرابون کی شہادت کے مطابق جنوب میں ہندیونانی حکمرانوں کی عمل داری دریائے سندھ کے نشیب اور سوراشٹر تک تھی۔ان میں سب سے طاقت ورمے نان دیر (دوسری صدی قبل از مسیح کے وسط میں) تھا جو ''بندرگاہوں، کانوں، شہروں اور چنگی گھروں کا مالک تھا،،☆۔

<<Milindapanha>>, Vi, 19.*

اس کے مرنے کے بعد ہندیونانی سلطنت چھوٹی چھوٹی ریاستوں میں تقسیم ہوگئی۔اس کا علم ہمیں اس زمانے کے سکوں سے ہوتا ہے۔ان میں سے بعض ہمارا دور شروع ہونے تک قائم رہیں۔

☆☆☆

ھیلینی ثقافت دراصل یونانی اور مشرقی ثقافتوں کا گلدستہ تھی۔اس نے برصغیر ہندو پاکستان کی شمال مغربی سرزمیں پر اپنے گہرے نقوش چھوڑے۔ یہ صحیح ہے کہ ھیلینی دنیا کے مشرقی کنارے پر یہ اثر مغربی ایشیا کے ملکوں کے مقابلے میں بہت کم تھا۔لیکن مقامی آبادی پر اس اثر کو کم بتانا بھی غلطی ہوگی۔ یہاں یہ بات ذہن نشین کرنے کی ضرورت ہے کہ وادی سندھ نے ھیلینی اثرات بڑی حد تک یونانی باختری ثقافت کے تحت قبول کیئے۔اس طرح وادی سندھ نے ھیلینیت کی وسطی ایشیائی شکل اختیار کی۔

برصغیر کے شمال مغربی علاقے کے لوگ قدیم یونانیوں اور ان کی تہذیب کے بعض عناصر سے چھٹی صدی قبل از مسیح کے اواخر اور پانچویں صدی قبل از مسیح کی ابتدا میں روشناس ہوئے۔ایک وسیع رقبے پر جو بحیرہ ایجین سے وادی سندھ تک پھیلا ہوا تھا سائیرس اعظم اور اس جانشینوں کے اقتدار کے قیام نیا اس سلسلے میں اہم کردار ادا کیا۔ پانی نی کو یونانی تحریر ___ یوانانی لپی ___ کا علم تھا۔قدیم مصنفین کی تحریروں

میں ہمیں ہخامنشی سلطنت کے مغربی علاقوں والے لوگوں کے مشرق کی جانب باختر اور سوگد میں آباد ہونے کے بعض حوالے ملتے ہیں۔اس کے باوجود یہ فرض کرنے کا کوئی جواز نہیں ملتا ہیں۔اس کے باوجود یہ فرض کرنے کا کوئی جواز نہیں ملتا کہ سکندر کے حملوں سے پہلے ہخامنشی سلطنت کے مشرق میں (برصغیر کے شمال مغرب میں) بڑی بڑی ھیلینی (قدیم یونانی) آبادیاں تھیں۔اسی طرح وادی کابل کے نشیب میں شہر نیسا کو یونانی نو آبادی کہنا بھی صحیح نہیں ہے۔اری آنس تک نے اس داستان پر تبصرہ کرتے ہوئے کہ نیسا کا بانی دیونی سس تھا لکھا: ''اگر اسے واقعات کی قدرتی رفتار کی روشنی میں دیکھا جائے تو یہ غیر معقول معلوم ہوتا ہے،،☆۔

Arrianus, <<Anadasis>>, V, I, 2,

سکندر اعظم اور اس کے جانشینوں کے برصغیر کے جن لوگوں کو اپنی فوج میں بھرتی کیا انہوں نے مقامی آبادی کے مقابلے میں پہلے ھیلینی تہذیب اختیار کی۔یہ لوگ مقدونیہ کے ھتیاروں سے مسلح ہوتے تھے اور انہیں فوجی تربیت بھی مقدونیا پر دی جاتی تھی۔ھیلینی تہذیب کا سب سے زیادہ اثر ان بچوں پر ہوا جو مقدونیہ کے سپاہیوں اور ایشیائی عورتوں کے ازدواج کا نتیجہ تھے،اور ان شہروں کی آبادی پر بھی جنھیں یونانی مقدونیائی حملہ آوروں نے تعمیر یا از سر نو تعمیر کیا تھا۔ان شہروں میں یونان اور مقدونیہ کے وہ سپاہی آباد تھے جو فوجی خدمات انجام نہیں دے سکتے تھے،ان کے علاوہ مقامی لوگ بھی تھے۔دی اودورس لکھا ہے کہ سکندر نے ایک شہر آباد کرنے کے لئے 10 ہزار لوگ حاصل کئے جس خود اس نے سندھ کے نشیب میں تعمیر کیا تھا۔سلیوقس نکاتور نے بھی کئی نئے شہر تعمیر کئے جو اس کی وسیع سلطنت میں ہر طرف پھیلے ہوئے تھے۔ان میں ''سکندر وپولس ہندستانیوں کی سرزمین پر تھا،،☆۔

قدیم ہندستانی ذرائع سے بھی ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ وادی سندھ میں یونانی باختری اور ہند یونانی ریاستوں کے فرمانرواؤں نے کئی شہر تعمیر کئے۔

اگر چہ ابتدا میں شہروں کی تعمیر (جو یونان اور مقدونیہ کے نو آبادیاتی نظام کا پرتو تھی) فوجی ضروریات کے لئے مقصود تھی (ھیلینی بستیاں حملہ آور کی حکمرانی کے مضبوط اڈے تھیں) لیکن جو شہر سکندر اور اس کے جانشینوں نے بنائے انہوں نے آہستہ آہستہ یونانی شہروں کی امتیازی خصوصیات اختیار کر لیں۔اسی طرح ہند یونانی ریاست کے حکمرانوں نے جو شہر تعمیر کئے وہ بھی ھیلینی خصوصیات کے حامل بن گئے۔چنانچہ ''می

لندا پان ھا،، میں درج ہے کہ شہر کے تعمیری منصوبے میں ایک معیار (صلیب کی شکل) پر عمل کیا جاتا تھا۔ سیاحوں کی تحریروں اور آثار قدیمہ کے مواد سے اس کی تصدیق ہوتی ہے۔

یونان اور مقدونیہ کے استاد، دستکار اور تاجر جوان شہروں

Appian, <<Syriake>>, 57.*

میں آباد ہو گئے تھے انہوں نے وہاں یونانی زبانیں، طرز زندگی، رسم ثقافت، دستکاری اور فنی ٹیکنک پھیلائے۔ یونان اور مقدونیہ کے حملہ آور غلاموں کے مالکوں کے طبقے کے خیل بن گئے۔ اس نے بھی ھیلینیت پھیلانے میں مدد دی ہوگی۔ اسے غلاموں کی مقامی مالک اشرافیہ اور معاشرے کے سرخیلوں کی ضروریات پوری کرنے والے دستکاروں اور تاجروں نے بڑی خوشی سے قبول کیا ہوگا۔

اہم تجارتی، سیاسی، انتظامی مرکزوں کی چہار دیواری سے باہر ھیلینی تہذیب کا اثر آٹے میں نمک کے برابر تھا۔ عام آبادی کو اس نے بہت کم متاثر کیا۔ اس کا ثبوت دستاویزوں اور آثار قدیمہ کی شہادتوں سے ملتا ہے۔ دیہات اور شہروں میں عام لوگ اپنی مقامی زبانیں بولتے تھے، مقامی عقائد مانتے تھے اور اپنی ہی تہذیبی روایات پر چلتے تھے۔ ھیلینی اثرات نے سب سے زیادہ رنگ دستکاری، فن، ثقافت، سائنس وغیرہ کی ان شاخوں پر جمایا جن کا ماشرے کے حکمراں حلقے کی ضروریات پوری کرنے سے تعلق تھا۔

برصغیر کے شمال مغرب میں دوسری صدی قبل از مسیح اور پہلی عیسوی صدی کی جو مصنوعات دریافت کی گئی ہیں (زیورات، دھات کی اشیا، پتھر اور ہاتھی دانت کی ترشی ہوئی چیزیں، مورتیاں وغیرہ جو دولت مند خریداروں کے لئے مخصوص تھیں) اکثر یونانی فن کا نمونہ معلوم ہوتی ہیں لیکن ھیلینی اثر کی جھلک بعض اوقات ان اشیا (مثلاً کوزہ گری) میں بھی دکھائی دیتی ہے جنھیں دستکاروں نے مقامی روایات کے مطابق عام لوگوں کے لئے بنایا تھا۔

یویانی ثقافت کا اثر مقامی سنگتراشی پر واضح تھا (ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اسی اثر کے تحت گوتم بدھ کے پہلے مجسمے بنائے گئے)۔ مقامی اور ھیلینی روایات کے امتزاج نے مشہور گندھارا مکتب فن کو جنم دیا جو آج تک اپنی فنی یادگاروں کے لئے مشہور ہے۔ یونانی ثقافت نے فن تعمیر پر بھی اپنا اثر چھوڑا۔

برصغیر کے علم فلکیات نے یونان سے اسمائے بروج اور بعض سماوی اجسام کے نام حاصل کئے۔ اس

کے شمال مغربی علاقے میں پہلی صدیوں تک مقدونیہ کے مہینوں کے نام استعمال کئے جاتے تھے۔لسانی حلقے پر بھی ہیلینی ثقافت کا اثر پایا جاتا ہے۔سنسکرت نے یونانی زبان سے کئی الفاظ حاصل کئے، مثلاً میلا (روشنائی)، کلما (قلم)۔غالباً برصغیر نے دوات اور دھات کے قلم کا استعمال بھی یونانیوں سے سیکھا۔

سوویت مورخ ٹارن کا خیال ہے کہ یونانی ہندستانی ریاست نے (چند تبدیلیوں کے ساتھ) برصغیر کے شمال مغرب میں نظم ونسق میں سیلیوقسی نظام رائج کیا۔اور یہ نظام ساکاؤں کے قبضے تک قائم رہا۔ اس سلسلے میں یہ یاد رکھنا ضروری ہے کہ یونانی ہندستانی ریاست کے خاتمے کے بعد بھی جب ساکاؤں، پارتھیا والوں اور کوشانوں کے عہد شروع ہوئے، مقامی تہذیب کی نشوونما پر ہیلینی اثرات باقی رہے۔اور یہ دستکاری، فنون لطیفہ، ریاست اور انتظامیہ کے ڈھانچے، معاشرتی اور ثقافتی زندگی کے شعبوں میں واضح طور پر نظر آتے ہیں۔

سکے رائج کرنے کے سلسلے میں بھی ہیلینی اثرات مدت تک باقی رہے۔ ہندستانی مورخ سرکار کی رائے میں ''جو فرمانروا سکے جاری کرتے تھے داستانوں میں ان کے ناموں کا ذکر کرنے کی روایت کو اجنبی حکمرانوں نے پھیلایا۔ان میں پہلے فرمانروا ہیلینی تھے جن کی برصغیر کے شمال مغربی علاقے پر حکمرانی تھی۔

عمل اس کے برعکس بھی ہوا۔یونان نے برصغیر ہندوپاکستان کے فلسفے، ریاضی اور طب سے بہت کچھ سیکھا۔اری آنس لکھتا ہے کہ سکندر نے ''ہندستان کے ماہر ویدوں کو جمع کیا اور اپنے ساتھ رکھا،،۔ مشہور ہندستانی فلسفی کالانوس بھی اس کے درباریوں میں شامل تھا۔ ہندستان کے فلسفے اور مذہب نے یونان اور روم کے مذہبی اور فلسفیانہ نظام کو کافی متاثر کیا___ ہمارے عہد کی پہلی صدی میں نوافلاطونیت اور عرفانیت کا زور اور ان کے ذریعے قدیم عیسائیت پر اثر۔

یہ سمجھنا صحیح نہیں ہے کہ برصغیر کے شمال مغربی علاقے میں غلامی کے معاشرے کی اوپری پرت اور شہری آبادی کے ایک حصے نے ہیلینی تہذیب اس لئے اختیار کی کہ یونانیوں نے وادی سندھ کو پوری طرح اپنی نوآبادی بنالی تھی۔سوویت عالم دیاکونوف نے ہیلینیت اور مشرق قریب اور وسطی ایشیا سے اس کے تعلق کا کافی مطالعہ کیا ہے۔اور وہ اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ ہیلینی تہذیب غلامی کی تشکیل کے ارتقا کی نئی اور بلند منزل کا نظریاتی ڈھانچہ تھی۔وہ لکھتے ہیں: ''مشرق میں جہاں تک کہ بالائی ڈھانچے کا تعلق ہے غلامی

کے معاشرے کے ارتقا کی نئی منزل نے ہیلینیت کی مخصوص شکل اختیار کی،،۔ میری رائے میں دیا کونوف کے اس خیال کا اطلاق برصغیر کے شمال مغربی حصے پر بھی کیا جا سکتا ہے۔

آج کل محققین کو جو معلومات حاصل ہیں ان کی بنیاد پر کہا جا سکتا ہے کہ پہلے ہزار سالہ عہد قبل از مسیح کی آخری صدیوں اور ہمارے دور کے پہلے ہزار سالہ عہد کی ابتدا میں برصغیر کا یہ علاقہ معاشی لحاظ سے ترقی یافتہ تھا۔ ہیروڈوٹس لکھتا ہے کہ لوگ جو ہخامنشیوں کے تحت برصغیر کے اس حصے میں آباد تھے تعداد کے اعتبار سے سب سے زیادہ تھے۔ اور وہ ہخامنشیوں کو دوسروں کے مقابلے میں زیادہ خراج دیتے تھے۔ ٹکسیلا میں کھدائی کے بعد جو اشیا دریافت ہوئی ہیں ان سے معلوم ہوتا ہے کہ دستکاری اور خاص کر لوہا پگھلانے کا معیار کافی بلند تھا۔ چوتھی صدی قبل از مسیح تک تقریباً تمام اوزار اور ہتھیار لوہے کے ہوتے تھے۔ قدیم مورخوں نے بھی لکھا ہے کہ اس زمانے میں ہندستانی لوہے کے ہتھیار ــــ لوہے کی نوک کے تیر استعمال کرتے تھے☆۔

ہمارے عہد کے آغاز کی دستاویزوں سے پتہ چلتا ہے کہ پیداآور قوتوں کا ارتقا کافی بلند تھا۔ برصغیر کی شمال مغربی بندرگاہوں سے دوسرے ملکوں کو لوہا اور فولاد برآمد کیا جاتا تھا۔ اسٹرابون بیان کرتا ہے کہ اس علاقے میں کاشتکاری بڑے پیمانے پر کی جاتی تھی اور وہ ترقی یافتہ تھی۔ موسمی حالات اور کاشت کے اعلیٰ طریقوں کی بدولت سال میں دو فصلیں ہوتی تھیں۔

ترقی یافتہ کاشتکاری کا ایک اور ثبوت یہ ہے کہ براعظم کی سرزمین اور خاص کر وادی سندھ سے باربر یکم اور باری غازہ (سندھ

☆ Herodotus, <<Istoria>> VII; 65; Q. Gurti Rufi <<Historiarum Alexandri* Regis Macedonum>>, VIII, 10, 37.

کے ڈیلٹا اور خلیج کمبے کی بندرگاہیں) کے ذریعے چاول، گیہوں، تیل اور کپاس برآمد کی جاتی تھی۔

برصغیر کے شمال مغربی علاقے کی معاشی ترقی کی بلند سطح اور خاص طور پر جنس زر کے تعلقات کی بلند سطح کا اندازہ ایک اور پہلو سے بھی ہو سکتا ہے ــــ اسی علاقے میں ملک میں سب سے پہلے پانچویں صدی قبل از مسیح میں ٹھپے دار سکے جاری ہوئے۔ یہ بات پیش نظر رکھنی چاہئے کہ اس ذریعہ تبادلہ کی نوعیت بالکل آزاد تھی۔ یونانی ہندستانی ریاست نے ان کی شکل (بیضاوی یا چوکور) اختیار کی اور باختر کے ہیلینی

حکمرانوں نے ان سے سکوں کا معیار وزن حاصل کیا۔ اس کی تصدیق کہ یہ سکے چھوتھی صدی قبل از مسیح میں رائج تھے یونانی مورخ کورتسی نے کی ہے۔ اس نے لکھا ہے کہ ٹکسیلا کے بادشاہ نے سکندر کو اور تحائف کے علاوہ چاندی کے سکے بھی پیش کئے جن کی قیمت 80 ٹالینٹ ☆ تھی۔ اسی شہر کی دوسری کھدائیوں میں بڑی تعداد میں تانبے کے سکے بھی ملے ہیں۔ اس سے پتہ چلتا ہے کہ اجناس کی خوردہ فروشی تک میں زر کی گردش موجود تھی۔

چوتھی اور تیسری صدی قبل از مسیح میں برصغیر کے معاشی لحاظ سے ترقی یافتہ شمال مغربی علاقوں میں شہروں کی تعداد میں اضافے اور دستکاری، تجارت اور گردش زر میں ترقی سے ثابت ہوتا ہے کہ وہ غلامی کے طریقہ پیداوار کو فروغ دینے کے لئے ایک نیا اور عظیم قدم اٹھانے کو تیار تھے۔ پدر شاہی غلامی کے نظام کا مقصد براہ راست ذرائع زندگی کی پیداوار تھا۔ اب وہ بتدریج غلامی ایسے نظام میں تبدیل ہو رہا تھا جو معاشرتی قدر زائد پیدا کرے ☆☆۔

پہلے ہزار سالہ عہد قبل از مسیح کے آخری نصف کے وسط سے برصغیر کے شمال مغربی حصے میں ٹھوس تاریخی حالات کے سبب ہیلینیت اس عمل کی نظریاتی شکل اور جواز بن گئی۔ اس کا ایک بنیادی سبب یہ تھا کہ وادی سندھ اور مغربی ایشیا کے ملکوں

☆ یونان میں قدیم وزن کی پیمائش۔

☆☆ کارل مارکس، ''سرمایہ''۔

کے درمیان تاریخی، سیاسی اور معاشرتی رشتے تھے۔ یہ رشتے سکندر اعظم کے حملوں کے بعد مزید مضبوط ہوئے اور ہمارے عہد کے آغاز میں اپنے عروج پر پہنچے۔ سوویت عالم ایلین لکھتے ہیں کہ مقامی اشرافیہ معاشی اور روایتاً سیاسی اعتبار سے ٹکسیلا کے جنوبی ملکوں کے مقابلے میں ان ملکوں کی جانب زیادہ جھکنے لگی جو مغرب اور شمال مغرب میں واقع تھے۔ اس کا ثبوت یہ ہے کہ موریہ خاندان کے حکمرانی کے خلاف اس علاقے میں بے شمار بغاوتیں ہوئیں۔

تیسری اور پہلی صدی قبل از مسیح اور پہلی صدی عیسوی کے ہندستانی ذرائع میں یاوانا (یونا، یونانا) کا ذکر ملتا ہے۔ انہیں بعض عالموں نے غلطی سے یونانی سمجھ لیا ہے۔ یہ صحیح ہے کہ اس علاقے میں چند یونانی آباد ہو گئے تھے۔ لیکن برصغیر کے اس شمال مغربی علاقے کے زیادہ تر یاوانا وہ مقامی لوگ تھے جنھوں نے

ھیلینی تہذیب اختیار کر لی تھی۔ لفظ یاوانا کا مطلب نسلیاتی تعلق نہیں بلکہ تہذیب تھا خود اسقراط (338-436 قبل از مسیح) نے لکھا ہے کہ ان کے عہد میں لفظ ''ھیلین'' ذہن اور دانش کے جھکاؤ کا اظہار تھا نہ کہ نسلی ابتدا کا۔ اور ''ھیلینی'' کا اطلاق ان پر ہوتا تھا جو ہماری تہذیب اختیار کرتے تھے،، ☆۔

جونا گڑھ کے نزدیک ایک چٹان دریافت ہوئی ہے۔ اس پر کاٹھیاواڑ میں موریہ کے صوبے دار کے نام کندہ ہے، توشاسپ۔ یہ بلاشبہ ایرانی نام ہے (دارا اول کے باپ کا نام وش تاسپ تھا)۔ لیکن اسے یاوانا کہا گیا ہے۔ اس سے بھی ہمارے خیال کی تائید ہوتی ہے۔ ساتھ ہی ہے لی اوڈورس کے بیس نگر کے کتبے کو اس کے ثبوت میں پیش نہیں کیا جا سکتا کہ یونانیوں نے ہندستانی تہذیب اختیار کر لی تھی۔ یہ برہمی زبان میں ہے اور کرشن کے لئے وقف ہے۔ ہوسکتا ہے کہ ھیلینی تہذیب اختیار کرنے والے کسی ہندستانی نے یہ ستون تعمیر کرایا ہوا۔ سوویت عالم ٹارن نے بالکل صحیح لکھا ہے کہ یونانی ناموں کی کوئی اہمیت نہیں ہے کیوں کہ 300 سال قبل از مسیح کے بعد سے کئی ہندستانیوں نے یونانی نام اختیار کر لئے تھے۔

Isocrates, <<Panegyricus>>, 50.*'

یونانی جن کی تعداد قلیل تھی مقامی آبادی میں تیزی سے شیر وشکر ہو گئے۔ سکندر نے ملی جلی شادیوں کی جو رسم شروع کی تھی اس نے اس سلسلے میں بڑا رول ادا کیا۔ لیکن ھیلینیت آباد کاروں کے مقامی آبادی میں مکمل طور پر جذب ہونے کے بعد بھی نظریاتی بالائی ڈھانچے کی حیثیت سے جاری رہی۔ مقامی معاشرے کی چوٹی کی پرت یونانی زبان کو ترجیح دیتی تھی۔ فلواسٹریٹس کا کہنا ہے کہ ٹکسیلا کا بادشاہ فراوٹس (پہلی صدی عیسوی کے آخری نصف میں) فراٹے سے یونانی زبان بولتا تھا۔ اسٹرابون لکھتا ہے کہ ایک ہندستانی بادشاہ پورنے رومی شہنشاہ اگسٹس (27 سال قبل از مسیح سے 14 تک) کو اپنا پیغام یونانی زبان میں ارسال کیا تھا۔ بعض عالموں کا خیال ہے کہ برصغیر کے شمال مغربی حصے میں ساکا حکمرانوں کی درباری زبان یونانی تھی۔

☆☆☆

دوسری صدی قبل از مسیح کے وسط اور پہلی صدی قبل از مسیح کی ابتدا میں نئے حملہ آور آنا شروع ہوئے۔ یہ ساکا تھے۔ وہ برصغیر ہندو پاکستان کے شمال مغربی علاقے پر چھا گئے اور انہوں نے پاکستان کے لوگوں کی نسل سازی میں اہم کردار ادا کیا۔

ساکاؤں کی یہ پیش قدمی درحقیقت ان اہم تاریخی واقعات کا نتیجہ تھی جنھوں نے دوسری صدی قبل از مسیح کے آخری نصف میں وسطی ایشیا کے وسیع خطوں میں اتھل پتھل مچا ڈالی تھی۔ ساکاؤں اور مس ساگیتیوں (عظیم ساکا) ☆ کے قبائلی اتحاد پہلے ہزار سالہ عہد قبل از مسیح کے درمیان قائم ہوئے تھے۔ وہ آہستہ آہستہ جنوب کی جانب بڑھنے لگے اور پارتھیا اور یونانی باختر کی سرحدوں تک پہنچ گئے۔ ان کی پیش قدمی کی وجہ ہنوں کا دباؤ تھا جن کے حکمراں دوسری صدی قبل از مسیح کے پہلے نصف میں تیان شان کے مشرق اور شمال میں داخل ہو کر ساکاؤں اور مس ساگیتیوں پر اکثر دھاوے بول کر تباہ کاریاں مچاتے رہتے تھے۔

☆ قدیم ایرانی لفظ مس (عظیم) + قدیم ایرانی لفظ ساکا + ت، جمع کا نشان۔

ساکاؤں کی مغربی شاخ نے پارتھیا والوں کو چند شدید لڑائیوں میں شکست دے کر تیزی سے مشرقی ایران کا رخ کیا۔ انہوں نے درانگیانہ اور جنوب مغربی افغانستان پر قبضہ کرلیا۔ ان کا علاقہ ساکاستان کے نام سے مشہور ہوا، یعنی ساکاؤں کا دیس۔ یہ آج بھی موجود ہے اور صوبہ سیستان کہا جاتا ہے۔ ایک توخاری وفاق نے جس کے سردار آسیانی (چینی دستاویزوں میں ووسن) تھے یونانی باختری ریاست کو شکست دینے کے بعد اس پر قبضہ کرلیا۔ یہ علاقہ حملہ آوروں کے نام کی نسبت سے توخارستان کہا جانے لگا۔ یہاں اور شمال بعید میں اس علاقے پر جس کی آبیاری کاشکادریا اور زرافشاں کرتے تھے توخاری شہزادوں کی سربراہی میں کئی چھوٹی چھوٹی قلمروئیں قائم ہو گئیں۔

ساکا قبائل جو پامیر اور تیان شان کے ملحقہ علاقوں سے آئے تھے آسیانیوں کے دباؤ کی وجہ سے مشرق کی جانب ہٹنے پر مجبور ہو گئے اور پامیر کے ناقابل گزر دروں سے ہو کر کابل اور بالائی سندھ کی وادیوں میں داخل ہوئے۔

ساکاؤں کی پیش قدمی کے ساتھ ساتھ ان کے کچھ قبائل نئے مفتوحہ علاقوں میں آباد ہو گئے۔ اسی وجہ سے دو نسل جغرافیائی تصورات پیدا ہوئے ــــ ساکاستان اور توخارستان۔ زرخیز زرعی نخلستانوں پر آباد ہونے سے ساکاؤں کے جرگہ تعلقات تیزی کے ساتھ ٹوٹنے لگے۔ عام خانہ بدوش کھیتوں پر کاشت کرنے لگے۔ وہ جلد ہی مقامی زرعی آبادی میں گھل مل گئے اور اپنی پرانی خودکفالتی ختم کردی۔ جہاں تک ساکا قبائل کی جرگہ اشرافیہ کا تعلق ہے تو وہ بر بر ریاستوں کے حکمراں طبقے کی بالائی پرت بن گئی جو کامیاب

حملوں کے بعد میں آئی تھیں۔

اس دور کی سیاسی تاریخ کا بڑی حد تک علم نہیں ہے۔ وادی سندھ میں پہلے ساکاؤں کا سربراہوں نے مقامی یونانی ہندستان حکمرانوں کا اقتدار تسلیم کرلیا۔لیکن چند دھائیاں گزرنے کے بعد جب وہ اپنے آپ کو طاقتور محسوس کرنے لگے تو حاکم مطلق ہونے کا اعلان کردیا۔گندھارا سا کا سلطنت کا مرکز بن گیا۔ پہلی صدی قبل از مسیح کے وسط میں ساکا کے بادشاہ ماواک (ماویس، ماؤاکیس قدیم مصنفین کے مطابق، موگا ہندستانی ذرائع کی بنیاد پر) نے بطور رہائش مشرقی دارسلطنت ٹکسیلا کا انتخاب کیا۔ ماواک کے جانشینوں نے پنجاب کے ایک بڑے حصے پر اپنا اقتدار جمالیا۔

پہلی صدی قبل از مسیح میں ساکاستان کے حکمرانوں نے پارتھیاوالوں کے دباؤ کی وجہ سے پہلے جنوبی افغانستان اور شمالی بلوچستان سے ہوتے ہوئے مشرق میں وسطی سندھ تک پیش قدمی کی۔ بعد میں وہ سندھ کے نشیب میں کاٹھیاواڑ، گجرات اور شمالی اور مغربی ہندستان کے دوسرے علاقوں تک پہنچ گئے۔ ہو سکتا ہے کہ پنجاب کے ساکا بادشاہوں نے بھی جنوب اور جنوب مشرق کی جانب پیش قدمی میں حصہ لیا ہو۔لیکن سیاسی برتری ساکاؤں کی مغربی شاخ کے سرداروں کو حاصل تھی۔ ساکاستان کے فاتح یہی تھے☆۔انہوں نے کشترپ شاہی خاندان کی بنیاد ڈالی (کشہرات، کرڈمک) جس نے مغربی ہندستان پر چوتھی صدی عیسوی کے آخر تک حکمرانی کی۔لیکن شمال مغرب، پنجاب میں ساکاؤں کا اقتدار زیادہ دنوں نہیں رہا۔پہلی صدی عیسوی کی ابتداہی میں پارتھیاوالوں نے ماواک شاہی خاندان کا تختہ الٹ دیا۔

مغربی پنجاب، شمالی سندھ اور ڈھرہ جات پر سورین حکمرانوں کا عمل دخل رہا جو پارتھیائی جرگہ تھا۔ ایران کے مشرق علاقے بھی اسی کے قبضے میں تھے۔''پارتھیا کے بادشاہ جو ایک دوسرے کو ہٹاتے رہتے ہیں اس ملک پر حکومت کرتے ہیں۔''☆☆

پہلی صدی کے وسط میں ایک توخاری شہزادے کوجولا کادفس نے جس کا تعلق کوشانوں سے تھا توخاری کی منتشر سلطنت کو پھر متحد کرلیا۔ جب اس کی طاقت مستحکم ہوگئی تو اس نے اپنا اقتدار ہندوکش کے جنوب میں وادی کابل اور بالائی سندھ پر بھی جمالیا۔کوجولا کادفس کے جانشینوں میں سب سے نمایاں کنشک (تقریباً 78_120) گزرا ہے۔ وہ اپنے پیشرو کی توسیع پسند پالیسی پر عامل رہا اور برصغیر کے تمام شمال مغربی حصے (کشمیر، پنجاب، سندھ) پر قبضہ کرلیا۔ گجرات، راجھستان اور گنگا

S. Chattopadhyaya, <<The Sakas in India>>, p. 5; W.W. Tarn,<<The* Greeks in Bactria and India>>, p. 235; V. A. Smith, <<Smith, <<The Indo-Parthian Dynasties...>>, pp. 51_52.

<<PeriPlus of the Erythraean Sea>>, 38.**

جمنا کے دوابے کی ریاستوں کے والی سب کوشان بادشاہوں کے باجگزار تھے۔کوشان بادشاہوں کا موجودہ افغانستان، کاشغر، ختن، یارقند اور وسطی ایشیا کے جنوبی علاقوں پر بھی قبضہ تھا۔گندھارا جس کی سر زمین وادی کابل اور مرکزی سندھ کے درمیان واقع تھی اس وسیع سلطنت کا مرکز تھا۔شہر پروشاپور (موجودہ پشاور) کنشک کی راجدھانی تھی۔

تیسری صدی عیسوی میں کوشان سلطنت کا شیرازہ منتشر ہو گیا۔ساسانی شاہی خاندان کے ایرانی بادشاہوں نے مغربی علاقے ہڑپ کر لئے اور گپتا سلطنت کے حکمرانوں نے جنوب مشرقی حصے پر قبضہ کر لیا۔ہندوکش کے شمالی علاقوں کو وسطی ایشیا کے مختلف حکمرانوں نے ہتھیا لیا۔

پانچویں صدی عیسوی کے آخری نصف میں برصغیر کا شمال مغربی علاقہ ایک نئی بربر سلطنت کا حصہ بن گیا۔یہ تھی خیونتیوں یا ایفطلیوں کی ریاست☆۔چوتھی اور پانچویں صدی عیسوی کے اول نصف میں خیونتیوں اور ساسانیوں کے درمیان کئی تصادم ہوئے۔ان میں خیونتیوں نے شکستیں کھائیں۔اس طرح مغرب کی جانب ان کی پیش قدمی رک گئی۔پانچویں صدی کے وسط میں خیونتیوں کے سرداروں نے وادی سندھ کی ریاستوں کے خلاف جنگوں کا نیا سلسلہ شروع کر دیا۔

460 کے لگ بھگ انہوں نے گندھارا کو فتح کر لیا۔پانچویں صدی کے آخر میں ان کے ایک سربراہ تورامان نے پنجاب، سندھ، راجھستان اور گنگا جمنا کے دوآبے کو اپنے تابع بنا لیا۔شہادتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کی سلطنت کا مرکز مالوہ تھا۔مقامی

☆بازنطینی مصنفوں نے سفید ہن لکھا ہے، شام کی دستاویزوں میں عبدیل ہے، آرمینی میں ہیپ تال یا تیتا لک، چینی میں یے تھا، عربی و فارسی میں ہیطل اور ھیتال ہے۔یہ سلطنت کس علاقے پر محیط تھی یہ مسئلہ بحث طلب ہے۔بعض علما کا خیال ہے کہ یہ خوارزم کے شمال مشرق میں تھی، کچھ کی رائے ہے کہ

بدخشان میں اس کا مرکز تھا۔ ''بابر نامے'' میں اس کا علاقہ وخش دریا اور پنج دریا اور فیض آباد کے شمال میں بتایا گیا ہے۔

شہزادگان کی اپنے اپنے علاقوں میں عملداری اس وقت تک رہتی تھی جب تک وہ خیونتیوں کے سربراہ کو خراج ادا کرتے رہتے تھے۔ تورامان کے جانشین نے سکالا (پنجاب) کو دارالخلافہ بنا لیا جو موجودہ سیالکوٹ کے نزدیک تھا۔ خود سکالا کا حکمران خیونتیوں کے شاھنشاہ کا باجگزار تھا جس کا مسکن افغانستان کے شمال مشرق میں تھا۔

جب خیونتی وادی سندھ میں آئے تو ان کے چند قبائل کو سلطنت چھوڑنا پڑی۔ اس وجہ سے ان علاقوں میں نسلیاتی کردار میں تبدیلیاں ہوئیں جو خیونتیوں ایفطلیوں کے قبضے میں تھے۔ اس کی تصدیق نئے نسلی جغرافیائی ناموں سے ہوتی ہے جو اس دور میں نمودار ہوئے۔ ان میں سے بعض نام خیونتی ایفطلی سلطنت کے خاتمے کے بعد بھی استعمال ہوتے رہے اور چند تو آج تک باقی ہیں۔ ساتویں صدی تک میں جیسا کہ ''ہرش چرت'' میں جس میں ہرش خاندان کے بانی کے کارناموں کی تعریف کی گئی ہے تحریر ہے کہ مغربی پنجاب کا نام ہن دیش تھا (خیونتیوں کا)۔ قنوج کے شمال میں پہاڑی دامنوں میں ایک علاقہ ھیتال کہلاتا تھا۔

اسی طرح ایک بڑا تاریخی صوبہ اور موجودہ ہندستان کی ایک ریاست گجرات (گرجراتر، گرجراتھ بھومی، گرجراراشٹر، گرجرارمنڈل از منہ وسطی میں) خیونتی وفاق کے ایک قبیلے گرجارس کے نام پر ہے (جو شمالی ہند میں خیونتی ایفطلی سلطنت کے قیام کے وقت سے ظہور میں آیا)۔

چھٹی صدی کے وسط میں خیونتی ایفطلی سلطنت کو زوال آنے لگا۔ 533 میں شمال مغربی ہند کے خیونتی سربراہ مہرگل کو مقامی راجاؤں نے مل کر شکست دے دی۔ لیکن خیونتیوں کے اقتدار کا مکمل خاتمہ ساسانیوں اور مغربی ترکی کی خانوں کی قلمرو کے ہاتھوں ہوا۔ 567 کے قریب خیونتی سلطنت کا سورج ہمیشہ ہمیشہ کے لئے غروب ہو گیا۔ لگ بھگ پورا موجودہ افغانستان اور سندھ کے مغربی علاقے خسرو اول کی سلطنت میں شامل کر لئے گئے، یا ساسانی ایران کا حصہ بن گئے☆۔ خیونتی سلطنت کے شمالی اور شمال مشرق علاقوں

☆الطباری، ''تاریخ الرسول والملک،،، صفحات 894، 899۔

پر ترکوں نے قبضہ کر لیا۔ سندھ کے مشرقی حصے پر ہندستانی راجہ حاوی ہو گئے۔ بعض علاقے ان حکمرانوں کے ماتحت رہے جن کا تولیدی رشتہ ایفطلی قبائل کی جرگہ اشرافیہ سے تھا۔

☆☆☆

کوشان توخاری اور خیونتی ایفطلی قبائل کو نسلیاتی لحاظ سے بیان کرنا بڑا دقت طلب معاملہ ہے۔ ان کی جرگہ اشرافیہ کامیاب حملوں کے بعد عظیم کوشان ریاست اور خیونتی ایفطلی سلطنت کے حکمراں طبقے کی بالائی پرت بن گئی تھی۔

توخاری جنہوں نے یونانی باختری ریاست میں پیش قدمی کرنے کے بعد آمو دریا کے شمالی علاقوں پر قبضہ کیا وہاں کے اصلی باشندے نہیں تھے۔ دوسری صدی قبل از مسیح کی چینی تاریخی دستاویزوں میں درج ہے کہ ہنوں کے ہاتھوں شکست کھانے اور مغرب کی جانب بڑھنے سے پہلے توخاری وسطی ایشیا کے مشرقی کنارے پر آباد تھے۔ توخاریوں کو چینی زبان میں یوئے چی کہا گیا ہے☆۔ یہ یاد رکھنا ضروری ہے کہ یوئے چی لوگوں کا ایک چھوٹا سا حصہ دوسروں کے ساتھ مغرب کی جانب نہ جا سکا ہو اور اپنے پرانے رہائشی علاقوں میں ہی بسا رہا ہو۔

انیسویں صدی کے آخر اور بیسویں صدی کے شروع میں مشرقی ترکستان کی جو تحقیقات کی گئی ہیں ان سے ثابت ہوتا ہے کہ پہلے ہزار سالہ عہد قبل از مسیح کے اول نصف میں ریگستان تکلہ مکان کے شمال مشرق کی جانب نخلستانوں میں قرابتی ہند یورپی زبانیں بولنے والے آباد تھے۔ ابتداد میں ان زبانوں کو من مانی طور پر توخاری الف (جو ترفان اور قاراشار میں بولی جاتی تھیں) اور توخاری بے (جو کوچا میں رائج تھیں) میں تقسیم کر دیا گیا۔ سوویت عالم ولادیمر تسوف نے 1925 میں انہیں توخاری نہیں بلکہ کوچانو قاراشاری کہا تھا۔ یہی زیادہ قرین قیاس معلوم ہوتا ہے۔

کوچانو قاراشاری زبانوں کا ہند یورپی زبانوں کے ایک مخصوص گروہ سے تعلق تھا جواب معدوم ہیں۔ اس گروہ نے جس رقبے پر

☆ سوما چین، ''شیہہ چی،،، باب 123۔

جنم لیا اس کی سرحد بالٹک سے ملتی تھی اور یہ ایک طرف سلافی زبانوں اور دوسری جانب یونانی، آرمینی اور تھراکو فرغی زبانوں کا امتزاج تھا۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ ان قبائل کا گہوارہ جن کے جدامجد کوچانو

قاراشاری زبانیں بولتے تھے دنیپر اور اورال کے درمیان تھا۔کوچانو قاراشاری زبانیں بولنے والوں کے جدامجد کب اور کن حالات میں تکلہ مکان کے شمال میں آباد ہوئے اس کے متعلق ہمیں کوی علم نہیں ہے۔

سوویت سائنس اکادمی کے تحت شرقیات کے مطالعہ کے انسٹی ٹیوٹ لینن گراد میں دوزبانوں میں (توخاری بے اور سنسکرت) ایک دستاویز ہے۔سوویت عالم وورو بیوف دیسیا توفسکی اس کے ایک حصہ کا تجزیہ کر کے اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ توخاری بے بولنے والے اپنے آپ کو کوچاننے کہتے تھے۔وہ لکھتے ہیں:''اسی لفظ سے کوسان زبان کا نام نکلا ہے جو اویغور زبان کی دستاویزوں کے خاتموں میں بار بار ملتا ہے،،۔ساتویں اور آٹھویں صدی کی ساکا دستاویزوں میں سے ایک میں خوچا لوگوں کے بارے میں لکھا گیا ہے جن کے فوجیوں نے ختن تباہ کیا۔ان نسلیاتی اور نسلیاتی لسانی ناموں (کوچاننے،خوچا،کوسان) کو سوویت عالم وورو بیوف دیسیا توفسکی کی رائے میں کوشان نام سے مربوط کیا جا سکتا ہے جس کا علم کوشان سکوں کی داستانوں اور ہندستانی یادگاروں کے کتبوں سے ہوا ہے۔یہ بات اہم ہے کہ انہیں دستاویز کی سنسکرت زبان میں کوچاننے لفظ کی جگہ توخاریکا (توخاری) لفظ ملا۔

مجھے محسوس ہوتا ہے کہ وورو بیوف دیسیا توفسکی کی دریافت سے ہمیں پہلے ہزار سالہ دور عیسوی کے وسط میں کوچانو قاراشاری زبانیں بولنے والوں کو یوئے چی کے ایک چھوٹے سے حصے کے جانشین سمجھنے میں مدد ملتی ہے۔ان ہی کے بارے میں چینی تاریخی دستاویزوں میں تحریر ہے کہ وہ دوسروں کے ساتھ نہیں گئے اور وسطی ایشیا کے مشرق کنارے پر رہ گئے۔ جہاں تک یوئے چی کی اکثریت کا تعلق ہے جب وہ مغرب کی جانب بڑے تو انہوں نے مشرق ایرانی اور مس ساگیتی ساکا نسلیاتی لسانی عناصر کو اپنے اندر جذب کر لیا۔جب انہوں نے جنوب مغرب اور جنوب میں برصغیر ہندو پاکستان میں پیش قدمی کی تو یوئے چی یا توخاری ساکا مشرقی ایرانی اتحاد کا ایک حصہ بن چکے تھے۔جب انہوں نے باختر فتح کیا تو توخاریوں نے مقامی لوگوں کی زبان اختیار کر لی☆۔

روسی عالموں (ستال ہولشتائن، 1908،فری مان، 1952) کی تحقیقات کی بنا پر ہم اس خیال سے اتفاق کر سکتے ہیں کہ اس نسلیاتی گروہ کی زبان جو کوشان سلطنت کا حکمراں بنا___ توخاری زبان (اور کوشانوں کی)___ مشرقی ایرانی زبان تھی جس کی بعض امتیازی خصوصیات اسے ختنی، مارال باشی اور وسطی ایشیا کی دوسری ساکا بولیوں کی قریبی زبان بنا دیتی ہیں۔خاص کر کوشانی خطاب یاوگ کی مشرقی ایرانی ابتدا

پر کوئی شبہ نہیں کیا جاسکتا جس کے معنی سردار یا رہنما ہیں۔

قدیم انسانیات کے شواہد اور تاریخی ذرائع بتاتے ہیں کہ جب یوئے چی مغرب کی جانب بڑھے تو جہاں تک انسانیات کا تعلق ہے انہوں نے یورپی عناصر، اور جہاں تک زبان کا معاملہ ہے تو مشرقی ایرانی عناصر انسانیات کا تعلق ہے انہوں نے یورپی عناصر، اور جہاں تک زبان کا معاملہ ہے تو مشرقی ایرانی عناصر جذب کئے ہوں گئے۔

سوویت عالموں نے یہ ثابت کیا ہے کہ انسانیاتی لحاظ سے ساکا اور مس ساگیتی پچ میل تھے لیکن ان پر غالب یورپی بنیادی نسل تھی۔ صرف تیسری اور دوسری صدی قبل از مسیح سے وسطی ایشیا کے مشرقی علاقوں کی آبادی میں منگولیائی خط و خال نظر آنے شروع ہوئے۔ مشرقی ترکستان تک میں پہلے ہزار سالہ عہد قبل از مسیح میں آبادی جو وسطی ایشیائی (زیادہ صحیح سات دریائی) قبائل کی اولاد تھی زیادہ تر یورپی انسانیاتی قسموں پر مشتمل تھی۔

قدیم انسانیاتی شہادتوں کے علاوہ چینی تاریخی دستاویزیں بھی یہی بتاتی ہیں کہ تکلہ مکان کے شمال میں نخلستانوں میں یورپی رہا کرتے تھے۔

''کاؤ چانگ (ترفان) سے مغرب کی طرف ہر علاقے کے باشندوں کی آنکھیں بیٹھی ہوئی اور ناکیں ستواں ہیں۔،،☆☆ تکلہ مکان کے مغربی اور جنوبی نخلستانوں (کاشغر، یارقند، ختن وغیرہ) میں آباد باشندوں کا حلیہ بھی انسانیاتی لحاظ سے یورپی تھا___ لمبا قد، سرخ یا سنہری

W.B. Henning, <<The Bactrian Inscription>> pp. 48.*

☆☆ ''پئ شی،،، باب 97۔

بال، نیلی آنکھیں۔ جہاں تک التین تاغ، ختن اور یارقند کی خانہ بدوش آبادی کا تعلق ہے وہ ملی جلی نوعیت کی تھی۔ مشرقی ایرانی (ساکائی) سے تعلق رکھنے والے قبائل مغرب میں اور تبتی سے تعلق رکھنے والے مشرق میں بسے ہوئے تھے۔

تکلہ مکان کے مغربی اور جنوبی نخلستانوں میں رہنے والی آبادی مشرقی ایرانی زبان بولتی تھی جسے ادب میں ساکا ختنی یا صرف ختنی کہا گیا ہے۔ مغرب عالم کونوف کی رائے ہے کہ اس زبان اور پامیر کی مشرقی ایرانی بولیوں کی امتیازی خصوصیات مشترک ہیں۔ مقامی آبادی کی ثقافت میں قدیم ایرانی ثقافت

کے گہرے اثرات تھے اور ساتھ ہی ہندستانی خصوصیات بھی موجود تھیں ☆۔

لہذا اگر مشرق سے مغرب کی طرف پیش قدمی کی ابتدائی منزلوں میں وسطی ایشیائی توخاریوں کے جدامجد نے غیر ہند ویورپی قبائل اپنے اندر جذب کئے بھی ہوں تو وہ مشرقی ایرانی ساکائی مس ساگیتی نسلیاتی لسانی عناصر میں تیزی سے گھل مل گئے ہوں گے۔

☆☆☆

خیونتیوں اور ایفطلیوں کی نسل سازی اور نسلیاتی کردار کا مسئلہ ایسا مسئلہ نہیں ہے جس کے بارے میں ہم کہہ سکیں کہ وہ حل ہو چکا ہے۔ بہت سے عالموں کا خیال ہے کہ ایفطلی ترک تھے۔ جرمن مورخ التھیم نے اپنی تازہ ترین تصنیف میں اس خیال کی تائید میں کئی حقائق پیش کئے ہیں۔ وہ ایفطلیوں اور کداریوں کو ایک سمجھتے ہیں ☆☆۔ انہوں نے نسلیاتی اسم کداری کو اس کی ترک جڑ کدیر___ کدار (مغرب) سے ملایا ہے اور اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ کداری مغربی ہن تھے۔ ان کی رائے میں ایفطلی

☆ یہ قریب از قیاس ہے کہ مشرقی ترکستان کے جنوب مغربی حصے میں شمالی ہند کے تارکان وطن کی چھوٹی چھوٹی نوآبادیاں ہوں۔

☆☆ مصنف کی رائے میں کداریوں کی ریاست افغانستان کے شمال اور وسطی ایشیا کے جنوب میں واقع تھی___ چوتھی صدی عیسوی کے آخری نصف میں۔ کداری ریاست کا بانی کوشان خاندان کا چشم وچراغ تھا جس کی باختر (توخارستان) پر فرمانروائی تھی۔

بھی کداری تھے۔ وہ ترکی زبان بولنے والے ہن تھے، جو خیونتی قبائل کے ایرانی وفاق کے سربراہ تھے اور جنہوں نے بعد میں ایرانی زبان وتہذیب اختیار کر لی ☆۔

سوویت مورخ تولستوف کا دعوی ہے کہ ایفطلیوں کا سرچشمہ وسطی ایشیائی مقامی مس ساگیتی آلانی اور باہر سے آنے والے ہنوں کے عناصر تھے۔ فرانسیسی عالم گرش مان کا خیال ہے کہ کہ خیونتی (جن کا حکمراں خاندان ان کی رائے میں ایفطلی تھا) ان ایرانی قبائل یا قومیتوں کا اتحاد تھے جن کا رشتہ کوشانوں سے تھا۔ سوویت تاریخ داں پیگولیفسکایا بھی ایفطلیوں کو نسلیاتی لحاظ سے کوشانوں کا رشتے دار تصور کرتی ہیں۔ دوسرے مغربی مصنف مثلاً میک گورن، کونوف، اینوکی اس خیال کی تائید کرتے ہیں کہ ایفطلی مشرقی ایرانی قبائل کا وفاق تھے۔ اس کے ثبوت میں وہ ایسے حقائق پیش کرتے ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ

ایفطلی ایرانی بولتے تھے۔

اگر دستیاب شہادتوں کو ملحوظ رکھا جائے تو یہ خیال زیادہ صحیح معلوم ہوتا ہے کہ ایفطلی مشرقی ایرانی قبائل کا وفاق تھے۔ ہمارے عہد کی چوتھی صدی میں اس وفاق کا مرکز ساسانی ایران کی شمال مشرقی سرحد کے قریب ابھرا۔ اس میں شریک قبائل اس علاقے کی قدیم ساکامس ساگیتی آبادی کی اولاد تھے۔ کوشان سلطنت کے زوال اور ایفطلی وفاق کے عروج سے وسطی ایشیا کے اس حصے کے نسلیاتی جغرافیہ میں کوئی اہم تبدیلیاں نہیں ہوئیں۔ سوویت عالم تریویر لکھتی ہیں: ''علاقہ اور آبادی ویسی ہی رہی۔ جو چیز نئی تھی وہ حکمرانوں کی بالائی پرت تھی ___ یعنی خیونتیوں کا قبائلی اتحاد جو کوشانوں کی طرح بڑے مس ساگیتی اتحاد کی ایک شاخ تھے،،☆۔ تولستوف کے خیال میں خیونتی اتحاد کے شرکا قبائل

☆اس مفروضے کے بعد کئی نقاد میں۔

☆☆تریویر نے تو یہاں تک لکھا ہے کہ ایفطلیوں کے تحت جو ملک اور لوگ تھے انہیں بدستور کوشان کہا جاتا تھا۔ صرف بادشاہ، معاشرہ کے چوٹی کے لوگ اور فوج کا ایک حصہ جس کا تعلق غالبًا دوسرے قبائلی اتحاد سے تھا ایفطلی کے نام سے پکارے جاتے تھے۔

میں وسطی ایشیا کے توخاری اور نشیبی سیر دریا کے آوگاسی بھی تھے۔ اس سلسلے میں چینی تاریخی دستاویزیں بالکل واضح ہیں: ''یے تھا (ایفطلی) خاندان کا نسب وہی ہے جو عظیم یوئے چی کا تھا،،، وہ ''عظیم یوئے چی کی ایک شاخ ہے،،۔ برنشٹا کی رائے ہے کہ ایفطلی قبائلی اتحاد میں اواری بھی شامل تھے۔

خیونتی وفاق کی کسی اگلی منزل میں (غالبًا پانچویں صدی کے شروع میں) ایفطلی جرگے (یا قبیلہ) نے، بعد میں جس کے نام سے خیونتی وفاق کے تمام نسلیاتی اجزا وابستہ ہو گئے (ایسا تاریخ میں ابتدائی ریاستی تشکیلوں کے سلسلے میں اکثر ہوا ہے)، قیادت کی باگ ڈور اپنے ہاتھ میں لے لی (یا ترقی کے زینے طے کرنے لگا)۔ ایفطلی سلطنت کے خاتمے تک وفاق بالکل مشرق ایرانی رہا۔ ظاہر ہے کہ اس میں غیر ایرانی قبائل (ترکی یا اصل ترکی قبائل) بھی شامل تھے اور ہنوں☆ کے انفرادی قبائل بھی جو مغرب کی طرف گئے تھے ___ سات دریاؤں کے علاقے میں اور تیان شان کے علائی پہاڑ کے نزدیک۔

ہن قبائل خیونتی وفاق میں اس لئے آسانی سے شامل ہو گئے کہ دیگر سیاسی، معاشرتی، معاشی وجوہات کے علاوہ ایک یہ حقیقت بھی تھی کہ چوتھی اور پانچویں صدیوں میں خیونتی وفاق کے قبائل کے ایک

حصے (جو اس کے شمال مشرقی سرے پر رہتے تھے) اور مغربی ہنوں کے درمیان کوئی واضح نسلیاتی حد نہیں تھی۔ جب ہنوں نے مغرب کی طرف پیش قدمی کی تو وہ کافی نسلی اختلاط کے عمل سے گزرے۔ یہ اختلاط زیادہ تر مشرقی ترکستان کی یورپی آبادی کے ساتھ ہوا جو نسلیاتی اعتبار سے مشرقی ایرانی تھی۔ انسانیاتی لحاظ سے تالاس، تیان شان اور علائی کے ہنوں میں منگولیائی خون بہت کم تھا اور دوسری اور چوتھی صدیوں کے دوران ان کے یورپی خدوخال زیادہ ابھرے ہوئے تھے۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ مغربی ہن قبائل نے مقامی آبادی کے ایک حصے کو براہ راست جذب کر لیا تھا۔

مشرقی ایرانی، اصل ترکی اور ہن قبائل کے علاوہ خیونتی

☆ ھنوں کا نسلیاتی کردار بیان کرنا بے حد مشکل ہے۔ اس کا امکان زیادہ ہے کہ وہ ترکی زبان بولنے والے لوگ تھے۔

وفاق سے (غالباً بعد میں، پانچویں صدی عیسوی سے پہلے نہیں) ہند آریائی خانہ بدوش اور غیر خانہ بدوش قبائل بھی منسلک ہو گئے جو شمال مشرقی اور مشرقی افغانستان میں آباد تھے۔ ان میں ایک گورجر تھا جس کا ظہور برصغیر کے شمال مغربی علاقے میں پانچویں صدی کی آخر اور چھٹی صدی کے شروع میں خیونتی فتوحات کے ساتھ ساتھ ہوا۔

یہاں لفظ خیونتی کے نسلیاتی نام کی ابتدا خیونتیوں، ایفطلیوں اور سفید ہنوں کے نسلیاتی اسموں کے درمیان تعلق سے بحث کرنا مناسب ہوگا۔ اور یہ آج ہی نہیں بلکہ مدت سے بحث کا موضوع بنا ہوا ہے۔

ہمیں ''اویستا'' تک میں خیونتیوں (حیااون) کا حوالہ ملتا ہے۔ پارتھی عہد کی وسطی فارسی کی ادبی یادگاروں میں یہ نسلیاتی نام ''حیون'' کی شکل میں پایا جاتا ہے: ''بنداہشن'' (عناصر کی تخلیق)، یہ کتاب کائنات کی تخلیق کے بارے میں ہے، اور ''یات گار زریران'' (داستان زریر) ایران اور خیونتیوں کے درمیان جنگ کے متعلق ہے۔

خیونتی کے نسلیاتی اسم کا اشتقاق اور ابتدا ابھی تک غیر واضح ہیں۔ بعض علما نے اس کی ابتدا ٹوٹمی نام کیون (بیسار خور) میں ڈھونڈی ہے۔ جہاں تک ایفطلی (ھیفطالی) نسلیاتی اسم کا تعلق ہے تو اشتقاق کے لحاظ سے اس کی نسبت فارسی لفظ ہپت (ہفت، سات) سے ہے۔ ممکن ہے کہ یہ نسلیاتی اسم خیونتی ایفطلی حکمراں (غالباً خاندانی تحت) کے نام افطہالان (افتھالن) سے وابستہ ہو۔ یہ نام بعض دستاویزوں

میں ملتا ہے☆۔

جہاں تک ہن نام کا تعلق ہے اس کا ذکر بھی مغربی (بازنطینی اور شامی) ذرائع میں موجود ہے، ایفطلیوں کے تعلق سے۔بعض عالموں کا خیال ہے کہ اس کا سبب نسلیاتی اسمون حیون اور ہن کی صوتی ساخت کی یکسانیت ہے۔

سوویت عالمہ تریویر کا خیال ہے کہ تاریخی دستاویزیں لکھنے والوں

☆ بازنطینی اسقف فوٹیس کے منتخبات (نویں صدی) میں صاف صاف لکھا ہے کہ (یفطلی) لوگوں نے اپنا نام بادشاہ افثھال سے حاصل کیا جو پانچویں صدی میں حکمراں تھا۔

نے ہر اس ایشیائی خانہ بدوش قبیلے کو ہن کہہ دیا جو انہیں اس سے ملتا جلتا نظر آیا۔بعض میں یہی حشر اصطلاح ترک کا ہوا جو اندھادھند ہر ایرے غیرے قبیلے یا قومیت کے لئے استعمال کی گئی۔بہت ممکن ہے کہ بازنطینی اور شامی مورخوں نے سفید ہن کا لفظی ترجمہ کر کے غلطی کی ہو۔ترکی میں ایک معاشرتی زمرہ ''سفید ہڈی'' ہے (یہاں ''ہڈی'' کا مطلب جرگہ،نسل ہے)۔ہوسکتا ہے کہ اس معاشرتی زمرے کی ابتدا اگوت بیاہ کی تقسیم سے ہوئی ہو جس کا تعلق جرگہ تنظیم سے تھا۔جب لوگوں نے تاریخی دستاویزیں لکھیں تو ان میں اسے نسلیاتی زمرے میں شامل کر دیا گیا۔

خیونتیوں کی انسانیاتی خصوصیات کی وجہ سے بھی نام سفید ہن دیا جاسکتا تھا۔شاید تاریخ دستاویزوں کے مصنف اس نسلیاتی اسم کے ذریعے یہ بتانا چاہتے ہوں کہ خیونتی سفید فام اور سنہرے بالوں والی نسلیاتی تشکیل تھے جو کالی جلد کے خانہ بدوش اور نیم خانہ بدوش لوگوں سے مختلف تھے (مثلاً دیگر دستاویزوں میں ہمیں ''سفید حبشی'' کے الفاظ ملتے ہیں)۔اس سلسلے میں یہ یاد رکھنے کی ضرورت ہے کہ بازنطینی اور شامی مورخ سفید ہنوں ___ خیونتی ایفطلی ___ کو ہن بتانے کے بجائے،جنھوں نے مشرقی اور مرکزی یورپ کو روند ڈالا تھا،دونوں کے انسانیاتی اور ثقافتی نسلیاتی جغرافیائی امتیازات پر زور دینا چاہتے تھے۔

ساکا توخاری اور ایفطلی وفاقوں کے قبائل نے جو وادی سندھ میں آباد ہوئے برصغیر ہندوپاکستان کے شمال مغرب کے عوام کی نسل سازی پر بہت گہرا اثر ڈالا۔

نوواردوں کو مقامی معاشرتی نظام اختیار کرنے میں زیادہ مدت نہیں لگی۔کئی ہندستانی ریاستوں میں ساکا توخاری اور خیونتی ایفطلی قبائل کی جرگہ اشرافیہ غالب طبقے کی حکمراں پرت بن گئی۔جہاں تک

عام لوگوں کا تعلق تھا تو وہ شہروں میں یا مقبوضہ آراضیوں پر آباد ہو گئے اور بتدریج مقامی کاشتکاروں اور دستکاروں میں گھل مل کر ان کا ہی ایک حصہ بن گئے۔ بعض عالموں کی رائے ہے کہ اسی عمل کے دوران جاٹوں، اہیروں اور دوسری ذاتوں کی تشکیل ہوئی ☆۔ بیرونی عناصر نے ''ہندستانیت'' اپنانے کے ساتھ ساتھ مقامی لوگوں کو اپنی تہذیب اور عقائد کے بعض اجزا بھی دئے۔ اس کا بخوبی ثبوت بیانیہ ادب، آثار قدیمہ کے شواہد اور سکوں سے ملتا ہے: کوشان بادشاہوں نے پہلی اور دوسری صدیوں میں جو سکے جاری کئے ان پر بدمت اور ہندو مذہب، ھیلینی اور مشرقی ایرانی عقائد دونوں کی علامتیں ہیں۔ مقامی ہندستانی اور یونانی عقائد اور کوشانوں کے لائے ہوئے وسطی ایشیائی زرتشتی عقائد کا امتزاج ہوا۔ اور یہی امتزاج بعد میں مہایان (مہا چکر) کی بنیاد بنا جو بدھ مت کا ایک شمالی فرقہ تھا۔ ہم پہلے بیان کر چکے ہیں کہ گندھارا فن مقامی ہندستانی اور بیرونی ھیلینی اور وسطی ایشیائی عناصر کا امتزاج تھا۔ اس فن نے مزید ترقی کی۔ اس کے اثرات کا ثبوت ہمیں تیسری اور چوتھی صدیوں کے بیگھ رام اور ٹکسیلا کے دستکاروں کی مصنوعات سے ملتا ہے۔ بحیرہ اسود اور بحیرہ کیسپین کے قریب استیپی میدانوں میں سیتھیا اور سرماتیا کے مقبروں سے جو زیورات برآمد ہوئے ہیں ان کی کئی خصوصیات بیگھ رام اور ٹکسیلا کی مصنوعات میں بھی موجود ہیں۔

تاریخی ذرائع سے معلوم ہوتا ہے کہ اس زمانے میں برصغیر کے شمال مغربی علاقے میں کئی چھوٹی بڑی ریاستوں کے حکمرانوں کا تولیدی رشتہ ساکا توخاری اور خیونتی قبائل کی اشرافیہ سے تھا۔ پانچویں اور چھٹی صدی میں مائت راک خاندان نے کاٹھیاواڑ سے گپتاؤں کو ہٹا کر اپنی سلطنت کی داغ بیل ڈالی جس کی راجدھانی ولبھی تھی۔ غالبًا اس خاندان کا سرچشمہ مشرقی ایرانی تھا۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ گورجر پراتی ھار خاندان (آٹھویں اور نویں صدی) جس کی پہلے مارواڑ اور راجھستان پر حکومت تھی اور پھر بعد جس نے تقریباً تمام شمالی ہند پر قبضہ کر لیا، گجرات میں آنند پور کا گوہی لوت خاندان اور ازمنہ وسطی میں پنجاب اور راجھستان میں بکھرے ہوئے شاہی خاندان سب کے سب گورجروں کے رشتے دار تھے۔ یہ بھی ممکن ہے کہ دکن میں چالوکیہ خاندان کا بھی گورجروں سے رشتہ ہو۔ اکثر راجپوت شاہی خاندان جو

V.A. Smith, <<The Oxford Hkistory of India>>, pp. 172_173.*

پراتی ہار کی طرح اپنے آپ کو سورج کی اولاد (سوریہ ونشی، سورج بنسی) یا اگنی کول کی طرح خود کو آگ کی

اولاد سمجھتے تھے سورج کی پرستش کیا کرتے تھے۔ انہیں مشرقی ایرانی توخاریوں اور خیونتیوں کی اولاد کہا جا سکتا ہے۔ اس سلسلے میں یہ مدنظر رکھنا ضروری ہے کہ 36 راجپوت جرگوں میں سے ایک نے ابھی تک ہن نام محفوظ رکھا ہے۔ اس سے اس کا خیونتیوں سے تولیدی رشتہ ظاہر ہوتا ہے☆۔

چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ کاٹھیاواڑ، گجرات اور راجھستان کے علاقوں میں ساکا توخاری اور خیونتی قبائل نے نسلیاتی عناصر کے اس حصے کی تشکیل پر بڑا اثر ڈالا جس سے موجودہ گجراتیوں اور راجھستانیوں کا ارتقا ہوا ہے۔ برصغیر کے شمال میں پہاڑی علاقوں کے دامنوں میں بھی قومیتوں کی تشکیل میں ان قبائل کا بڑا ہاتھ ہے۔ اور یہ اثر بار بار ہوا ہے۔ پہلے کوشان سلطنت قائم ہونے کے وقت ساکا توخاری قبائل اس علاقے میں داخل ہوئے۔ پھر پہلے ہزار سالہ عہد عیسوی کے وسط میں خیونتی ایفطلی آئے۔ اور پھر اس عہد کے آخر میں جنوب سے آ کر مختلف گروہ راجھستان میں آباد ہوئے۔ ان میں گورجر بھی شامل تھے جو اس وقت تک مقامی آبادی میں کافی جذب ہو گئے تھے اور ایسی بولیاں بولتے تھے جن سے موجودہ راجھستانی زبان پروان چڑھی ہے☆☆۔ پہاڑی علاقوں اور دامنوں میں نو وارد لوگ مقامی ہند آریائی اور داردی قبائل کے ساتھ شیر و شکر ہو گئے۔ ان کے ایسے قبائل اور قومیتیں بن گئیں جو مغربی اور مرکزی پہاڑی زبانیں بولتی تھیں۔

ایفطلیوں کی فتوحات کی وجہ سے ہندستان اور ایران کے کئی نسلیاتی گروہوں کو ترک وطن کرنا پڑا۔ فاتحوں کے دباؤ سے ملاووں (قدیم مصنفین کی زبان میں ملوئی) کا ایک حصہ مرکزی پنجاب کو چھوڑ کر موجودہ راجھستان کے شمال مشرقی علاقوں

H.C. Ray, <<The Dynastic History of Northern India>>, Vol. I, pp.*

74, 569__610; V.A. Smith, <<The Oxford History of India>>, pp. 164, 172__173.

☆☆اس قبیلے کی کچھ اولاد نیم خانہ بدوش اور کاشتکار تھی جو اب پاکستان میں رہتی ہے اور گوجری بولتی ہے۔

میں آباد ہو گیا۔ غالباً اسی نسلیاتی نام کے سبب اس علاقے کا نام مالوہ پڑا۔ ملاووں کے جانشینوں نے جو

وسطی ہند میں بس گئے تھے راجھستانی جاگیردارانہ قومیت کی نسلیاتی ساخت میں اہم رول ادا کیا۔

اسی طرح جب شمالی ایران پر ایفطلیوں کا دباؤ پڑا تو شمال مغربی ایران کے کچھ قبائل بحیرہ کیسپین کے جنوبی ساحل کی بادیہ پیمائی کرتے ہوئے جنوب مشرق کی سمت میں کرمان کی جانب بڑے☆۔ ان قبائل کا اتحاد ہی وہ بنیاد بنا جس پر بلوچی قومیت نے دوسرے ہزار سالہ عہد عیسوی کے آخری نصف میں تشکیل پانا شروع کی۔

ساکا تو خاری اور خیونتی ایفطلی قبائل نے پاکستان میں پشتونوں اور ہند آریائی لوگوں کی نسلیاتی ساخت پر جو اثر ڈالا اسے ہم آئندہ بیان کریں گے۔

M.Longworth Dames, <<The Baloch Race>>, p. 29.*

تیسرا باب

جاگیردعہد میں نسلیاتی عوام اوجاگیری قومیتوں کی تشکیل

برصغیر ہندو پاکستان کی تاریخ میں چوتھی اور چھٹی صدیاں ایسی گزری ہیں جب سماج کے معاشرتی اور معاشی ارتقا میں بعض بنیادی تبدیلیاں ہوئیں: اس دور میں غلامی نظام کے تعلقات منتشر ہوئے اور بتدریج جاگیرداری کے عناصر نے فروغ پایا۔ گپتا سلطنت کے خاتمے اور ایفطلیوں کی آمد سے برصغیر کے شمالی حصے پر اور افغانستان کے مشرقی اور جنوبی علاقے میں بے شمار چھوٹی چھوٹی ریاستیں نمودار ہوگئیں جو آپس میں جنگ وجدال کیا کرتی تھیں☆۔ ان میں سب سے زیادہ ترقی یافتہ ریاستوں کے سردار آہستہ آہستہ جاگیری قسم کے زمیندار بن گئے۔ ہندو مندر اور بدھ مت کی خانقاہیں بڑی بڑی آراضیات کی مالک ہو گئیں۔ پھر عام لوگوں میں جو مراعات یافتہ تھے چھوٹے جاگیری زمیندار بن گئے۔ جیسے جیسے پیدآور قوتوں نے نشو ونما پائی، سب سے زیادہ ترقی یافتہ علاقوں میں بڑے بڑے کنبے جن کی معیشت کی شکلیں

☆ چینی سیاح سیوآن تسانگ (ساتویں صدی کے پہلے نصف میں) نے خود اپنی آنکھوں سے

دیکھا کہ ٹکسیلا اور لمپا کا (لغ مان) میں کوئی مرکزی حکومت نہیں تھی، شاہی خاندان زوال پذیر تھے اور مقامی حکام ''ایک دوسرے کا مقابلہ کرتے اور کسی کی فرقیت کو تسلیم کئے بغیر اقتدار کے لئے آپس میں لڑتے رہتے تھے،، (سیو آن تسانگ، سی۔یو۔کی، جلد 2، صفحات 144، 179)۔

اجتماعی تھیں رفتہ رفتہ ٹوٹ گئے۔ ان کی جگہ انفرادی خاندانوں نے لے لی جن میں سے ہر ایک گھریلو انتظام میں اپنے ہی ذرائع کا سہارا لیتا تھا۔

زمین کی جاگیردارانہ ملکیت کے ارتقا کا ثبوت ہمیں کتبوں سے ملتا ہے۔ عملاً زمین کی ملکیت کی کئی قسمیں تھیں۔ پرانے زمانوں کی طرح ذرائع پیداوار (زمین اور پانی) زیادہ تر ریاست کی ملکیت تھے۔ اس کے پہلو بہ پہلو زمین کی مشترکہ ملکیت بھی موجود تھی جو باقاعدہ تقسیم کی جاتی تھی۔ زمین کے قطعے انفرادی کسان خاندان کو الاٹ کردئے جاتے تھے۔ محدود دستیاب معلومات کی بنا پر کہا جاسکتا ہے کہ عام کسان مشترکہ زمین کے الاٹ کئے ہوئے اپنے قطعے کو نہیں بیچ سکتا تھا۔

جاگیریں عطا کرنے کا رواج پانچویں صدی کی چوتھی دھائی سے شروع ہوا۔ اس کا ثبوت ان دستاویزوں سے ملتا ہے جو بنگال میں پائی گئی ہیں۔ سوویت ماہر شرقیات انتونووا نے لکھا ہے کہ ''بتدریج غیر مزروعہ کھیتوں کے بجائے آباد گاؤں عطا کئے گئے... کسانوں پر جاگیری واجب ادا اور محصولات کی فہرست بڑھائی گئی... استثنا منظور کئے گئے،،۔ امکان اس کا ہے کہ ملک کی معیشت ایک حد تک فطری ہو رہی ہو۔ چنانچہ پانچویں اور چھٹی صدیوں میں کئی قدیم شہروں پر زوال آیا۔ جیسا کہ مارکس اور اینگلس نے لکھا ہے کہ گاؤں ازمنہ وسطی کا ابتدائی نقطہ اسی طرح تھا جیسا کہ کلاسیکی قدیم زمانے میں شہر اور اس کے مضافات ☆۔ لیکن شہری زندگی کا زوال طویل نہیں رہا۔

اس قسم کے عوامل صرف گنگا اور برھمپترا کے نشیبی میدانوں کے لئے ہی مخصوص نہ تھے۔ سندھ، جمنا، گنگا کی وادیاں اور کئی ساحلی علاقے بھی ان عوامل سے گزرے۔

نظریاتی اور ثقافتی میدانوں میں بھی چوتھی اور چھٹی صدیوں میں اہم تبدیلیاں رونما ہوئیں۔ جاگیردارانہ معاشرے کے نظریے نے ہندومت کی شکل اختیار کی اور اس نے عام طور پر بدھ مذہب کی جگہ لے لی۔ یہی وہ زمانہ تھا جب سنسکرت نے ریاست اور معاشرتی زندگی کے ہر

☆ مارکس اور اینگلس، ''جرمن نظریہ''۔

پہلو میں اپنے پیر جمائے۔ چھٹی صدی میں برصغیر کے شمال مغربی حصے میں برہمی رسم الخط نے آہستہ آہستہ خاروشتھی کو ختم کر دیا۔

نئے جاگیردارانہ تعلقات کے ساتھ ساتھ جاگیری زمیداروں اور حقوق سے محروم کسانوں کے طبقات نے تشکیل پائی۔ اسی دور میں برصغیر کی ایک امتیازی خصوصیت یہ تھی کہ ذات پات کا نظام جسے پچھلی معاشرتی معاشی تشکیل نے جنم دیا تھا مزید مضبوط ہوا اور جاگیری عہد میں اسے نئے معنی پہنائے گئے۔ محنت کی تقسیم کے موروثی نظام کی بنیاد پر ذاتوں کا سلسلہ مدارج کھڑا کیا گیا۔ اس سلسلہ مدارج کی سب سے نچلی سیڑھی عام نوکر چاکر تھے۔

آبادی کے حقوق سے محروم گروہ جن طریقوں اور ذرائع سے استحصال کئے جاتے تھے ان سے جاگیردارانہ طریقہ پیداوار کی بنیادی خصوصیات زیادہ واضح طور پر ظاہر ہوتی ہیں۔ ساتویں اور آٹھویں صدیوں کے دوران زیادہ تر برصغیر میں یہی طریقہ پیداوار رائج تھا۔ صرف چند علاقوں میں پوری تشکیلوں میں جاگیرداری کی ایک ممتاز خصوصیت یہ تھی کہ زمین کی مشترکہ ملکیت کی بنیاد پر استوار زرعی آبادی برقرار رکھی جاتی تھی اور جاگیردارانہ دور میں کاشتکاری اور کاریگری باہم وابستہ تھے۔

پہلے ہزار سالہ عہد عیسویں کے وسط اور آخری نصف کے شروع میں نہ صرف معاشرتی معاشی تبدیلیاں ہوئیں بلکہ کچھ نسلیاتی عوامل بھی ہوئے۔ جب جاگیردارانہ تعلقات پختہ ہوئے اور انہوں نے فروغ پایا تو جاگیردارانہ قومیتیں وجود میں آئیں۔ برصغیر کے مختلف علاقوں میں معاشرتی معاشی ترقی کی سطحیں مختلف تھیں۔ اس کا سبب ان کے تاریخی ارتقا کی خصوصیات تھیں۔ چنانچہ مختلف لوگ مختلف عوامل سے گزرے اور انہوں نے اپنے اپنے مخصوص امتیازات کا اظہار کیا۔

پہلے ہزار سالہ عہد عیسوی کے وسط اور آخری نصف کے شروع میں برصغیر کی نسلیاتی تاریخ میں ایک نیا مظہر رونما ہوا۔ چھٹی اور ساتویں صدی کی یادگاروں میں ہندستان کے ''مختلف علاقوں'' کا ذکر ملتا ہے جن کے باشندے زبان، لباس اور رسوم کے لحاظ سے ایک دوسرے سے مختلف تھے☆۔ چینی سیاسیو آن تسانگ نے بھی کئی ہندستانی قومیتوں کے متعلق لکھا ہے۔ ''کووالا یا مالکتھا'' (آٹھویں صدی کے آخر میں) میں درج ہے کہ برصغیر میں 18 بڑی قومیتیں ہیں۔ ان میں سے ۱۶ کا انسانیاتی کردار بیان کیا گیا ہے، ان کے نفسیاتی مزاج پر روشنی ڈالی گئی ہے اور ان کی زبانوں کے نمونے پیش کئے گئے ہیں۔

برصغیر کی تاریخ میں ان بڑی جاگیردارانہ قومیتوں کے تشکیل آٹھویں اورنویں صدیوں میں ہوگئی تھی جن سے ہم بعد کے ادوار میں دوچار ہوئے۔اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ وہ جامد وساکت رہیں۔ان میں مسلسل تبدیلیاں ہوتی رہیں ___ گھرانے کے طریقے، ثقافتی نمونے، مذہبی تصورات، زبان، یہاں تک کہ انسانیاتی خصوصیات سب بدلتے رہے۔ جب بڑی قومیتوں نے چھوٹے نسلیاتی گروہوں کو جذب کر کے اپنے علاقے کی سرحدیں بڑھائیں تو اس کا بھی ان کے نسلیاتی کردار پر اثر ہوا۔

☆☆☆

ایفطلی وفاق کے خاتمے کے بعد برصغیر کے شمال مغربی حصے میں کئی چھوٹی چھوٹی ریاستیں قائم ہو گئیں۔ پشاور وادی اور سندھ وچناب کے درمیان علاقے (قدیم گندھارا کا علاقہ) میں شاہی سرداروں کی حکومتیں تھیں۔ان کے خاندانی ناموں سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ کوشانوں کی اولاد تھے۔ان کا دعویٰ بھی یہی تھا۔آٹھویں اور دسویں صدیوں میں شاہی ریاست کا دارالخلافہ ادبھند پور تھا، اٹک کے پڑوس میں موجود قصبے اند کے نزدیک (مسلم مورخین نے اسے وٹی ھاند یاوئی ہند لکھا ہے) ☆☆۔

ایک آزاد ریاست وادی کشمیر میں بھی ابھر آئی جہاں ساتویں صدی کے شروع سے کارکوتا شاہی خاندان نے اپنے پیر جمالئے تھے۔للت دت اس خاندان کا ایک ممتاز حکمراں گزرا ہے (60_724) اس نے شمالی پنجاب کے ایک حصے پر بھی اپنا عمل دخل کرلیا۔مشرقی اور جنوبی پنجاب اور سندھ کی سرزمین پر کئی چھوٹی عمل داریاں تھیں جو کبھی کبھی زیادہ طاقتور شہزادوں کا اقتدار تسلیم کرلیتی تھیں۔

☆ وشاکھادتا ''مدراراکشاس،،، جلد 1 صفحہ 8۔

☆☆ ''حدودالعالم''۔

برصغیر کے شمال مغرب میں بڑے شہر سیاست اور انتظامیے کے مرکز ہی نہیں بلکہ ثقافت اور معیشت کے قلب بھی تھے۔ ادبھند پور تجارتی گزرگاہ کی ایک زبردست منزل تھی۔ یہاں ہندستان کے مختلف علاقوں سے خوشبوئیں، زیورات اور قیمتی پارچے جات آیا کرتے تھے ☆۔ جالندھر مختلف قسم کا سوتی کپڑا تیار کرنے کیلئے مشہور تھا۔ ملتان اور لاہور بھی دولت مند تجارتی شہر تھے اور بڑے مذہبی مرکز۔ گمنام مصنف کی بارھویں صدی کی ایک آرمینی دستاویز میں لاہور کو ''ایک بڑا اور بے حد دولت مند شہر'' بتایا گیا ہے۔ پھر لکھا ہے کہ ''اس شہر میں ہر چیز کی فراوانی ہے۔ ملک کی ہر اچھی اور مفید چیز اس شہر میں مل سکتی ہے، کیونکہ

تاجر انہیں یہاں لاتے ہیں اور فروخت کرتے ہیں۔ اور تاجروں کو بھی یہاں ان کی ضرورت کی تمام اشیا مل جاتی ہیں،،۔ یہاں یہ بات پیش نظر رکھنے کی ضرورت ہے کہ بڑے بڑے شہر صرف بیرونی تجارت گزرگاہ کے مرکز ہی نہیں بلکہ اندرونی تجارت کے بھی مرکز تھے۔

سندھ کی بندرگاہوں نے عربوں کے آنے سے پہلے اپنی موزوں جغرافیائی حالت کی وجہ سے خود سندھ کی تیار کی ہوئی اشیا کی برآمد میں اور مغربی ممالک (ایران، جنوبی عرب اور حبش) کے ساتھ اور سندھ ڈیلٹا کے مشرق میں بھی تجارتی تعلقات قائم کرنے میں اہم حصہ لیا۔ ہمارے عہد کی ابتدائی صدیوں میں جب اسلام سندھ پہنچا تو یہ رول مزید بڑھ گیا۔

☆ ''حدود العالم''۔

''حدود العالم'' کا مصنف لکھتا ہے کہ سندھ میں تاجروں کی آبادی بہت تھی اور ساحلی علاقے کے کئی باشندے بحری تجارت کیا کرتے تھے۔ دریائے سندھ کے نشیبی علاقے میں دائبیل اور منصورہ تجارت کے اہم مرکز تھے☆۔

ہمارے عہد کی ابتدائی صدیوں میں ٹھٹھ بھی ملک کا ایک اہم معاشی اور سیاسی مرکز بن گیا۔ بعض عالموں کی رائے ہے کہ شہر کی آبادی اس کے شباب کے زمانے میں 2 لاکھ 80 ہزار تھی☆☆۔ بعد میں جب جاگیرداری نظام پختہ ہو گیا تب بھی سندھ کا ڈیلٹا اور اس کے پڑوسی علاقے سندھ کے سب سے زیادہ ترقی یافتہ خطے رہے۔ چودھویں صدی کے آخری نصف کے ذرائع سے معلوم ہوتا ہے کہ ٹھٹھ کے علاقے میں آبادی گھنی تھی، زمین کی کاشت اچھی ہوتی تھی اور سال میں دو فصلیں ہوا کرتی تھیں۔ برصغیر کے شمال مغربی حصے کے معاشرتی اور معاشی لحاظ سے سب سے زیادہ ترقی یافتہ یہ علاقے ہی پہلے ہزار سالہ عہد عیسوی کے آخری نصف میں دو بڑی جاگیردارانہ قومیتوں کے نسلیاتی استحکام کی سرزمین بنے: پنجابی اور سندھی۔

☆☆☆

پنجابیوں کا نسلیاتی نام پنج آب سے ماخوذ ہے، یعنی پانچ دریاؤں کا ملک۔ اس خطے کے لوگوں کے پنجابی جاگیرداری قومیت میں مستحکم ہونے سے بہت پہلے اس کے علاقائی اتحاد کا تصور تشکیل پا چکا تھا۔ ہمارے عہد کی ابتدائی صدیوں ہی میں اسے پنج ندا کہا جانے لگا تھا۔ بعد میں بھی ان ہی معنوں میں لفظ

پنجاب استعمال کیا گیا☆☆☆۔

پنجابیوں کی نسل سازی کی ساختی بنیاد ہند آریائی قومیتوں اور قبائل پر مشتمل ہے جن کی تشکیل پہلے ہزار سالہ عہد قبل از مسیح میں

☆ دائبیل ٹھٹہ کے جنوب مغرب میں 35 کلومیٹر اور کراچی کے جنوب مشرق میں 80 کلومیٹر کے فاصلے پر ہے۔ اور منصورہ حیدر آباد کے شمال مشرق میں 80 کلومیٹر دور۔

R.F. Burton, <<Sindh and the Races...>>, p. 5.**

D.C.Sirkar, <<Studies in the Geography of Ancient and Medieval*** India>>, p. 185

ہوئی تھی۔ اس سے ہم پہلے بحث کر چکے ہیں۔ ان میں سب سے بڑے مادرا (مادرکا)، جارتیکا اور کایا تھے۔ ان قومیتوں کے نسلیاتی اتحاد کا واضح ثبوت ان عجیب وغریب نسبی شجروں سے ملتا ہے جنہوں نے اپنے موروثی اسم مشترکہ جدامجد سے حاصل کئے تھے☆۔ ان قومیتوں کی رشتے دار ہند آریائی آبادی سندھ کے مغربی کنارے پر، ڈھرہ جات اور کابل کے نشیب میں تھی۔

ساتویں صدی میں پنجاب بنی امیہ کے خلفا کے صوبے داروں کی توجہ کا مرکز بننے لگا جن کا اقتدار ایران میں تھا۔ 664 میں عرب ہرات کو پار کر کے مشرقی افغانستان کے پہاڑی دورں سے ہوتے ہوئے سندھ سے ملتان کے جنوب تک پہنچے۔ لیکن انہیں پسپا ہونا پڑا۔ اسی طرح آٹھویں اور نویں صدیوں میں سندھ کے عرب حکمرانوں کی فوجی مہمیں بھی کامیاب نہیں ہوئیں۔ پنجاب کے لوگوں نے انہیں پسپا کر دیا اور وہ ملتان سے آگے نہیں بڑھ سکے۔

پھر غزنی کے حکمرانوں نے حملے شروع کئے۔ غزنوی سلطنت دسویں صدی کے آخری نصف میں برصغیر کی شمال مغربی سرحدوں پر قائم ہوئی۔ برصغیر کے شمال مغربی حصے کی چھوٹی چھوٹی ریاستوں میں تقسیم اور باہمی ہلاکت آمیز جنگوں نے غزنوی فوجوں کو فتح حاصل کرنے میں مدد دی۔ چنانچہ پنجاب غزنوی سلطنت کا ایک صوبہ بن گیا۔ غزنوی حکمرانوں نے 1161 کے بعد لاہور کو اپنا دارالخلافہ بنالیا۔ جب 1186 میں غزنوی خاندان نے غوریوں کے ہاتھوں شکست کھائی تو پنجاب غوری سلطنت کا حصہ بن گیا۔ بعد میں غوریوں نے مشرق میں گنگا کے نشیبی علاقے تک اور جنوب میں وندھیا چل پہاڑ تک اپنی قلمرو وسیع

کر لی۔

اس طرح برصغیر کے شمالی حصے پر مسلم فوجی جاگیردارانہ اشرافیہ کا قبضہ ہوگیا۔ مقامی ہندو حکمرانوں کی جاگیریں جن میں زیادہ تر درمیانی یا نچلے درجے کے راجے تھے، صرف پہاڑی علاقوں اور غوریوں کی قائم کی ہوئی دھلی سلطنت کے آس پاس باقی رہیں۔

☆ مادراؤں کے متعلق ہم پہلے لکھ چکے ہیں۔ کے کا یا بیاس اور چناب کے درمیان آباد تھے اور جارتیکا جنوبی پنجاب میں بسے ہوئے تھے۔ آمد سے لے کر 18 ویں صدی کی ساتویں دھائی میں سکھوں کی ریاست کے قیام تک ایک اہم تبدیلی ہوئی۔ یہ تھا وسیع پیمانے پر اسلام کا پھیلنا۔

ازمنہ وسطی کی ابتدا میں پنجابی جاگیردارانہ قومیت کے نسلیاتی استحکام کے خاص خطے مرکزی اور مشرقی پنجاب جس کا لاہور اول درجے کا انتظامی، سیاسی اور معاشی مرکز تھا، جنوب مغربی پنجاب جس کا ملتان اسی درجے کا مرکز تھا اور سندھ جھیلم کے دوآبے کے شمالی حصے پر مشتمل شمال مغربی پنجاب تھے۔

غالباً قدیم ترین آبادی جو جاگیردارانہ قومیت کی شکل میں مستحکم ہوئی مرکزی اور مشرقی علاقوں (تک کا ملک) کے ہندآریاؤں پر مشتمل تھی جنھوں نے اپنے اندران خیونتی ایفطلی قبائل کو جذب کر لیا تھا جو پہلے ہزار سالہ عہد عیسوی کے وسط میں افغانستان کے شمال مشرقی علاقے سے آئے تھے۔ ابتدائی منزلوں میں پنجابیوں کی نسل سازی میں گورجر قبائل کا حصہ زیادہ تھا ___ اس کا ثبوت لسانی شواہد، مقامیاتی ناموں اور نسلیاتی اسموں (genenymy) سے ملتا ہے ☆۔ پنجابی قومیت کی ساخت میں وسیع نسلیاتی اور انسانیاتی اقسام شامل تھیں۔ چنانچہ ''حدود العالم'' کے مصنف نے راوی چناب کے دوآبے کی آبادی کو ''سیاہ وسفید'' کہا ہے۔ لیکن آٹھویں صدی تک کے عالم مرکزی اور مشرقی پنجاب کی آبادی کو ایک نسلیاتی متحدہ سالم خیال کرتے تھے۔

ہم نے اوپر جین دکشنی یا چیہنا کو نقل کیا ہے۔ اس میں لکھا ہے کہ پنجابیوں کے کردار کی ممتاز خصوصیات ''اخلاق، دریادلی، تحمل، علیمت اور رحم،، ہیں۔ یہ بھی بتایا گیا ہے کہ اس علاقے کے لوگ مخصوص زبان بولتے ہیں جو اپنے پڑوسی علاقوں ___ کشمیر، سندھ، راجھستان اور مدھیہ دیش کی زبانوں سے مختلف ہے۔ پرشوتم کی تصنیف ''پراکرت نوشاسن،، جیسے ذرائع میں بھی جو بارہویں صدی کی ابتدا اور

☆ یہ جغرافیائی نام پنجاب میں آج بھی موجود ہیں جن کا تعلق گورجروں سے ہے: گورجراخان

(تحصیل اور شہر)، گوجر اور گوجرانوالہ (ضلع اور شہر)، گوجروال (ضلع لدھیانہ کا شہر) اور گجرات (ضلع لائلپور کا شہر)۔

تیرہویں صدی سے تعلق رکھتے ہیں اس کا ثبوت ملتا ہے کہ ایک خاص زبان وہاں تک کا دیش وبھاس (ملک تک کا کی زبان) موجود تھی۔

ازمنہ وسطیٰ کے شروع میں جنوب مغربی پنجاب کی آبادی کا نسلیاتی لحاظ سے پڑوسی سندھ سے قریب تعلق تھا۔ اس کی ایک بنیاد سندھ اور پنجاب کے اس علاقے کی آبادی کے درمیان تولیدی رشتے تھے۔ اس کے علاوہ دونوں کے جدامجد مشترک تھے___ یعنی ہند آریائی قومیتیں اور قبائل جو قدیم ملک سندھو ساؤویرا میں آباد تھے۔ یہاں نسل سازی کا عمل دسویں اور تیرہویں صدیوں کے واقعات نے تیز کر دیا۔ اسی کا نتیجہ تھا کہ ملتان میں قرمات ریاست کی بنیاد پڑی۔ بعد میں اسے ان ریاستوں میں شامل کرلیا گیا جن کا تعلق لاہور یا دھلی سے تھا۔ اس طرح ایک مدت کے لئے جنوب مغربی پنجاب اور سندھ کے رشتے منقطع ہو گئے۔ ساتھ ہی پنجاب کے پڑوسی علاقوں میں نسلیاتی ارتقا نے بھی اس پر اپنا اثر ڈالا۔ دسویں صدی کے آخر اور اٹھارویں صدی کے وسط میں ترکوں، افغانوں اور ایرانی تاجکوں کے جو مسلسل ریلے آتے رہے ان کے اثرات بہت دوررس ثابت ہوئے (مجموعی طور پر پنجاب کے لئے بھی)۔

برصغیر کی شمال مغربی سرحد پر ترکوں کی آمد غالبًا پانچویں صدی عیسوی کے بعد شروع ہوئی ☆۔ ترک توخارستان سے وادی کابل پہنچے (جہاں انہوں نے ایفطلی وفاق کو شکست دے کر اپنے پیر جمالئے) اور ایک مدت تک اس علاقے پر ان کے اقتدار کا بول بالا رہا۔ چینی سیاح ہوئی چاؤ نے اس علاقے کا 726 میں سفر کیا اور لکھا کہ ''بادشاہ اور اس کے سواروں کا رسالہ سب ترک تھے،،۔ عالم برنشام کا خیال ہے کہ جو ترک جنوب مشرقی افغانستان میں داخل ہوئے تھے ان کا قارلق قبیلے سے تعلق تھا۔ ممکن ہے کہ ترک قارلقوں کے دباؤ کی وجہ سے گندھارا کے شاہی حکمرانوں کو اپنی سکونت کاپی شا اور پروشاپور (پشاور) سے جنوب کی جانب ادبھند پور میں منتقل کرنا پڑی۔ چینی سیاح سیوآن تسانگ (جس نے ہندستان کا سفر 45-629 میں کیا) نے کاپی شا کے حکمراں کو چھتری ذات کا بتایا ہے۔ اور ہوئی چاؤ

☆ یہ پیش نظر رہے کہ لفظ ترک کا مطلب اس عہد میں نسلیاتی نہیں بلکہ مختلف قبائل کا سیاسی وفاق تھا۔

(726) نے ترک بادشاہ کا ذکر کیا ہے۔ اس صحیح قیاس کیا جا سکتا ہے کہ قارلق وادی کابل میں ساتویں صدی کے آخری نصف میں داخل ہوئے تھے۔

بعد میں جنوبی ترکستان اور شمالی افغانستان سے ترک مسلسل وادی سندھ میں بھی داخل ہوتے رہے۔ ان کا تعلق اوغوز اور خلاج قبائل سے تھا۔

برصغیر کے شمالی علاقوں پر مسلمان حملہ آوروں کی فوجوں میں زیادہ تر ترک لوگ ہوتے تھے۔ اور یہی حالت ان بادشاہوں کی فوجوں اور مصاحبین کی بھی تھی جو خراساں اور ماورالنہر سے دھلی آئے اور عظیم مغل سلطنت کی بنیاد ڈالی۔ ان کی فوج میں بھی اکثر سپاہی ترک تھے۔ ایرانی تاجکوں کی تعداد بھی کم نہیں تھی۔ قسمت کے دھنی ماورالنہر اور خراساں سے ہزاروں کے تعداد میں الپ تگین آیا کرتے تھے۔ نظام الملک اپنے ''سیاست نامے'' میں لکھتے ہیں: یہ خبر مشہور ہو جاتی تھی کہ فلاں نے ''سیاست نامے'' میں لکھتے ہیں: یہ خبر مشہور ہو جاتی تھی کہ فلاں نے ''ہندستان میں داخل ہونے والے درہ پر قبضہ کر لیا ہے، کئی علاقے فتح کر لئے ہیں اور مال غنیمت میں بہت سا سونا، چاندی، جانور اور غلام حاصل کئے ہیں''۔ پھر وہ کہتے ہیں کہ جو لوگ لوٹ مار کے تلاش میں نکلتے تھے ان کی تعداد بے شمار ہوتی تھی۔ بعض وقت سوھویں صدیوں میں پنجاب اور برصغیر کے شمالی علاقوں میں مسلمان حکمرانوں کے دربار، فوج اور انتظامیہ میں ''خالص ترکوں'' کے علاوہ ''تاجک شرفا'' بھی ہوتے تھے۔ تیرہویں اور چودہویں صدیوں میں منگولوں کے ہاتھوں قتل عام سے بچنے کے لئے بڑی تعداد میں ایرانیوں نے وادی سندھ اور پنجاب میں پناہ لی۔

نو واردوں کی صحیح تعداد بتانا ممکن نہیں ہے۔ لیکن پنجاب میں نسلیاتی عمل پر ان کے اثرات اور پنجابی جاگیردارانہ قومیت کی نسل سازی میں ان کی شرکت کے واضح ثبوت موجود ہیں۔ بیسویں صدی کے شروع میں سرکاری اعداد و شمار کے مطابق پنجاب کے 15 فیصدی مسلمان لوگ نو واردوں کی اولاد تھے۔

پشتونوں نے بھی پنجابیوں کی نسلیاتی ساخت پر اثر ڈالا۔ یہ عمل گیارہویں صدی سے پہلے غزنویوں اور بعد میں غوریوں کی فوجوں کے ذریعے ہوا جو دریائے سندھ کو پار کر کے پنجاب پہنچی تھیں۔ دھلی کے سلطانوں کی افواج میں بھی ہزاروں پٹھان سپاہی تھے۔ برصغیر کے شمال مغرب میں پشتونوں کی آمد کا ثبوت مقامات کے نام پیش کرتے ہیں: چودھویں صدی کے شروع میں ہمیں دوسرے جغرافیائی ناموں کے ساتھ افغان پور بھی ملتا ہے۔ افغان فوجوں کے سپہ سالاروں کی قوت اور ہنر کا اندازہ اس سے

ہوسکتا ہے کہ 42_1341 میں شاہ افغان نے ملتان پر قبضہ کرلیا تھا☆۔

پندرہویں صدی کے آخر میں جب بلوچ پنجاب کے جنوب مغربی علاقوں میں آئے تو انہوں نے بھی پنجابیوں کی نسلی ساخت میں حصہ لینا شروع کر دیا۔ بلوچی سرداروں نے مظفر گڑھ اور ڈھرہ جات کے جنوبی علاقے پر قبضہ کرلیا اور اپنے بے شمار عزیز و اقارب کے ساتھ وہیں بس گئے۔ بابر نے ذکر کیا ہے کہ سولھویں صدی کے شروع میں پنجاب کے شمالی علاقے ___ وادی جہلم کے بھیرا اور خوشاب میں بلوچوں کی الگ بستیاں تھیں☆☆۔ سولھویں صدی کے وسط میں مغل بادشاہ ہمایوں نے مشرقی پنجاب میں کئی بلوچی گھرانے آباد کئے۔ اس نے سوری حکمرانوں کے خلاف امداد دینے کے صلے میں انہیں زمینیں عطا کیں۔

پنجاب کے مختلف انفرادی علاقوں کے درمیان باہمی معاشی اور ثقافتی تعلقات ایک عرصے تک ترقی نہیں کر سکے۔ اس کی کئی وجوہات تھیں ___ سلطنت دھلی کی پوری تاریخ میں مسلسل جنگیں، جاگیرداروں کی بغاوتیں، متعدد بیرونی حملے (تیرھویں اور چودھویں صدیوں میں منگولوں کے، چودھویں صدی کے آخر میں تیمور کے) جنہوں نے پیداآور قوتیں برباد کیں، معاشی تباہی مچائی اور ملک کے سیاسی ٹکڑے کر ڈالے۔

اس میں نو وارد نسلیاتی عناصر کے مسلسل ریلے بھی شامل کر لیجئے۔ یہی سبب ہے کہ پندرھویں اور سولھویں صدیوں میں پنجابی جاگیردارانہ قومیت کی تشکیل مکمل ہوئی۔ اس کا اظہار

☆ابن بطوطہ، ''النظر،،، جلد 3، صفحہ 362۔

☆☆بابر، ''بابرنامہ،،، صفحہ 262۔

نسلیاتی لسانی اصطلاح پنجابی میں ملتا ہے جو پہلی بار سترھویں صدی کے شروع میں ادبی دستاویزوں میں درج کی گئی۔

پنجابی زبان کا سرچشمہ پراکرتیں (اپابھرنشا) تک کا، اجیری، اوپنا گر اور غالباً پیشاچی تھیں جنھیں پہلے ہزار سالہ عہد عیسوی کے وسط میں پنجاب کی ہندآریائی آبادی بولتی تھی۔ اس کی مشرقی بولیوں پر اپابھرنشا شوراسینی کا کافی اثر تھا جس سے بعد میں مغربی ہندی کی بولیوں نے جنم لیا۔ ازمنہ وسطی کے شروع میں مغربی پنجاب کی بولیوں کو داردی زبانوں نے بھی بہت متاثر کیا، پھر بعد میں سندھی، پشتو اور بلوچی نے بھی۔ پنجابی زبان میں عربی، فارسی اور ترکی کے کافی الفاظ ہیں۔ بعض ماہرین لسانیات نے تخمینہ لگایا ہے

کہ یہ پنجابی کے کل الفاظ کے 40 فیصدی ہیں۔

کچھ ماہرین لسانیات نے من مانے طور پر پنجابی بولیوں کو مغربی اور مشرقی گروھوں میں تقسیم کیا ہے یہ ٹھیک ہے کہ مغرب کی بولیوں (مثلاً لہندا ___ پنجابی لفظ لہند سے، جس کے معنی ہیں مغرب) اور مشرقی بولیوں میں فرق ہے، لیکن دونوں کا آپس میں تعلق ہے۔ ویسے ہر گروہ کے اندر کئی مقامی بولیاں شامل ہیں۔ مغربی بولیوں کا مشرقی بولیوں سے مقابلہ کرنا اور یہ سمجھنا کہ وہ دو مختلف زبانوں کو اظہار ہیں صحیح نہیں ہے۔ مغربی اور مشرقی گروہوں کی بولیوں کو واحد زبان پنجابی کی مختلف شکلیں تصور کرنا چاہئے۔ اس سلسلے میں اس بات پر زور دینے کی ضرورت ہے کہ اگرچہ بعض پنجابی بولیوں _ مشرقی (لاہوری، ڈوگری) اور مغربی (ملتانی) دونوں ___ کے وجود کا ذکر چودھویں اور سولھویں صدیوں کی دستاویزوں میں ملتا ہے لیکن خود پنجابی ان کا ایک دوسرے سے مقابلہ نہیں کرتے بلکہ انہیں ایک زبان کی مختلف بولیاں خیال کرتے ہیں۔

ازمنہ وسطی میں پنجابی کی خاص بولیاں یہ تھیں: لاہوری (یا لہوری) جو جہلم اور ستلج کے درمیان بولی جاتی تھی، ستلج کے مشرق میں سرہندی کا رواج تھا، سندجہلم کے دوآبے کے شمال میں پوٹھوہاری چالو تھی اور بالائی سندھ تک سندھ وادی میں ملتانی یا جات کی (اسے اچی یا پشتونوں کی زبان میں ہندکی بھی کہا جاتا ہے) کا چلن تھا۔

نویں صدی میں بدھ مت کے مختلف کے حامیوں نے جو بھجن لکھے، جو پنجاب کی سرزمین پر دسویں صدی کے آخر تک گائے جاتے تھے، وہ بعض عالموں کی رائے میں قدیم ترین پنجابی عبارتیں ہیں۔ اسی عہد میں گورکھ ناتھ اور چرپت ناتھ نے پنجابی میں نظمیں لکھیں۔ مشہور شاعر بابا شیخ فرید (1173 تا 1265) نے پنجابی ادب کے خزانے میں بیش بہا اضافہ کیا۔

پندرھویں اور سولھویں صدیوں میں جب مذاہب کے کٹرپن کے خلاف مذہبی اصلاح (بھگتی) کے پرچم تلے مختلف نظریاتی تحریکیں زوروں پر تھیں پنجابی زبان میں کئی ممتاز ادبی پارے تخلیق کئے گئے۔ ان تحریکوں میں سکھ مت قابل ذکر ہے جس کے بانی گرونانک تھے (1469 تا 1538) مسلمان صوفی بھی ایسی زبان میں تبلغ کرتے تھے جو عام لوگوں کے لئے قابل فہم تھی۔ ان سب باتوں سے پنجابی ادب نے فروغ پایا۔ اس دور کے پنجابی میں لکھنے والے عظیم ترین صوفی شاعر یہ ہیں: شیخ ابراہیم فرید ثانی

(1554 کے قریب مرگئے)، مدھولال حسین (1539 تا 1594) سلطان باہو (1631 تا 1691)۔ اٹھارویں صدی کے چوٹی کے پنجابی شاعر: بلھے شاہ (1680-1758)۔ علی حیدر (1690 تا 1785) اور فرد فقیر (1720 تا 1790)۔ وارث شاہ (1735 تا 1798) بھی بڑے پائے کے شاعر گزرے ہیں جنھوں نے پنجابی ادب میں غنائی رزمیہ اسلوب کی بنیاد ڈالی۔

جو بولی مرکزی پنجاب ___ لاہور اور امرتسر کے علاقے _ میں بولی جاتی تھی وہ ادبی پنجابی کی بنیاد بنی۔ سترھویں اور اٹھارویں صدیوں میں کوشش کی گئی کہ جنوب مغرب بولی (جات کی یا ملتانی) میں ادبی تخلیقات تحریر کی جائیں۔ لیکن اس میں زیادہ کامیابی نہیں ہوئی۔ پنجابی ایک ادبی زبان کی حیثیت سے ترقی نہیں کرسکی، اس کے کئی اسباب ہیں۔ انیسویں صدی کے وسط تک (جب کہ پنجاب ایک علحدہ صوبہ تھا) فارسی ملک کے انتظامیہ، دفاتر اور تجارت کی سرکاری زبان تھی۔ مذہبی امور میں مسلمان عربی اور ہندو سنسکرت کا استعمال کرتے تھے۔ صرف سکھوں میں عبادت کے وقت پنجابی زبان کام میں لائی جاتی تھی۔

سکھوں کی تحریک نے ___ جو مغل شہنشاہوں، درانی شاہوں کی حکمرانی اور ان کے حامی مسلمان اور ہندو زمینداروں کے خلاف پنجابی کسانوں اور شہری عوام کی جاگیرداری مخالف جدوجہد تھی ___ ازمنہ وسطی میں پنجاب کے معاشرتی معاشی ارتقا پر کافی اثر ڈالا۔ سکھوں کے مخالفین کے تشدد اور باغیوں کے قتل عام کے باوجود (احمد شاہ درانی کے حکم پر لاہور میں سکھوں کے سر کاٹ کر ان کے مینار بنائے گئے ☆) سکھوں کی تحریک کامیاب رہ اور اٹھارویں صدی کی ساتویں دھائی میں کئی آزاد سکھ ریاستیں قائم ہوگئیں۔ عظیم مغلوں اور درانی بادشاہوں کے خلاف جدوجہد کے ساتھ ساتھ سکھ فرقے کی بالائی پرت خود زمیندار بنتی گئی اور سکھوں میں نجی ملکیت اور معاشرتی عدم مساوات بڑھنے لگی۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ سکھوں میں سرداروں کا ایک بامراعات فوجی جاگیردار طبقہ ابھر آیا۔

لیکن سکھوں کی جاگیرداری کے خلاف تحریک نے کئی مسلمان اور ہندو زمینداروں کو ختم کر دیا۔ جو باقی رہے وہ بیشتر زمین، اقتدار اور اثر کھو بیٹھے۔ پنجاب کے اکثر کسان، دستکار اور چھوٹے دوکاندار چاہتے تھے کہ ایک مرکزی ریاست قائم ہوتا کہ بیرونی خطرات سے ملک کا تحفظ ہوسکے اور سکھ سرداروں کے باہمی ہلاکت آفریں جھگڑے ختم ہوجائیں۔ اس کے لئے پنجاب کے سیاسی اتحاد کی ضرورت تھی۔ مہاراجہ رنجیت سنگھ (1799 تا 1839) نے ستلج کے مغرب میں پنجاب کے علاقے پر قبضہ کر کے یہ کام انجام دیا۔

رنجیت سنگھ نے آراضی کی جاگیردارانہ نجی ملکیت کا اثر کم ہو جانے کا فائدہ اٹھا کر اسے ریاستی ملکیت بنا دیا۔ اب جاگیردارانہ ملکیت کی جگہ مشروط اور عارضی استعمال نے لے لی۔ بعض موروثی معافیاں باقی رہیں لیکن ان کی معاشی اہمیت کم تھی۔ ان کا مطلب یہ تھا کہ کسی قطعہ زمین سے لگان ریاست کے بجائے لوگ خود حاصل کر سکتے تھے۔ آراضی کی جاگیردارانہ نجی ملکیت (بہت محدود شکلوں میں) صرف سکھ ریاست کی سرحدوں کے قریب باقی رہی۔

یہاں یہ یاد رکھنے کی ضرورت ہے کہ سکھوں کے تحت آزاد پنجابی ریاست کے قیام کی وجہ سے پنجاب کی بالائی جاگیردارانہ پرت کی نسلیاتی ساخت میں اہم تبدیلیاں ہوئیں۔ اکثر غیر پنجابی جاگیردار جو وہاں مغلوں کے دور میں آئے تھے ختم کر دئے گئے یا انہیں پنجاب چھوڑنا پڑا۔ ان کی جگہ ان مقامی لوگوں نے لے لی جنہیں دھلی اور کابل کے حکمرانوں کے خلاف سکھوں کی جنگوں میں عروج حاصل ہوا تھا۔

☆محمود الحسینی، ''تاریخ احمد شاہ درانی،،، صفحہ 349۔

پنجابی کسانوں کی جاگیرداری کے خلاف جدوجہد کا ایک فائدہ یہ ہوا کہ زرعی برادریاں استوار ہوئیں، ملک کی زیادہ تر قابل کاشت زمین عام کسانوں کے ہاتھ میں آ گئی اور جاگیردار عناصر کمزور ہو گئے اور تعداد میں بھی کم۔ ''آزادی پسند اور توانا پنجابی کسان کو جاگیرداری نے کچلا ضرور لیکن اس نے احتجاج کیا اور مالک کے سامنے کبھی سر نہیں جھکایا،،☆۔ وہاں بھائی چارے کی برادریاں عام تھیں اور زمین پر انفرادی کسان خاندانوں کا موروثی قبضہ تسلیم کیا جاتا تھا۔ برادری کی ابتدائی شکلیں بھی موجود تھیں جہاں دیومالائی یا حقیقی مشترکہ جد امجد کی پیڑھی کے مطابق موروثی تقسیم کی جاتی تھی۔

مرکزی پنجابی ریاست قائم ہونے سے جاگیردارانہ نراج کم ہو گیا اور اس نے زرعی پیداوار، دستکاری اور تجارت کی بحالی کو فروغ دیا۔ ایک مغربی سیاح ایلفنسٹون جس نے ملتان کا 1808 میں (پنجاب ریاست میں شامل ہونے سے دس سال پہلے) سفر کیا لکھتا ہے کہ اکثر گاؤں ویران تھے، زراعت تنزل پذیر تھی اور قابل کاشت زمین کا آدھا حصہ بے کار پڑا تھا۔ دوسرا سیاح وائن وہاں 1836 میں گیا۔ اس نے لکھا کہ جس زمین پر جنگل نہیں ہیں وہ سب زیر کاشت ہے۔ وسیع پیمانے پر نہروں سے آبپاشی کی جاتی ہے، خاص طور پر ان کھیتوں میں جہاں گیہوں اور باجرہ پیدا ہوتا ہے۔ ملتان کے آس پاس

بے شمار میوے کے باغ ہیں۔

پنجاب کے خاص شہر (لاہور، امرتسر، ملتان، گجرات، سیالکوٹ، ڈیرہ غازی خاں وغیرہ اور خاص طور پر وہ شہر جو تجارتی شاہراہوں پر واقع تھے) جو اٹھارویں صدی کے پہلے نصف میں روبہ زوال تھے پھر ترقی کرنے لگے۔ ریشمی اور سوتی کپڑا، دھات کی اشیا، جوتے، زردوزی، زیورات، ہتھیار اور دوسری چیزیں بنانے میں بے شمار دستکار مصروف ہو گئے۔ ان شہروں سے افغانستان، ایران اور وسطی ایشیا کے ساتھ بیرونی تجارت ہوتی تھی اور مشرقی اور مرکزی ہندستان کی ریاستوں سے بھی۔ پنجاب افغانستان کو مختلف قسم کا سوتی کپڑا، نمک، نیل،

☆ ریس نیر ''سولھویں اور سترھویں صدیوں میں ہندستان میں عوامی تحریک،،، صفحہ 213 (روسی زبان میں)۔

تمباکو، قالین، دھات کی اشیا وغیرہ برآمد کرتا تھا۔ وہاں سے وہ مغرب اور شمال کو بھیج دی جاتی تھیں۔ پنجاب جو چیزیں درآمد کرتا تھا ان میں بادام، میوے، گھوڑے، کچا ریشم، اون تانبا، قیمتی دھاتیں اور رنگ شامل تھے۔

معاشرتی اور معاشی لحاظ سے مرکزی اور مشرقی پنجاب بہت ترقی یافتہ علاقے تھے۔ سرحد پر، شمالی پہاڑی علاقوں اور جنوب مغرب کی خشک اور نیم ریگستانی خطوں میں کاشت کم ہوتی تھی اور وہاں آبادی کا ایک حصہ نیم خانہ بدوش مویشی بانی کیا کرتا تھا۔ اس کے علاوہ قدیم پنچایتی نظام کی بعض شکلیں بھی موجود تھیں: گھریلو زندگی، معاشرتی معاملات اور ذہنیت میں جرگہ تنظیم کی باقیات۔ لیکن ان سرحدی علاقوں کا باقی پنجاب کے معاشرتی معاشی ارتقا پر کوئی خاص اثر نہیں پڑا۔

فطری معیشت کے انتشار اور محنت کی معاشرتی تقسیم کے عوامل سست تھے لیکن ملک نے بتدریج ترقی کی۔ ان عوامل کے تیز ہونے میں دو باتوں نے مدد دی: پنجاب کی حکومت نے براہ راست پیدا کرنے والوں اور تاجروں پر محصول نسبتاً کم عائد کئے، دوسرے وہ تجارت اور لین دین کی ہمت افزائی کرتی تھی۔ برطانیہ کا قبضہ ہونے سے پہلے پنجاب کے تمام بڑے شہروں کے آس پاس علاقائی منڈیاں وجود میں آ گئی تھیں اور کرخنداری کی ابتدا ہو رہی تھی۔

یہاں اس پر زور دینے کی ضرورت ہے کہ سکھ مت کا لبادہ مذہبی فرقہ پرستی تھا۔ لیکن اس حقیقت

سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا کہ سکھ مت نہ صرف پنجاب کی سرزمین پر پروان چڑھا بلکہ اس کی تاریخ خالص پنجابی مظہر تھی۔ سکھوں کے رہبروں نے سکھ مت کو پنجاب کی سرحدوں سے باہر پھیلانے کی کوئی سنجیدہ کوشش نہیں کی۔ اپنے چیلوں کو جاگیردارانہ ظلم کے خلاف لڑنے پر آمادہ کرنے کے لئے گرو گووند سنگھ (1675 تا 1708) نے وعدہ کیا کہ اگر فتح حاصل ہوئی تو وہ سکھوں کو ''لاہور سے پشاور تک کا علاقہ دلائیں گے،،☆۔ سکھ مت کے جھنڈے تلے جاگیرداری کے خلاف جو جدوجہد کی گئی اس کا مقصد ایک ایسی آزاد پنجابی ریاست قائم کرنا تھا جس کا اقتدار

M.A. Macauliffe, <<The Sikh Religion...>>, Vol. V, p. 14. *

سکھوں کے ہاتھ میں ہو۔ جب یہ ریاست وجود میں آئی تو پنجابی فوج کے سپاہی (جن میں سکھوں کے علاوہ ہندو اور مسلمان بھی تھے) جب اپنے سالار کو سلامی دیتے تھے تو کہتے تھے: پنج دریاؤں دی دھرتی زندا رہئے! (''پانچ دریاؤں کا دیس، زندہ باد!،،)

مذہبی فرقہ پرست تعصّبات کے باوجود جو اس وقت کے تاریخ حالات میں قدرتی تھے اور آج قابل فہم ہیں سکھ تحریک کے کارکنوں کے ذہن میں پنجابیوں کے نسلیاتی اتحاد کے تصورات موجود تھے۔ انہیں نہ صرف حقیقی اتحاد کا احساس تھا بلکہ انہوں نے اپنے مقاصد کے حصول میں اسے کام میں لانے کی کوشش بھی کی۔

وہ پنجابی جو سکھ تحریک سے علحدہ تھے ان کے بھی تمام پنجابیوں ــــ مسلمانوں، سکھوں اور ہندوؤں ــــ کے نسلیاتی اتحاد کے بارے میں اپنے خیالات تھے۔ اس کا اظہار اس زمانے کے پنجابی شعرا نے کیا ہے: قادر یار، شاہ محمد وغیرہ۔

سکھ مت کے پرچم تلے جاگیرداری کے خلاف جدوجہد کی گئی اس میں دونوں جانب کافی خون بہا اور لوگوں میں فرقہ پرستی کے شعلے بھڑکے۔ لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ پنجاب ریاست قائم ہو جانے کے بعد رنجیت سنگھ کے دربار اور ریاستی نظم و نسق میں سکھوں کے شانہ بشانہ مسلمانوں اور ہندوؤں کو بھی اہم عہدے حاصل تھے۔

سکھ فرقے نے پنجاب کے دوسرے مذہبی فرقوں کی مخالفت سکھوں کے بالائی جاگیردارانہ عناصر کے مفاد میں کی۔ لیکن جب وہ معاشرتی معاشی حالات ختم ہو گئے جنہوں نے ان عناصر کو جنم دیا تھا تو یہ

مخالفت بھی ختم ہونے لگی۔

☆☆☆

سندھی قومیت کا نسلیاتی اسم سنسکرت لفظ سندھو سے ماخوذ ہے جس کے معنی ہیں دریا۔ اگر یہ لفظ اسم خاص کی طرح استعمال کیا جائے تو اس کا مطلب دریائے سندھ ہوگا۔ قدیم زمانے میں سندھو وادی سندھ کے نشیبی علاقے سے گزرتا تھا، اور ملک سندھو موجودہ بالائی (شمالی) سندھ میں دریا کے دائیں کنارے کے اور دیس ساؤویرا کے مغرب میں جنوبی پنجابی کے علاوہ پر مشتمل تھا☆۔ غالباً ابتدائی

☆ ارتھ شاستر اور پورانوں میں سندھو علاقے کا نام ملتا ہے۔

عیسوی صدیوں میں سندھو میں سندھ کا ڈیلٹا (موجودہ نشیبی سندھ) بھی شامل ہوگیا۔

سندھیوں کی نسل سازی کی جڑیں ان باہمی قرابتی ہند آریائی قومیتوں اور قبائلی اتحادوں میں ملتی ہیں جو پہلے ہزار سالہ عہد قبل از مسیح میں نشیبی سندھ میں تشکیل پائے تھے۔ قدیم مصنفین نے اکثر ان لوگوں کا ذکر کیا ہے اور ان کی تفصیلات بیان کی ہیں۔ انہیں کئی نام دئے گئے ہیں: ارابی تا (اربی)، پتالائی، موسی کانو، سم باستی، مس سانو وغیرہ☆۔ دوسری صدی قبل از مسیح اور پانچویں صدی عیسوی میں ساکا مس ساگیتی اور خیونتی ایفطلی قبائل کے عناصر نے بھی سندھیوں کی نشیبی سندھ کی نسل سازی میں حصہ لیا۔ لیکن معلومات کی بنا پر کہا جا سکتا ہے کہ نشیبی سندھ کی نسل سازی کے عمل میں ان کا دخل بہت کم تھا۔

جن تاریخی واقعات کا سندھ پر عرب حملے سے تعلق ہے انہوں نے جاگیردارانہ سندھی قومیت کے استحکام میں بڑی مدد دی۔ عربوں نے ساتویں صدی عیسوی کے آخری نصف میں برصغیر ہند و پاکستان کے شمال مغربی ساحلوں پہنچنے کی کوشش کیں۔ لیکن درحقیقت یہ بحری پیمائش کی مہمیں تھیں۔ سندھ پر حملہ 711 میں شروع ہوا۔ دو سال کے دوران خلیفہ ولید کے فوجی سالار محمد ابن قاسم نے مقامی شہزادوں کی سخت مزاحمت توڑ دی اور ملتان تک پہنچ گئے۔

عربوں کی فتح کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ مقامی آبادی زیادہ تر بدھ مت ماننے والوں پر مشتمل تھی اور ان کے رہنما ہندو حکمرانوں کے خلاف تھے۔ انہیں عربوں سے ہمدردی تھی، اور چند بار تو بدھ مت کے رہنماؤں نے ان کی امداد بھی کی۔ چنانچہ سیہوان کے بدھ سربراہ نے اپنے پیروؤں سے اپیل کی کہ وہ عربوں کی اطاعت قبول کرلیں۔ بدھ مت ماننے والوں نے دریائے سندھ کو پار کرنے میں محمد ابن قاسم کا

ہاتھ بٹایا۔

حملے کے بعد چالیس سال تک بن امیہ خلفا کے صوبے دار اس علاقے پر حکمرانی کرتے رہے۔ لیکن جب عباسیوں نے انہیں ہٹا دیا (750) تو سندھ کے صوبے داروں نے برائے نام عباسیوں کا اقتدار تسلیم کیا لیکن

Arrianus, <<Anabasis>>; Arrianus, <<Indica>>; Strabon, <<Geographika>>;* Diodorus Siculus, <<Bibliotheca Historica>>

درحقیقت وہ خود مختار حکمراں بن گئے۔ دسویں صدی کے شروع میں برصغیر کے شمالی علاقے کے جس حصے کو عربوں نے مفتوح کیا وہ ایک آزاد جاگیردارانہ ریاست ہو گیا۔ اس کے دارالخلافہ بننے کا شرف ملتان کو حاصل ہوا۔ دسویں صدی کے وسط میں ملتان کے امیر اور سندھ کے عرب حکمراں کی عمل داریوں کی سرحد بالائی سندھ کے موجودہ شہر روہڑی پر ملتی تھی☆۔

سندھ میں عربوں کے عمل دخل کے ساتھ ساتھ اسلام بھی پھیلا۔ مقامی بدھ مت ماننے والوں نے جو مذہبی ایذا رسانی کے شکار رہتے تھے۔ خوشی سے اسلام قبول کر لیا☆☆۔ دسویں صدی کے آخر تک اس علاقے کی اکثر آبادی نئے مذہب کی پیرو بن گئی۔ ''حدودالعالم'' کا مصنف لکھتا ہے کہ سندھ کے مغربی کنارے پر رہنے والے اور منصورہ (سندھ کا دارالحکومت) کے باشندے ''سب مسلمان'' تھے۔ عربوں کے ساتھ عربی زبان بھی آئی اور وہ اس علاقے کی مذہبی اور سرکاری زبان بن گئی۔

ازمنہ وسطی کے شروع میں اسلام نے جاگیردارانہ تعلقات کو فروغ دینے اور انہیں مضبوط بنانے میں ایک موثر وسیلے کا کار منصبی انجام دیا۔ یہی وجہ ہے کہ عربی برسر اقتدار مذہب کی زبان کی حیثیت سے بڑے پیمانے پر پھیلی☆☆☆۔

سندھ کے معاشرے کو جاگیردارانہ بنانے میں عربوں کی فتح کا بڑا ہاتھ ہے ــــ یہ عمل قبل از اسلامی عہد میں شروع ہو گیا تھا۔ سندھ کے امیروں نے اپنے فوجی افسروں، پسندیدہ لوگوں اور مسلم عالموں کو فیاضی سے زمینیں عطا کیں۔ آہستہ آہستہ فاتح مقامی زمینداروں میں گھل مل گئے جو مسلمان ہو گئے تھے۔ اس طرح جاگیردار طبقے کی حکمراں پرت ابھری۔

☆الاسخری ''کتاب مسالک الممالک،،صفحہ 175۔

I.H. Qureshi, <<The Muslim Community...>>, pp. 37_43.**

☆☆ گیارھویں اور تیرھویں صدیوں میں فارسی نے عربی کی جگہ لے لی۔ فارسی ایران، افغانستان اور وسطی ایشیا سے مسلم مبلغوں، جاگیری سرداروں اور غزنویوں اور غوریوں کے سپاہیوں اوران کے جانشینوں کے ذریعے سندھ پہنچی۔

صاحب اقتدار جاگیردارانہ سندھی ریاست کے قیام نے، جس کے رابطے برصغیر کے دوسرے علاقوں سے نسبتاً کمزور تھے، اس کی آبادی کو ایک واحد جاگیردارانہ قومیت میں مستحکم ہونے کے عمل کو تیز کیا☆۔اس آبادی کے نسلیاتی استحکام کے خاص مرکز سندھ کا ڈیلٹا اور اس سے ملحق وادی سندھ کا جنوبی حصہ تھے۔ یہی علاقے معاشی لحاظ سے سب سے زیادہ ترقی یافتہ تھے اور یہاں اہم ترین انتظامی، سیاسی، معاشی اور ثقافتی مرکز واقع تھے۔

ان علاقوں میں آباد کاشتکاری کی معیشت نے ابھرتے ہوئے سندھی نسلیاتی فرقے کو تیزی سے مستحکم ہونے اور اپنا ممتاز وجود قائم کرنے میں مدد دی۔

آٹھویں صدی کے آخر میں سندھ میں نسلیاتی عوامل کا نتیجہ یہ نکلا کہ اس کی آبادی ایک جاگیردارانہ قومیت میں مرکوز ہوگئی۔ اس کا ثبوت ہمیں اس سے ملتا ہے کہ برصغیر کے دوسرے علاقوں میں اس وقت سندھ ایک متحد سالم سمجھا جاتا تھا جو اپنے مخصوص انسانیاتی کردار، روحانی ساخت اور زبان کا مالک تھا۔ چین دکشنی یا چیہن (778) کے یہاں سندھیوں کی ان امتیازی خصوصیات کو یوں بیان کیا گیا ہے: ''خوش وضع...،خوبصورت، سبک اور مدہم طرز خرام، وہ گندھاروی فنون کے رسیا ہیں (گیت، موسیقی اور رقص ___ مصنف) اور اپنے وطن سے محبت کرتے ہیں،،۔

دسویں اور گیارھویں صدیوں کے مسلمان مصنفین نے بھی سندھیوں کی مخصوص زبان اور رسم الخط کا ذکر کیا ہے اور انہیں برصغیر کے دوسرے لوگوں سے مختلف بتایا ہے۔ الاسخری لکھتے ہیں کہ منصورہ اور ملتان اوران کے نواحی علاقوں کی زبان عربی اور سندھی ہے اور

☆750 کے بعد سے 1591 تک عملاً سندھ خودمختار ریاست رہا۔ صرف گیارہویں صدی کے آخری نصف میں اسی پر غزنویوں کی سیاسی بالادستی رہی۔ لیکن پھر سومرو خاندان نے سندھ ک اقتدار اعلی

بحال کرلیا۔ سندھ کو فتح کرنے کی دھلی کے سلطانوں کی کوششیں بھی کامیاب نہیں ہوئیں۔ صرف عظیم مغل اکبر سندھ کو اپنی سلطنت میں شامل کر سکا۔

مکران کے باشندوں کی فارسی ☆۔ ابیرونی نے اپنے زمانے میں ہندستان میں رائج جو حروف تہجی گنائے ہیں ان میں سندھی (سیندب) کے حروف تہجی کا بھی ذکر ہے ☆☆۔ نظام الملک، ابوفضل بیہقی، ابن خوقال، ابن خورداذبہ جیسے مستند مصنفین نے سندھ کو ایک ممتاز اور مخصوص علاقہ قرار دیا ہے اور اسے مغربی اور جنوبی ایشیا کے ملکوں کی فہرست میں شامل کیا ہے۔

اپنی نسل سازی کی بعد کی منزل میں (پندرھویں اور سولھویں صدیوں میں) سندھیوں نے اپنے اندر انفرادی بلوچی قبائل (اور غالباً بروھی کو بھی جو بلوچی وفاق میں شامل تھا) کو جذب کیا جو شمال اور شمال مغرب سے سندھ آئے تھے، اور چند جاٹ قبائل کو بھی جنھوں نے جنوبی پنجاب سے وہاں پیش قدمی کی تھی۔ بلوچوں میں جرگہ تنظیم کی گہری باقیات تھیں۔ اس لئے ان کے سندھی نسل سازی میں شریک ہونے کا نتیجہ یہ نکلا کہ ازمنہ وسطی کے آخر میں نشیبی سندھ کے لوگوں میں جرگہ تنظیم بحال ہوگئی اور جرگوں کی بنیاد پر معاشرتی تقسیم پھر چل نکلی۔ اس کے علاوہ ہندومت کے ذات پات کے تصورات اور روایات کی باقیات بھی سندھی مسلمانوں میں آ گئیں۔ ان کی وجہ سے بھی جرگہ تقسیم مضبوط ہوئی۔

اٹھارویں صدی کے آخر اور انیسویں صدی کے شروع تک سندھی لوگ دو سو سے زیادہ جرگوں میں بٹے ہوئے تھے۔ ان میں سے بعض (احمدانی، محمود، میرآخور) کسی نہ کسی بڑے جاگیردارانہ سردار کے رشتے داروں یا اس کے پسندیدہ لوگوں کی اولاد ہوں گے۔ مثلاً میرآخور جرگے کا تعلق اصطبل گیر کے جاگیری لقب سے ہے۔ دوسرے جرگوں (مثلاً ملتانی) کی ابتدا آبادی کے ان گروہوں سے ہوئی جو برصغیر سے سندھ میں آ کر سندھیوں میں جذب ہو گئے تھے۔ ایسا ہی دوملی جرگہ بلوچی قبائل کے ایک حصے کے جذب ہوتے وقت بنا۔ بھائی اور سیال جرگوں نے اس وقت تشکیل پائی جب پنجاب کے جاٹوں کا ایک حصہ سندھیوں میں تحلیل ہوا۔

☆ الاستخری، ''کتاب مسالک الممالک''، صفحہ 177۔

☆☆ ☆البیرونی، ''تحقیق ماللہند''، صفحہ 82۔

سندھیوں کا ایک جرگہ میمن بھی تھا (عربی لفظ مومن کی بگڑی ہوئی شکل)۔ شروع میں یہ لوھانا

ذات کے ہندو سندھی تھے جن کا تولیدی رشتہ کچھ کی گجراتی آبادی سے تھا جو پندرھویں صدی میں مسلمان ہو گئے۔ بہت سی معاشرتی جماعت بندیاں الگ الگ ذات یا جرگے کی نوعیت رکھتی تھیں: سید (حسنی اور حسینی میں بٹ گئے) جن کا دعوی تھا کہ وہ پیغمبر اور ان کے رشتے داروں کی اولاد ہیں، قریشی (یا صدیقی)، علوی، عباسی اور خوجے جن کا پیشہ تجارت اور سود خوری تھا۔

ازمنہ وسطی کے آخر میں وادی سندھ کا علاقہ جہاں سندھی آباد تھے۔ تین بڑے بڑے حصوں میں منقسم تھا: لار یا جنوبی سندھ جس کے خاص معاشی اور نظم و نسق کے مرکز ٹھٹھ اور کراچی تھے۔ وچولو یا وسطی سندھ جس کا خاص شہر حیدر آباد تھا۔ سیرو یا شمالی سندھ جس کے اہم شہر خیر پور، لڑکانہ، سکھر اور شکار پور تھے۔ اٹھارویں صدی کے وسط تک ٹھٹھ سندھیوں کا سب سے بڑا معاشی اور ثقافتی مرکز تھا۔ ان خطوں کے علاوہ سندھی لوگ کچھ جزیرہ نما، سبی، نیم ریگستان تھر کے مغربی نخلستانوں (قلعہ بند شہر عمر کوٹ) اور لاس بیلا بھی میں آباد تھے۔

جب آخری مغل بادشاہوں کے مرکزی اقتدار کو زوال آنے لگا تو سندھ بیرونی حملہ آوروں کے لئے کھلا میدان بن گیا۔ 1739 میں ایرانی شاہ نادر شاہ نے سندھ کی سرزمین روندھی۔ نادر کی موت کے بعد احمد شاہ درانی نے 1748 اور 1750 کے دوران تمام سندھ کو فتح کر لیا۔ شہر شکار پور میں افغان صوبیدار مقرر کر دیا گیا اور نشیبی سندھ کا حکمراں کلہوڑوں خاندان افغان بادشاہوں کا باجگزار بن گیا۔ جب 1753 میں کلہوڑوں نے افغانوں کا اقتدار الٹنے کی کوشش کی تو انہیں بزور شمشیر کچل دیا گیا۔ 1757 میں مغل شہنشاہ عالمگیر ثانی نے سندھ کی فتح تسلیم کر لی۔

1778 میں سندھ کے فرمانروا امیر غلام نبی خاں کلہوڑو اور بلوچی قبیلے تالپور کی جاگیری اشرافیہ کے درمیان ہلاکت آمیز جنگ شروع ہوئی۔ تالپور اس میں فتحیات رہے۔ انہوں نے کہ کلہوڑوں کو گدی سے ہٹا دیا (1786) اور سندھ کو چھوٹی چھوٹی جاگیری عمل داریوں میں تقسیم کر دیا۔ تالپوروں نے درانی شاہوں کو خراج بھی ادا نہیں کیا جس کی وجہ سے افغان فوجوں نے کئی بار سندھ پر حملے کئے (1779، 1781، 1783، 1786، 1794، 1808)۔

ان مسلسل حملوں اور اندرونی جھگڑوں اور تصادموں نے سندھ کی خوشحالی پر مضر اثر ڈالا۔ شمالی سندھ پر نادر شاہ کے حملے کے نتائج کا ذکر کرتے ہوئے محمد کاظم نے لکھا ہے ''اس ملک میں جس کی ہندستان میں

مثال نہیں مل سکتی تھی خواہ یہ وسعت، رقبے یا آبادی کے لحاظ سے ہو، ایک بھی انسانی رہائشی گھر باقی نہیں بچا،، (نامہ الامارہ نادری)۔ آبپاشی کا نظام ابتر ہونے لگا، زمین پر کاشت کا رقبہ کم ہو گیا اور تجارت گرنے لگی۔

پیداآور قوتوں کے زوال نے سندھ کی معیشت کو بڑا نقصان پہنچایا__ ٹھٹھ کی آبادی 3 لاکھ سے گھٹ کر 1809 میں 20 ہزار اور، 1851 میں 7 ہزار رہ گئی۔ کئی اہم شہر (مثلاً سکھر) کھنڈر بن گئے۔

شہروں کی تباہی کا اندازہ یوں بھی ہوسکتا ہے کہ کراچی کی آمدنی جہاں سے سندھ کی زیادہ تر برآمد کی جاتی تھی 6 لاکھ 16 ہزار روپیہ (1793) سے گھٹ کر 99 ہزار (1809) ہوگئی۔ شمالی سندھ کا سب سے بڑا تجارتی مرکز شکار پور بھی زوال مبتلا ہوگیا۔

مسلسل جنگوں، جاگیردارانہ نراج اور براہ راست پیدا کرنے والوں کے اندھا دھند استحصال نے زراعت کو سخت نقصان پہنچایا۔ اس کا ثبوت کاشت کے علاقے کے رقبے میں کمی سے ملتا ہے (اٹھارویں صدی کے وسط میں یہ ساڑھے آٹھ لاکھ ھیکٹر تھا اور آخر میں تقریباً آدھا رہ گیا)۔ چنانچہ ملک کے خوشحال ترین علاقوں میں زراعت سے جو آمدنی ہوتی تھی وہ بہت زیادہ گھٹ گئی۔ سندھ کے دامنے کنارے پر لڑکانہ علاقے میں 1778 اور 1809 کے درمیان آراضی کا منافع نصف رہ گیا۔

تالپوروں کے عہد میں آبپاشی کے نظام پر مطلق توجہ نہیں دی گئی جو ملک کی خوشحالی کا سرچشمہ تھا۔ زمین کی کاشت کے دقیانوسی طریقے نہیں بدلے گئے۔ ان تمام باتوں نے زراعت کو تباہ حال بنادیا۔

افغانستان کے شاہوں کو ہر سال 15 لاکھ روپے خراج ادا کیا جاتا تھا۔ اس نے بھی سندھ کی معیشت کھوکھلی کر ڈالی۔ یہ رقم سندھ کی سب سے بڑی عمل داری خیر پور میں سالانہ جمع کئے جانے والے محصولات سے دوگنی تھی۔ یہ ٹھیک ہے کہ اکثر خراج کی پوری رقم ادا نہیں کی جاتی تھی لیکن جنگوں سے تباہ شدہ ملک کے لئے یہ بڑا بھاری بوجھ تھا۔

شہروں کے زوال، تجارت میں کمی، جنس کی معیشت کی جگہ فطرت معیشت، آبپاشی کے نظام کی تباہی نے خاص طور پر شمالی سندھ کو متاثر کیا۔ اس رقبے کی معیشت، پر خانہ بدوش اور نیم خانہ بدوش مویشی بانی حاوی ہوتی گئی۔ معیشت میں ان تبدیلیوں کی وجہ سے سیاسی اقتدار بلوچی قبائل کی اشرافیہ کے ہاتھ میں آنے لگا۔ اٹھارویں صدی کے آخر تک سندھ کا مکمل اقتدار اس نے حاصل کرلیا۔

ازمنہ وسطیٰ کے آخر میں سندھیوں کے معاشرتی معاشی ڈھانچے کی بنیاد زمین اور پانی کی جاگیردارانہ ملکیت تھی۔ جاگیردار ریاست تمام پانی کی بلند و برتر مالک اور تقسیم کنندہ سمجھی جاتی تھی۔ اس لئے حکمراں خاندان کا یہ حق تھا کہ وہ زمین پر گزر بسر کرنے والوں سے لگان حاصل کرے۔ اٹھارویں صدی کے آخر تک لگان جنس کی شکل میں وصول کیا جاتا تھا۔

زمین کی ملکیت کی کئی شکلیں تھیں۔ ان میں سے خاص خاص یہ تھیں: ریاستیں آراضیات (خالصہ) جو سندھ کے فرمانرواؤں کی پوری ملکیت ہوتی تھی؛ مشروط زمین کی بخششیں (جاگیرداری، پٹے داری)، جب لگان بالکل یا جزوی طور پر معاف کر دیا جاتا تھا (یہ زمینیں فوجی یا مدنی خدمت کے صلے میں عطا کی جاتی تھیں۔ ان زمینوں سے جاگیردار یا پٹے دار کل یا جزوی طور پر اتنا لگان وصول کرتے تھے جو پہلے ریاست حاصل کرتی تھی☆؛ نجی زمین (زمینداری) جس کے استعمال کی یہ شرط نہیں تھی کہ فوجی یا مدنی خدمت کی جائے، چنانچہ زمیندار اپنی مرضی کے مطابق زمین پر کاشت کرتا تھا (لیکن ساتھ ہی زمیندار ریاست کو معین لگان دینے پر مجبور تھے اور کاشت کے ذمے دار تھے)؛ مختلف مذہبی اداروں اور علما کو بخشی ہوئی زمینیں (اوقاف، خیرات، انعام)۔

شہادتوں سے پتہ چلتا ہے کہ تالپوروں کے عہد سے ہی زمین کی

☆ تالپوروں نے بہت سی زمین اپنے رشتے داروں اور بلوچی سرداروں کو اس شرط پر دے دی کہ وہ ضرورت کے وقت مسلح ہو کر مدد کریں۔ شمالی سندھ میں افغان شاہوں نے افغان سرداروں اور سپاہیوں کو کئی ہزار ایکڑ زمین مفت عطا کی۔

اجتماعی ملکیت اور استعمال تقریباً ختم ہو گیا تھا۔ اس کا تعلق سندھ میں پنچائت کے انتشار سے تھا۔ زرعی پنچائت ختم ہونے کے اسباب اندرونی منڈی کا ارتقا، دیہات میں جنس اور زر کے تعلقات کا داخل ہونا اور سندھ کے حکمرانوں کی سوچی سمجھی پالیسی تھے جو چاہتے تھے کہ جاگیردار مشترکہ زمینوں کے مالک بن جائیں۔ ایک حد تک مشترکہ زمینیں جاگیرداروں کو منتقل کرنے کے ذمے دار سرکاری حکام (کاردار) بھی تھے جو مختلف انتظامی علاقوں کے نگراں تھے اور نظم و نسق اور عدلیے کے اختیارات سنبھالنے کے علاوہ لگان و محصول بھی جمع کرتے تھے۔

سندھ کے دیہات میں زمین کی اجتماعی ملکیت اور استعمال ختم ہو گیا اور اجتماعی ذمے داری بھی

(پرتی زمین، جنگل اور چراگاہیں بھی اس میں شامل تھیں)۔ پنچائتی تنظیمیں ضرور موجود رہیں لیکن محض باقیات کی شکل میں۔

سندھ میں کسان ملکیت کی بہت کم اہمیت تھی۔ اکثر زمین پر ہاری کاشت کرتے تھے۔ ان کی دو قسمیں تھیں ___ موروثی ہاری جو زمیندار کو فصل کا مقررشدہ حصہ ادا کرتے تھے اور ان کے قطعات موروثی ہوتے تھے۔ دوسری قسم غیر موروثی ہاریوں کی تھی جو موروثی حق سے محروم تھے۔

سندھ کسان بدترین جاگیردارانہ استحصال کے شکار تھے۔ ریاست کو لگان ادا کرنے کے علاوہ انہیں مختلف محصولات اور رسم ورواج کے مطابق کئی قسم کی واجب الوصولیاں دینا پڑتی تھیں۔ اس کے علاوہ ان سے بیگار بھی لی جاتی تھی۔

جیسا کہ ہم پہلے کہہ چکے ہیں تالپوروں کے عہد میں شہروں پر زوال چھایا ہوا تھا۔ اس وقت ان میں اکثر کی نوعیت نیم زرعی تھی۔ لیکن اس کے باوجود بعض بڑے شہروں میں کاریگری اور تجارت ترقی کرتی رہی۔ دستکار زرعی خام پیداوار سے اشیا بناتے تھے اور زمینداروں اور عام خریداروں کی ضروریات پوری کرتے تھے۔ تاجر زیادہ تر بیرونی تجارت کرتے تھے۔ ان میں سے اکثر ملک کے حکمرانوں اور جاگیرداروں کو قرضے دے کر بہت سود حاصل کرتے تھے۔ خاص کر شکارپور کے تاجروں نے درانی شاہوں کی فوجی مہموں کی مالی امداد کر کے کافی سرمایہ جمع کر لیا تھا۔ تجارت اور سودخوری بیشتر ہندو تاجروں اور بنیوں کے ہاتھ میں تھی۔ شہری آبادی کی اکثریت ان پر مشتمل تھی۔ جہاں تک دستکاری اور کاریگری کا تعلق ہے (کپڑا بننا، رنگائی، چمڑہ کمانا) تو یہ کام زیادہ تر مسلمان کرتے تھے۔

سندھ کا سرکاری مذہب اسلام قرار پانے کی وجہ سے ملک کی زندگی کے تمام پہلوؤں پر مسلمان علما کا بہت اثر ہوا جو بڑی تعداد میں تھے اور کافی دولت مند بھی۔ ان کے اختیارات میں ہی ملک کا پورا انتظام تھا۔ ماہر قانون (مفتی) اور منصف (قاضی) علما میں سے مقرر کئے جاتے تھے۔ نوجوانوں کی تعلیم وتربیت پر بھی ان کی نگرانی تھی (مدرسوں یعنی مذہبی تعلیمی اداروں میں وہ استاد تھے)۔ اخلاق کی دیکھ بھال مولوی کرتے تھے اور اس کی بھی کہ شریعت پر عمل کیا جا رہا ہے۔

دوسری طرف سیاسی بدحالی اور معاشی انتشار کی وجہ سے اٹھارویں صدی کے آخر میں صوفیانہ خیالات تیزی سے پھیلنے لگے۔ تصوف نے بڑا فروغ پایا اور پورے سندھی معاشرے کو اپنے رنگ میں

رنگ دیا۔ بڑے بڑے صوفیوں ___ پیروں، خلیفاؤں اور مرشدوں کے ہزاروں مرید ہوتے تھے۔ وہ اپنے مریدوں سے ان کی آمدنی کے آٹھویں حصے سے لے کر نصف تک وصول کرتے تھے۔ آزاد سندھ کے آخری برسوں میں بعض بااثر پیروں کی آمدنی 4 لاکھ روپے سالانہ تک تھی۔ پیروں کی زمین کی کاشت اکثر ان کے مرید بلا اجرت کیا کرتے تھے۔ پیروں کا سیاسی اثر بھی کافی تھا کیوں کہ بہت سے بڑے بڑے زمیندار اور حکمراں خاندان کے افراد ان کے مرید ہوا کرتے تھے۔ بعض اوقات ایسا بھی ہوا کہ پیروں نے سیاسی اقتدار کا دعویٰ کیا اور اسے حاصل کر لیا۔ مثال کے طور پر سندھ کے حکمراں ہونے پہلے کلہوڑو خاندان کے امیر (1707 سے 1786 تک) اس فرقے کے خلیفہ تھے جس کی بنیاد میاں محمد مہدی نے ڈالی تھی۔ سترہویں صدی کے آخر میں اپنے مریدوں کے سہارے کلہوڑو پہلے بڑے زمیندار بنے پھر انہوں نے ملک کا سیاسی اقتدار اپنے ہاتھ میں لے لیا۔

سندھ میں صوفیوں کی مختلف شاخیں تھیں ___ جلالی، قادری، نقش بندی، سہروردی، چشتی۔ ان میں سندھ میں سب سے بااثر جلالی تھے۔ باقی برصغیر ہندو پاکستان اور اس کی سرحدوں سے بھی باہر مقبول تھے۔

یہ بات یاد رکھنے کے قابل ہے کہ سندھ میں نہ صرف مسلمان بلکہ ہندو بھی پیروں کے مرید ہوا کرتے تھے۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ ازمنہ وسطیٰ کے آخر میں سندھ میں تصوف ایک حد تک کٹر مذہبی عقیدہ پرستی کے ردعمل کا نتیجہ تھا۔

جاگیرداری کے سبب سندھ کا شیرازہ بکھرنے، شہروں پر زوال آنے، سیاسی زندگی پر بلوچی قبائل کی اشرافیہ کے غلبے اور نظریاتی اور روحانی شعبے میں چوٹی کے ملاؤں کے عمل دخل کے سبب غلامی ☆ اور جرگہ تعلقات کی باقیات موجود رہیں۔ حالانکہ سندھ کی اکثر آبادی مسلمان تھی لیکن ذات پات (مختلف شکل میں) کو بھی روا سمجھا جاتا تھا۔

سندھی زبان سابق پراکرت (اپابھرنشا) وراچادا سے نکلی ہے جسے سندھ اور جنوب مغربی پنجاب میں رہنے والے باہمی رشتے کے ہند آریائی قبائل اور قومیتیں ایک ہزار سالہ عہد عیسوی کے وسط میں بولتے تھے۔ وراچادا کئی بولیوں میں بٹی ہوئی تھی۔ غالباً وراچادا کی شمال مغربی بولیوں پر داردی زبانوں کا اثر تھا جن کے بولنے والے آج کے مقابلے میں کہیں زیادہ بڑے رقبے پر پھیلے ہوئے تھے۔ اس کے

شمال مشرقی بولیاں اپابھرنشا تاک کا اور اوپنا گر سے متاثر ہوئی تھیں جو مرکزی اور مشرقی پنجاب میں بولی جاتی تھیں۔ سندھی زبان کی اصل بنیاد وراچادا کی جنوبی بولیاں تھیں جنہیں نشیبی سندھ کی ہند آریائی آبادی بولتی تھی۔ جب عرب سندھ میں آئے تو سندھی زبان میں بہت سے عربی الفاظ بھی شامل ہو گئے اور بعد میں فارسی لفظ بھی۔

سندھ میں بھی زمانہ وسطیٰ میں ادبی تحریری زبانوں (جو معاشرے کے بالائی لوگوں، عقائد، ریاست اور انتظامیہ کی ضرورت پوری کرتی تھیں) اور ان بولیوں کے درمیان مقابلہ رہا جنہیں زیادہ تر عوام بولتے تھے۔ دراصل یہ جاگیردارانہ عہد کا ایک مخصوص عمل تھا۔ عقائد کے سلسلے میں مسلمان عربی اور ہندو سنسکرت استعمال کرتے تھا۔ عقائد کے سلسلے میں مسلمان عربی اور ہندو سنسکرت استعمال کرتے تھے۔ فارسی دفتری کارروائی، ریاستی نظم ونسق، دربار اور ادب لطیف کی زبان تھی۔ عام لوگوں کی بھدی اور نچلی بولی کے مقابلے میں عربی اور فارسی کے استعمال سے معاشرے کی حکمراں جاگیری اشرافیہ کے مراعاتی رتبے کا اندازہ ہوتا ہے اور معاشرتی جماعت بندی کے سبب اس کی علیحدگی کا۔

☆ یہ زیادہ تر گھریلو نوکر چاکر ہوتے تھے۔

لیکن اس کے باوجود سترھویں اور اٹھارویں صدیوں میں سندھی ادب نے سندھی زبان میں ترقی کی۔ اس کا سبب سندھی قومیت کا مکمل استحکام تھا۔ جب ایسا عمل ہوتا ہے تو اس کا اظہار منجملہ اور باتوں کے نسلیاتی اتحاد کے پختہ احساس اور جاگیردارانہ دانشوروں کے ترقی پسند حصے میں اپنی بولی کو قومی ادبی زبان بنانے کی خواہش سے ہوتا ہے۔ اس زمانے کے ترقی یافتہ لوگوں نے ایسی زبان لکھنے کی کوشش کی جو عام لوگوں کی سمجھ میں آ سکے۔ بلاشبہ اس نے سندھی ادب کو پروان چڑھانے میں مثبت رول ادا کیا۔

ادبی سندھ زبان کی اصل بنیاد لاڑی ہے جو سندھ کے سب سے زیادہ ترقی یافتہ حصے (لاڑ، جنوبی سندھ) کی بولی تھی۔ لیکن جاگیردارانہ عہد میں سندھ کے مختلف حصوں میں بٹ جانے سے ادبی زبان کئی مقامی بولیوں کو ختم نہیں کر سکتی: سرائیکی (سیرو، بالائی سندھ میں)، تھریلی (تھر ریگستان کے نخلستانوں میں)، کچھی (کچھ جزیرہ نما میں)، لاسی (کراچی کے مغربی علاقے میں) وغیرہ۔

اس زمانے میں بڑے پائے کے سندھی شاعر اور نثر نگار پیدا ہوئے ☆: سید عبدالکریم، محمود ہاشم، مخدوم عبدالہ ناریا وارو اور شاہ عبداللطیف ☆☆ کی تصنیف ''شاہ جو رسالو'' آج بھی سندھ میں مقبول

ہے۔انہیں مسلمانوں اور ہندوؤں دونوں میں مقبولیت حاصل ہے،سندھی ان کی تخلیقات پر فخر کرتے ہیں اور انہیں دنیا کا ایک عظیم ترین ادیب سمجھتے ہیں۔

☆☆☆

سندھی اور پنجابی قومیتوں کے مقابلے میں پشتون اور بلوچی قومیتوں نے بہت بعد میں تشکیل پائی۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ جن علاقوں میں پشتون اور بلوچی آباد تھے ان کا تاریخی ارتقا مخصوص تھا۔

☆ پیر حسام الدین رشدی، ''سندھی ادب''۔

☆☆ سندھی ادب کے کلاسیکی شاعر شاہ عبدالطیف موجودہ حیدرآباد کے نزدیک گاؤں ہالہ حویلی میں 1690 میں پیدا ہوئے۔ 1751 میں ان کا انتقال ہوا۔ بھیت میں ان کا مزار ہے۔ وہ جراپوٹہ سید خاندان کی اولاد میں سے تھے اور صوفیوں میں انہیں مشائخ کا درجہ حاصل تھا۔

نشیبی سندھ اور پانچ دریاؤں کے دیس میں جاگیردارانہ قومیتوں کی تشکیل پہلے ہزار سالہ عہد عیسوی کے وسط میں ہوگئی تھی جہاں بڑی حد تک پہلے ترقی یافتہ معاشرہ اور جرگہ تعلقات موجود تھے۔ان کی نسبت جاگیردارانہ معاشرتی تعلقات کے قیام اور اس کے ساتھ ساتھ پشتون اور بلوچی قبائل کے جاگیردارانہ قومیتوں کے استحکام کا عمل بہت سست رہا۔

پشتونوں (جیسا کہ وہ خود اپنے آپ کو کہتے ہیں، آئندہ ہم بھی انہیں اسی نام سے پکاریں گے) یا افغانوں (جیسا کہ وہ یورپی ادب میں مشہور ہیں☆) کا نسلی شجرہ ان قدیم مشرقی ایرانیوں سے ملتا ہے جو (وادی سندھ کے مغرب میں) کوہ سلیمان کے دامن میں آباد تھے۔

یہاں مشرقی ایرانی قبائل کب آئے، اس پر ابھی تک حتمی فیصلہ نہیں ہوا ہے۔بعض عالموں کا دعوی ہے کہ ان کی آمد وادی سندھ کے مغربی پہاڑی علاقوں میں دوسری اور پہلی صدی قبل از مسیح سے شروع ہوگئی تھی۔اور اس کا سبب ساکا مس ساگیتیوں کے ہاتھوں یونانی باختری سلطنت کی تباہی تھا۔میری رائے میں یہ خیال صحیح نہیں ہے۔جیسا کہ پہلے بیان کیا جا چکا ہے پہلے ہزار سالہ عہد قبل از مسیح کے وسط ہی میں اس علاقے کی اکثر آبادی مشرقی ایرانی قبائل پر مشتمل تھی۔

1839 میں یورپی مورخ ڈورن نے لکھا کہ ہیروڈوٹس نے اپنی تصنیف ''استوریا'' (<<Istoria>>) میں جن پکتائیوں کا ذکر کیا ہے وہی پشتونوں کے مورث اعلی تھے۔سوویت عالم

خا نیکوف نے اس کی تر دید کی ہے اور زیادہ مورخ بھی اسے تسلیم نہیں کرتے۔ ویدی ادب میں پختا قبیلے یا قبائلی اتحاد کا ذکر ملتا ہے۔ اسی کو بنیاد قرار دے کر پشتونوں کا رشتہ اس سے بھی جوڑنے کی کوشش کی گئی ہے۔

یہ ہمارے عہد کی ابتدا میں برصغیر کی شمال مغربی سرحدوں پر رہنے والوں اور موجودہ افغانستان کے مشرقی علاقے میں آباد مختلف لوگوں (پاسیانی،

☆ افغان بھی آپ کو پشتون (پشتو کی جنوب مغربی بولیوں میں) یا پختون (شمال مشرق بولیوں میں) کہتے ہیں۔ اسی سے لفظ پٹھان ماخوذ ہے جو برصغیر ہندو پاکستان کے شمالی حصے میں آباد لوگوں کے لئے استعمال کیا جاتا ہے۔

پارسیوئی، پارس ایتائی) پر مشتمل تھے۔ قدیم مورخوں اور جغرافیہ دانوں کی تحریروں میں ان کے شواہد ملتے ہیں۔

میرے خیال میں جتنی دستیاب شہادتیں موجود ہیں ان کی بنا پر مندرجہ بالا قدیم قبائل یا قومیتوں کو پشتونوں کا براہ راست جدامجد قرار نہیں دیا جا سکتا۔ لیکن اس میں بھی کوئی شبہ نہیں کہ ان تمام قدیم قبائل اور لوگوں کی اولاد کا پشتون جا گیردارانہ قومیت کی تشکیل میں حصہ ہے۔ بہت پہلے ہند آریائی اور داردی نسلیاتی عناصر بھی پشتونوں کی نسل سازی میں شامل ہوئے۔ اس کے باوجود پشتو زبان میں ان حروف صحیح کی موجودگی جن کے بولنے میں زبان تالو سے لگتی ہے (جنہیں پس خمیدہ بھی کہا جاتا ہے)، اپنی صوتی وضاحت کے لحاظ سے ابتدائی نظام کے لئے بالکل بے گانہ تھے۔ اس سے معین دراوڑی نچلی پرت کی شمولیت کا پتہ چلتا ہے۔

میری رائے یہ ہے کہ پہلے ہزار سالہ عہد عیسوی کے وسط میں جب ایفطلی وفاق ٹوٹا تو بیشتر مشرقی ایرانی قبائل کا اتحاد تشکیل پایا، اور پشتون نسل سازی کی ابتدائی نسلیاتی پرت بنا۔ ہندوکش کے شمالی علاقوں میں اس وفاق کے چند قبائل نے ان قومیتوں کی تشکیل میں حصہ لیا جو آج وسطی ایشیا میں آباد ہیں اور بعض قبائل ترکمان اور ازبیک قومیتوں کی تشکیل کی بنیاد بنے۔ اس کا ایک ثبوت نسلیاتی ناموں کے نشانات ہیں۔ ترکمانوں اور ازبیکوں میں ایک نسلیاتی نام ابدال ملتا ہے جس کا سرچشمہ ایک ایفطلی قبائلی اتحاد کا نام ہے (ابدیل، ابدال)۔ ہندوکش کے جنوب میں ایفطلی قبائل کے دوسرے حصے کا مراعاتی رتبہ حکمراں خاندان کی فوجی قوت کی حیثیت سے ختم ہو گیا تھا۔ وہ کوہ سلیمان کے علاقے میں دھکیل دئے گئے جہاں

آبادی کم تھی، پانی کافی نہیں تھا اور چراگاہیں کم تھیں ☆۔ وہاں وہ قبائلی اتحاد کا ایک حصہ بن گئے، پشتون کی نسل سازی کا سنگ بنیاد یہی ہے۔

پشتون کی نسل سازی ایفطلیوں کی شرکت کا ثبوت یہ ہے کہ پشتونوں کے ایک سب سے بڑے قبائلی اتحاد کا نسلیاتی نام ابدالی (جو

☆ بابر نے ''بابرنامے'' میں کوہ سلیمان کے متعلق لکھا ہے: ''وہ بلند نہیں ہیں، بدصورت اور فضول ہیں۔ دنیا میں ایسے بدتر پہاڑ مشکل ہی سے ملیں گے،،۔

1747 سے درانی ہوگیا) تھا۔ اس کا ایفطلیوں کے نسلیاتی اسم ابدال سے تعلق ہے۔ انیسویں صدی کے شروع تک ہندوکش کے سیاہ پوش کافر تمام پشتونوں کو ابدال کے نام سے پکارتے تھے۔

یہ بھی ممکن ہے کہ کوشان تو خاری عناصر بھی پشتون نسلیاتی فرقے کی تشکیل میں شامل ہوئے۔ اس سلسلے میں یورپی مورخ مورگین اسٹیر نے یہ دلچسپ اور اہم بات لکھی ہے کہ اورمری لوگ پشتونوں کو نسلیاتی نام کاش سے جانتے تھے۔

اپنی نسل سازی کی ابتدائی منزل میں پشتون اپنے پڑوسیوں میں افغان کے نام سے مشہور تھے جس کی اشتقاقی ابتدا کسی کو نہیں معلوم ☆۔ جہاں تک لفظ پشتون یا پختون کا تعلق ہے جسے خود پشتون اپنے لئے استعمال کرتے ہیں وہ بعض عالموں کی رائے میں قدیم ایرانی لفظ پرسوا یا پارسا سے ماخوذ ہے جس کے معنی ہیں شہ زور لوگ، سورما۔

پہلے ہزار سالہ عہد عیسوی کے وسط کے ہندستانی ذرائع میں (پورنوں اور برھت سمیتھا جسے چھٹی صدی عیسوی میں ماہر نجوم وارا ھمی ہیرا نے لکھا تھا) ہمیں اپگا، اوگان نام کے لوگ ملتے ہیں جو غالباً برصغیر کی شمال مغربی سرحد پر رہتے تھے۔

سیوآن تسانگ کی سوانح عمری میں جس نے ساتویں صدی کے پہلے نصف میں شمال مغربی ہندستان اور مشرقی افغانستان کا دورہ کیا تھا اپوکان یا اپوکین ملک کا ذکر آتا ہے جو پہاڑی علاقے میں فالانا (بنوں) اور تساؤ کیوچھا (جاگوداز بولستان، غزنی) کے درمیان واقع تھا۔ چوں کہ اپوکین کی جائے وقوع کوہ سلیمان میں ہے اور اس ملک کو اپگا یا اوگان کے ساتھ مربوط کیا جا سکتا ہے۔ اس لئے یہ ممکن ہے کہ ہندستانی اور چینی دستاویزوں میں پشتونوں (افغانوں) اور ان کی بود و باش کے علاقے کا یہ پہلی بار بار ذکر

ہو۔

دوسرے ہزار سالہ عہد عیسوی میں پشتونوں کا علاقہ کوہ سلیمان کے درمیان ___ شمال میں قرم وادی اور جنوب میں گومل وادی کے درمیان تھا۔ دسویں اور گیارھویں صدیوں کے مسلمان مورخین نے اسی علاقے کو پشتونوں کا علاقہ کہا۔ چنانچہ ''حدود العالم'' کا مصنف ہندستان کے

☆ ازمنہ وسطی کے بعض مسلمان مصنفوں نے افغان کی جڑ فغان و غوغا بتائی ہے، یعنی شور کرنے والے۔

شمال مغربی حصے کے بارے میں لکھتا ہے کہ پہاڑوں میں (برکوہ) گردیز (غزنی کے شمال مشرق میں) سے وادی سندھ کے راستے پر ایک جگہ سوال یا سول ہے ''جہاں افغان رہتے ہیں،،۔ ابیرونی نے بھی وادی سندھ کے مغرب میں پہاڑوں کو افغان قبائل کا مسکن بتایا ہے۔

اگر مقامیاتی اسموں سے رہنمائی حاصل کی جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ قوم اور گومل کے درمیان کوہ سلیمان کے علاقے کو پشتون پشت کہتے تھے۔ انگریز مورخ ریورٹی نے اس نام کو بالکل بجا طور پر نسلیاتی نام پشتون سے ملایا ہے۔ اسی سے ان پشتون قبائلی کے اتحاد نے اپنا نام حاصل کیا جو وہاں ازمنہ وسطی کے شروع میں رہا کرے تھے۔

چودھویں اور سولھویں صدیوں کے ذرائع سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ اسی علاقے میں ساتویں اور آٹھویں صدی سے لے کر پندرھویں صدی تک پشتون نسلیاتی لسانی فرقے کی تشکیل ہوئی۔ اور یہی پشتون قبائل کا خاص مسکن تھا۔ ابن بطوطہ نے اپنی تصنیف ''تحفۃ النظر'' میں لکھا ہے کہ کوہ سلیمان افغانوں کا وطن ہے۔ یہ ٹھیک ہے کہ اس زمانے میں ہندوکش کے جنوب اور کوہ سلیمان کے مغرب میں بہت سے دوسرے علاقوں میں بھی افغانوں کی کئی آبادیاں تھیں لیکن صرف کوہ سلیمان ہی کو افغانستان کہا جاتا تھا۔ بابر نے بھی اس علاقے کو افغانستان کہا ہے اور اس کی تحریروں سے یہ بالکل واضح ہو جاتا ہے کہ سولھویں صدی کے شروع میں ہی بنوں اور کوہاٹ کو (اگر چہ وہاں پشتون آباد تھے) افغانستان میں شامل نہیں کیا جاتا تھا۔

محدود دستیاب شہادتوں کی بنا پر کہا جا سکتا ہے کہ پشتون نسلیاتی لسانی فرقے کی تشکیل پہلے اور دوسرے ہزار سالہ عہد عیسوی کے درمیان مکمل ہوئی۔ اس وقت ہی پشتون صوبے کی سرحدیں واضح

ہوئیں۔ اور اسی لئے پڑوسی لوگوں نے بھی اپنے لئے جغرافیائی نسلیاتی اصطلاح افغانستانی اختیار کی۔ ابتدائی پشتون ثقافت اور پشتونوں کی مخصوص نفسیاتی ساخت کے بنیادی عناصر خانہ بدوش اور نیم خانہ بدوش مویشی بانی کی معیشت کی بنا پر پروان چڑھے۔ پشتونوں کے سلسلے نسب کی داستانیں اسی دور سے وابستہ ہیں۔ اس طرح مشرقی ایرانی بولیوں کے ایک گروہ سے پشتو زبان نے طویل ارتقا کے بعد جنم لیا۔

ابھی تک پشتو زبان کی تاریخ کا گہرا مطالعہ نہیں کیا گیا ہے۔ لیکن یہ یقین کے ساتھ کہا جا سکتا ہے کہ وہ ان مشرقی ایرانی قبائل اور قومیتوں کی زبانوں اور بولیوں سے نکلی ہے جو پہلے ہزار سالہ عہد قبل از مسیح کے آخری نصف اور ابتدائی عیسوی صدیوں میں دریائے سندھ اور ہندوکش کے درمیان آباد تھے۔ دوسری زندہ زبانوں (منجانی اور اس کی یدگا منجی بولی، پامیر کی زبانیں ___ شوگ نان اور روشان اور ان کی بولیاں، یازغولام، اش کشی می اور واخن) کے پہلو بہ پہلو پشتو زبان مشرقی ایرانی بولیوں کے جنوب مشرقی ذیلی گروہ میں شامل ہے۔ وہ پورے گروہ میں منجانی اور پامیر کی زبانوں کے بین بین ہے۔ بعض عالموں کی رائے ہے کہ یہ سب زبانیں قدیم ساکا تو خاری بولیوں کی اولاد ہیں۔ دوسرا خیال یہ ہے کہ اس گروہ کا جس سے پشتو زبان پیدا ہوئی ساکا تو خاری بولیوں سے باہمی تعلق ممکن ہے لیکن وہ ان مشرقی ایرانی بولیوں کی مختلف شاخیں تھیں جو چوتھی صدی قبل از مسیح سے ساتویں اور آٹھویں صدی عیسوی تک موجودہ افغانستان اور وسطی ایشیا کے جنوبی علاقوں میں بولی جاتی تھیں۔

جب پیداآور قوتوں نے ترقی کی، جرگہ تنظیم ٹوٹ گئی اور آبادی بڑھنے لگی تو پشتون قبائل بھی بکھر گئے۔ پشتونوں کا ایک حصہ کوہ سلیمان کے اطراف میں مستقل بس گیا اور زمین پر کاشت کرنے لگا۔ دوسرے حصے کی معیشت بنیادی طور پر نیم خانہ بدوش مویشی بانی رہی اور تھوڑی بہت کاشتکاری بھی۔

ابتدا میں (تیرھویں اور چودھویں صدیوں میں) پشتون سطح مرتفع غزنی، پشاور میدان کے ایک حصے، کوہاٹ، بنوں اور کابل کے نزدیکی علاقوں آباد تھے۔ بعد میں چودھویں صدی کے آخر اور پندرھویں صدی میں پشتون قندھار پہنچے۔ پھر پندرھویں صدی کے آخر نصف اور سولھویں صدی میں سوات کے میدانوں، قرم اور پنج قورا میں آئے۔ پندرھویں صدی پشتون ژوب، لورالائی اور شول (کوئٹہ) کے خطوں میں داخل ہوئے۔ پشتونوں کو نقل مکان کرنے میں اس لئے آسانی ہوئی کہ چنگیز خاں اور اس کے جانشینوں کی سالاری میں منگول ترک حملوں کے سبب ان علاقوں میں آباد ایرانی تاجک اور ہندآریائی

لوگوں کا ایک حصہ صفحۂ ہستی سے مٹ چکا تھا اور دوسرا حصہ تیمور کی حکمرانی کے زمانے میں محفوظ مقامات میں منتقل ہو گیا تھا۔

پشتون قبائل کے دور دور پھیل جانے سے جرگہ کے رشتے ختم ہو گئے اور قبائل کا اتحاد قائم ہوتا رہا اور ٹوٹتا رہا۔ جب پشتون قبائل نے نئی سرزمینوں پر قبضہ کیا تو مقامی آبادی ان کی محکوم بن گئی۔ چنانچہ قبائل کے سرداروں اور بزرگوں نے ان حالات سے فائدہ اٹھایا اور محکوم لوگوں کو دبانے اور ان کا استحصال کرنے کے لئے جرگہ تنظیم استعمال کی۔ بعض اوقات زمین کی جدوجہد نے اتنی شدید شکل اختیار کر لی کہ خود کچھ پشتون قبائل نے اپنی آزادی کھودی اور وہ دوسرے زیادہ طاقتور قبیلے کے محکوم بن گئے۔ دوسری طرف پشتون معاشرے کے اندر نجی ملکیت اور معاشرتی عدم مساوات بڑھنے لگی۔ جنگوں میں جو مال غنیمت ہاتھ آتا اس کے بڑے حصے پر خان اور ملک قبضہ کر لیتے تھے۔ معاشرتی اور معاشی لحاظ سے اکثر ترقی یافتہ قبائل میں خان کے اقتدار پر خان خیل نے قبضہ کر لیا جو قبیلے کا خان خاندان ہوتا تھا۔ ایک اور عنصر جس نے نجی ملکیت میں عدم مساوات بڑھائی وہ اسلحات کی بنا پر مال غنیمت کی لوگوں میں تقسیم تھی۔ جو بہتر مسلح ہوتا تھا وہ زیادہ لوٹ حاصل کرتا تھا۔

جرگہ تنظیم کے خاتمے نے پشتون معاشرے کے نظریات پر بھی اثر ڈالا۔ اس سے بتدریج مذہب اسلام پھیلنے میں مدد ملی۔ دستاویزی تحریروں سے ثابت ہوتا ہے۔ کہ دسویں صدی عیسوی کے آخر تک پشتونوں کی اکثریت مسلمان نہیں تھی ☆۔ پشتونوں میں اسلام اس وقت تیزی سے پھیلا جب ان کی سر زمین پر غزنوی اور غوری خاندان حکمراں تھے۔ غزنوی اور غوری فرمانرواؤں کی لٹیری جنگوں میں پشتونوں کی اشرافیہ نے بھی حصہ لیا۔

پشتونوں نے اسلام اس لئے بھی قبول کیا کہ ملا جاگیردارانہ تعلقات کو جائز قرار دیتے تھے۔ اس سے ان تعلقات کے بڑھنے میں مدد ملی۔ یہاں یہ پیش نظر رکھنا ضروری ہے کہ پشتون معاشرے میں ملا سب سے پہلی مراعات شدہ جماعت بندی بنے۔ انہوں نے سب سے پہلے زرعی

☆ ''حدود العالم'' کے مصنف نے موجودہ جلال آباد کے نزدیک مقام نیہار (غالبًا ننہار، ننگ راهار) کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ اس کے فرمانروا کی تیس سے زیادہ بیویاں تھیں جو مسلمان، افغان اور ہندو تھیں (بیش از سی زن بسیا ردارد از مسلمانان واز افغانان واز ہندوان)۔ اگر اس وقت زیادہ تر

افغان مسلمان ہوتے تو افغان بیویوں کا مقابلہ مسلمان بیویوں سے نہ کیا گیا ہوتا۔
تعلقات کو ختم کیا جن کی بنیاد زمین کی مشترکہ ملکیت تھی اور سیری نظام قائم کیا جس کے تحت زمین ملاؤں کو بطور جاگیر دی جاتی تھی۔ یہ پشتونوں میں جاگیرداری نظام کی ابتدائی شکل تھی۔

جب پشتون سندھ اور ہندوکش کے درمیان وسیع علاقے پر پھیلے تو مقامی آبادی کے ساتھ ان کے تعلقات کی نوعیت نوع بنوع رہی۔ کبھی وہ پرامن رہے تو کبھی انہوں نے مسلح تصادموں کی شکل اختیار کی۔ ان رابطوں اور تصادموں کے نتائج بھی مختلف نکلے اور ان کا انحصار ہر علاقے کے مخصوص تاریخی حالات پر رہا۔ بعض اوقات ایسا ہوا کہ جو مقامی آبادی منگولوں کے قتل عام سے بچ گئی تھی اسے پشتونوں نے مار بھگایا اور اس کی زمینوں پر قبضہ کرلیا۔ بعض موقعوں پر مقامی آبادی کو پشتون قبائل یا قبائلی اتحاد کی اطاعت قبول کرنا پڑی۔ اکثر صورتوں میں پشتونوں نے مقامی آبادی کو جذب کرلیا اور وہ پشتون معاشرے کی جرگہ تنظیم کا ایک حصہ بن گئی ☆۔

گیارھویں اور تیرھویں صدیوں میں پشتونوں نے ان ترکی قبائل کو جذب کرلیا جو سطح مرتفع غزنی کی صحرانوردی کیا کرتے تھے۔ ان میں سب سے بڑا خلاج تھا ☆☆۔ اس ہی کی اولاد غلزئی ہیں جو پشتونوں کا ایک سب سے بڑا قبیلہ شمار کیا جاتا ہے۔

داستانوں کے مطابق تمام پشتون مشترک جدامجد قیس عبدالرشید کی اولاد ہیں اور غلزئی اس کی پوتی بی بی ماتو اور غور کے حکمراں کے بیٹے شاہ حسین کے ناجائز تعلقات کا نتیجہ ہیں ☆☆☆۔ نسلیاتی نام غلزئی پشتو لفظ ہے جس کے معنی ہیں گناہ کی اولاد۔ یہ نسلی سلسلہ اس قبیلے کے نام کی لوک لفظی ساخت (folk etimology) اور قبیلے

☆ بعض اوقات جب پشتون قبائل اپنی سرزمین سے بہت دور نکل گئے تو مقامی آبادی نے انہیں اپنے اندر جذب کر لیا۔ مثلاً موجودہ مغربی افغانستان میں ایرانی بولنے والی قومیتیں تائمینی اور جمشید پشتونوں سے تعلق رکھتی ہیں۔

☆☆ ''حدود العالم'' کا مصنف لکھتا ہے کہ خلاج غزنی کے علاوہ بلخ، تو خارستان، غزگانان (بلخ اور میرو کے درمیان) اور سیستان میں بست میں بھی آباد تھے۔

☆☆☆ ''حیات افغانی،،، از محمد حیات خاں۔

کی (ماں کی جانب سے) غیر پشتون ابتدا دونوں کا اظہار کرتا ہے۔ اور غور کے حوالے سے غالباً یہ ظاہر ہوتا ہے کہ غلزئی کے موروث خلاج کسی زمانے میں سطح مرتفع غزنی کے شمال میں رہا کرتے تھے۔

ترکلانی قبیلہ جو پندرھویں صدی میں خاخی قبائلی اتحاد میں مدغم ہو گیا تھا اس کے نسلی رشتے بھی ترکوں سے ملتے ہیں۔ ابتدا میں وہ قلات غلزئی میں صحرانوردی کیا کرتے تھے، پھر بعد میں شمال کی جانب بڑھے اور موجودہ باجور کے بڑے علاقے پر قابض ہو گئے۔

پشتونوں نے ترک قبائل یا ترک آبادکاروں کے چھوٹے چھوٹے گروہوں ___ غزنی اور کابل کے حکمرانوں کے پشتونوں سے آباد علاقے کی سرحد پر قائم کی ہوئی فوجی بوآبادیاں (جن کا مقصد سڑکوں اور تاجروں کے کاروانوں کی حفاظت کرنا تھا) ___ کے علاوہ منگول گروہوں اور ترک منگول خانہ بدوشوں کو بھی جذب کر لیا۔ یہ لوگ منگولوں کے حملوں کے وقت جنوبی افغانستان آئے تھے۔ ان میں سے ایک ترک منگول نسلیاتی گروہ کا وارث خٹک قبیلے کا ایک مغل جرگہ تھا۔

پشتونوں کی نسل سازی میں جنوبی افغانستان کی ترکی بولنے والی آبادی کے حصے کا ایک اور بڑا ثبوت یہ بھی ہے کہ پشتو میں ترکی زبان کے کافی الفاظ پائے جاتے ہیں۔ سوویت عالم اسلانوف نے اپنی تصانیف میں اس کا ذکر کیا ہے۔

دوسرے ہزار سالہ عہد عیسوی کے پہلے نصف میں تاجک اور ایرانی قومیتوں اور قبائل نے بھی، جو ہندوکش اور سلسلہ کوہ سلیمان کے درمیان اور سلسلہ کوہ سلیمان کے جنوبی علاقوں میں آباد تھے، پشتونوں کی نسل سازی پر کافی اثر ڈالا۔ ان میں سے بعض قومیتیں اور قبائل پراچی اور اورمری (یا بارا کی) زبانیں بولتے تھے جو مورخوں کے خیال میں جنوب مشرق افغانستان کی ابتدائی ایرانی زبانوں کی وارث تھیں۔

یہاں یہ ذکر کرنا ضروری ہے کہ کافی پشتون قبائل (جن میں آفریدی، اورکزئی، مینگل خٹک، خوگیانی وغیرہ شامل ہیں) کا جدامجد اورمری قبیلہ ہے۔ اس کا پہلی بار ذکر ہمیں ''بابر نامے'' میں ملتا ہے ___ ولایت کابل کی آبادی میں مختلف نسلیاتی گروہوں میں باراکی (اورمری) بھی بتائے گئے ہیں جو اپنی زبان بولتے ہیں☆۔

☆''بابرنامہ''، صفحہ 155۔

برطانوی تاریخ داں ایلفین اسٹون نے جو معلومات جمع کی ہیں ان سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ

اورمری انیسویں صدی کے شروع میں لوگار اور بوتخاک (کابل کے جنوب اور مشرق) میں رہا کرتے تھے۔اس کا بھی ثبوت ملا ہے کہ وہ کابل کے شمال علاقوں میں بھی آباد تھے۔اورمریوں کی آبادیاں کانی گورام (وزیرستان)،نوشہرہ، پشاور کے مشرق اور پنجاب کے جنوب مغرب (بھاولپور) میں بھی تھیں۔ اورمریوں نے کابلستان کو چھوڑ دیا اور یہ آبادیاں بسائیں (مثلاً اورمری لوگار کے بارک بارک سے کانی گورام آگئے)۔

آفریدی تیرہ میں رہتے تھے اوراسی کے نزدیک اورمری آباد تھے۔ یہ علاقہ تیرھویں صدی کے وسط تک افغانستان میں شامل نہیں ہوا تھا۔ جہاں تک شواہد کا تعلق ہے خود آفریدی اس سرزمین کے قدیم باشندے تھے۔اس سے ثابت ہوتا ہے کہ اس پشتون قبیلے کا نسلی رشتہ اورمریوں سے تھا اور دراصل اس قومیت کا ایک حصہ تھا جسے پشتونوں نے جذب کرلیا تھا۔ یہ بھی ممکن ہے کہ تیرہ کے پشتون قبائل کی تشکیل میں داردی بولنے والے قبائل کا بھی حصہ ہو۔اس کا ثبوت یہ ہے کہ جلال آباد کے جنوب مشرق کی کئی آبادیوں میں لوگ داردی بولی تیرھی بولتے ہیں۔ داستانوں کے مطابق چندسوسال پہلے لوگ تیرہ چھوڑ کر وہاں آباد ہوئے تھے۔لسانی ذرائع سے بھی اس کی تصدیق ہوتی ہے کہ پشتونوں کی نسل سازی میں داردی لوگ ایک بنیادی پرت کی حیثیت رکھتے ہیں☆۔

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ پشتونوں نے اورمریوں کو ازمنہ وسطی کے آخر میں تیزی سے جذب کیا۔ ہمارے عہد میں بھی یہ عمل ختم نہیں ہوا۔ جذب ہونے کے اس عمل کے دوران کانی گورام کے اورمریوں کا ایک حصہ پشتون قبیلے اور مار میں تبدیل ہوگیا۔ اس کا داستانی مورث اور مار تھا جسے شرھبون (شرف الدین) ولد ساربان ولد قیس عبدالرشید نے اپنا بیٹا بنالیا تھا۔

ایلفین اسٹون نے لکھا ہے کہ اورمریوں اور پشتونوں کے رسم ورواج یکساں ہیں☆☆۔
بوتخاک کے اورمری جوانیسویں صدی کے شروع

M. Shahidullah, <<The Philology of the Pashto Language>>, p. 25.*

M. Elphinstone, <<An Account of the Kingdom of Caubul...>>, p. 135.**

تک اپنی زبانوں میں بات چیت کرتے تھے بعد میں پشتو بولنے لگے۔ نوشہرہ کے اورمری بھی پشتو زبان میں گفتگو کرتے ہیں۔ لوگارتک میں پشتو نے اورمری کی جگہ لے لی ہے جہاں انیسویں صدی کی ابتدا میں اورمری بولنے والے تقریباً 8 ہزار کنبے تھے۔

کابلستان میں رہنے والی دوسری قومیتیں اور قبائل بھی جذب ہو گئے، مثلاً لام غنی جس کے ایک حصے نے پندرھویں اور سولھویں صدیوں میں یوسف زئی قبائل کی تشکیل اور وادی سوات کی فتح میں حصہ لیا تھا۔

پشتونوں نے ایک اور گروہ کو جذب کیا۔ اس کا ان ہندآریائی قبائل اور قومیتوں سے تعلق تھا جو کابل اور اس کے معاون دریاؤں کی وادیوں میں اور کوہ سلیمان اور سندھ کے درمیان علاقے میں آباد تھے۔ ان میں سے ایک قبیلہ پاشائی تھا جو مارکو پولو کے مطابق ہندوکش کے جنوبی دامن میں بسا ہوا تھا۔ مارپولو نے ان کے دیس کو پاسیائی (یا پاشیائی، پاشائی) بتایا ہے اور لکھا ہے کہ یہ لوگ اپنی زبان بولتے تھے، ان کا رنگ سیاہ تھا اور وہ بتوں کی پرستش کرتے تھے۔ سولھویں صدی کے شروع میں بابر نے بھی پاشائیوں اور ان کی زبان کا ذکر کیا ہے۔ مورگین اسٹیرنے کی قطعی رائے ہے کہ ایک زمانے میں پاشائی قبیلہ وادی کابل کے پورے بالائی اور وسطی علاقے میں رہتا تھا۔ اور اب وہ دریا کے شمال میں گل بہار اور وائی غیل کے درمیان صرف گھاٹیوں میں بسے ہوئے ہیں۔

یوسف زئی پندرھویں صدی میں سوات کے میدان میں پہنچے اور مقامی ہندآریائی آبادی کے ایک حصہ کو جذب کرلیا۔ بدھ یاتریوں کی دستاویزوں سے ثابت ہوتا ہے کہ یہ لوگ وہاں ہمارے عہد کی ابتدائی صدیوں میں آباد تھے۔ اگرچہ ان کا ایک حصہ مختلف وجوہات کی بنا پر عرصے تک ایک الگ گروہ رہا لیکن انیسویں صدی کے وسط سے وہ اپنے پڑوسی پشتونوں کی زبان، رسم ورواج اور مذہب قبول کرنے لگا۔

پشاور میدان کے شمال اور شمال مشرق کی پہاڑی وادیوں میں آباد ہندآریائی لوگوں کے پشتونوں میں ضم ہونے کا ثبوت ہمیں یوسف زئیوں کی نسبی روایات سے بھی ملتا ہے۔ ان کے مطابق ان کے تمام خیل ایک ہندستانی عورت کی اولاد ہیں جو اس سردار کی بیوی تھی جس کے نام سے یہ قبیلہ منسوب تھا۔

سندھ کے دائیں کنارے پر بنوں اور کوہاٹ میں رہنے والے جاٹ اور اعوان جو پنجابی زبان کی مغربی بولیاں بولتے تھے پشتونوں کی نسلی تشکیل میں شامل ہو گئے۔ بنوں میں تو پشتونوں نے پندرھویں

صدی ہی میں اس علاقے میں رہنے والے ایک نسلیاتی گروہ پوٹھی کو مکمل طور پر جذب کر لیا۔ اسی طرح قرم میں ایک مقامی قبیلہ بودنی بھی ضم ہو گیا۔

پشتون معاشرے میں جاگیردارانہ تعلقات دوسرے ہزار سالہ عہد عیسوی کے اول نصف میں قائم ہوئے اور انہوں نے تیزی سے فروغ پایا۔ اس عمل پر ان کے پڑوسی لوگوں (سب سے پہلے تاجکوں) نے بہت زیادہ اثر ڈالا جو صدیوں پہلے جاگیرداری نظام قائم کر چکے تھے۔ سوویت مورخ ریس نیر لکھتے ہیں کہ افغانوں کا معاشرتی ڈھانچہ بہت پسماندہ تھا لیکن پڑوسیوں سے مدت سے تبادلے اور تجارت کے ذریعے ان کے رابطے قائم ہوئے۔ اس کا سبب یہ تھا کہ ان کے پڑوس میں جاگیردارانہ نظام تھا اور اس کے زیر اثر افغانوں میں سے قبائل (پاوندوں) کا ایک گروہ ابھرا۔ اس گروہ نے ہندستان اور ایران اور وسطی ایشیا کے ملکوں کے درمیان عبوری تجارت کی خدمات میں مہارت حاصل کی۔

پڑوس میں ترقی یافتہ جاگیرداری نظام ہونے کا ایک نتیجہ یہ نکلا کہ جوں ہی جرگہ تنظیم ختم ہوئی ___ ایسا عمل جس نے پشتون قبائل کی بڑی تعداد کو زمین پر کاشتکار کی حیثیت سے آباد ہونے پر مجبور کیا ___ پشتونوں کے اپنے کوئی شہر نمودار نہیں ہوئے اور دستکاری، سودخوری اور تجارت غیر پشتونوں کے ہاتھوں میں رہی۔ اٹھارویں اور انیسویں صدی کے شروع تک شہر پشاور کی زیادہ تر آبادی ہند آرئی قومیتوں اور تاجکوں پر مشتمل تھی۔ شہر کابل میں جو لوگ رہتے تھے وہ زیادہ تر تاجک یا ہندستانی تھے۔ قندھار میں صنعتی اور پیداواری طبقہ تاجکوں اور ہندستانیوں پر مشتمل تھا۔

ترقی یافتہ جاگیردارانہ پڑوس کا پشتونوں میں جاگیردارانہ تعلقات کی تشکیل پر دوررس اثر ڈالنے کا ثبوت ہمیں پشتونوں کی معاشرتی سیاسی، معاشی اور ریاستی انتظامی اصطلاحات سے ملتا ہے۔

ان اصطلاحات کا تجزیہ سوویت عالموں اورانسکی اور رومودین نے اسلانوف کے تعاون سے کیا ہے۔ تجزیے کے بعد وہ اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ وہ تمام اصطلاحات جن کا تعلق کاشتکاری دستکاری اور شہری زندگی سے ہے، یا تو تاجکوں ایرانیوں سے حاصل کی گئی ہیں یا ہند آریائی لوگوں سے۔ یہاں تک کہ پشتون معاشرتی تنظیم کی کئی اصطلاحات بھی پڑوسیوں سے فراہم کی گئی ہیں۔ مصنفین نے ان بنیادی معاشرتی سیاسی اصطلاحات پر تحقیق کی جو پشتون معاشرے میں اٹھارویں صدی کے آخر اور انیسویں صدی کے شروع میں رائج تھیں۔ اس سے پتہ چلا کہ 200 عام ترین اصطلاحات میں سے 73 فیصدی ایرانی

تاجک ہیں (دستہ، کدخدا، سرغنہ، سرکردہ، ہمسایہ وغیرہ)، یا عربی الفاظ جو فارسی تاجک کے ذریعے حاصل کئے گئے (ملک، خیل، طائفہ، غلام، نواب وغیرہ)۔ 11 فیصدی اصطلاحیں ترک یا منگول زبانوں کی ہیں (بیراق، داروغہ، نوکر وغیرہ)۔ اور 9 فیصدی ملی جلی عربی ایرانی تاجک یا ترکی فارسی تاجک سے حاصل شدہ اصطلاحیں ہیں۔

پشتونوں میں جاگیردارانہ تعلقات کا ارتقا یکساں عمل نہیں تھا۔ اس کا اظہار مختلف قبائل میں معین امتیازی خصوصات سے ہوتا ہے۔

معاشرا اور معاشی لحاظ سے سب سے زیادہ ترقی یافتہ علاقے شمال مشرق اور جنوب مغرب میں واقع تھے۔ اول الذکر پشاور اور درہ خیبر کی جانب تھے جہاں سے وہ تجارتی شاہراہیں گزرتی تھیں جو کابلستان اور اس کے شمال مغربی ملکوں کو ہندستان سے ملاتی تھیں۔ جنوب مغربی علاقہ قندھار کاروانوں کی ان راہوں کی طرف تھا جو بولان اور گومل سے گزر کر ایران اور وادی سندھ تک جاتی تھیں۔ ان ہی علاقوں میں آباد پشتون قبائل سب سے پہلے تجارتی تبادلے میں شریک ہوئے اور انہوں نے پڑوسی جاگیری شہروں کے ساتھ معاشی تعلقات قائم کئے۔

آئندہ ان ہی قبائل کی جاگیری بنتی ہوئی جرگے کی اشرافیہ جاگیردار ریاستوں کے حکمرانوں کی انتظامی اور فوجی مشینری بن گئی۔ ان کی حکمرانی موجودہ جنوبی افغانستان اور سندھ کے مغربی ساحل پر تھی۔ خدمات کے عوض انہیں زمین کی جاگیریں، خطابات اور قیمتی تحائف عطا کئے گئے۔ اور جب انہیں محصول جمع کرنے اور فوجی دستوں کی سالاری کرنے کا اختیار ملا تو خانوں اور ملکوں نے اپنے اعزہ و اقارب پر مزید اقتدار حاصل کر لیا۔ اس طرح معاشرتی عدم مساوات بڑھی اور پشتون معاشرے میں جاگیردارانہ تعلقات نشو و نما پانے لگے۔ یہاں یہ ذکر کرنا ضروری ہے کہ سدزوئی جرگے کے بانی، ابدالی (درانی) خیل کے خان جس سے احمد شاہ درانی کا تعلق تھا اسد اللہ خاں (سدو) پوپلزئی (پیدائش 1558) کو سوافیوں نے ترقی کے زینے پر چڑھایا اور ابدالی قبیلے کی سرداری بخشی۔ اسد اللہ خاں اور اس کے جانشینوں کو بہت سی مراعات دی گئیں جن کے ذریعے انہوں نے اپنی حکمرانی مستحکم کی۔ چنانچہ اگر سدزوئی خواہ بڑے سے بڑا بھی جرم کرتے ابدالی انہیں سزا نہیں دے سکتے تھے۔

معاشرتی معاشی لحاظ سے ان ہی سب سے زیادہ ترقی یافتہ پشتون علاقوں میں پہلی پشتون

جاگیردارانہ ریاستیں قائم ہوئیں ــــ خٹکوں کی سرزمین پر اکوڑا اور تےری کی قلمروئیں۔ سترھویں صدی میں آفریدیوں کے علاقے میں ایک جاگیردارانہ قلمرو ابھری۔ اٹھارویں صدی کے شروع میں افغانستان کے جنوب مغربی علاقے میں پشتونوں نے اپنی الگ آزاد جاگیری ریاست قائم کی۔

جاگیردارانہ ریاستوں کے قیام کے ساتھ ساتھ پشتون معاشرہ متضاد طبقات میں بٹ گیا ــــ ایک طرف استحصال کرنے والے چوٹی کے لوگ (خان، ملک اور ملا) تھے اور دوسری طرف محکوم، حقوق سے محروم عوام ــــ ہمسایے یا فقیر۔

جب پشتون معاشرے نے جاگیردارانہ نظام اختیار کیا تو اس کی جلو میں شدید معاشرتی جدوجہد بھی شروع ہوئی۔ جیسا کہ ازمنہ وسطی میں ہر جگہ ہوا، یہ جدوجہد بھی سرکاری مذہب کے خلاف اصلاح کے پرچم تلے تھی۔

اس معاشرتی جدوجہد کی تاریخ کا ہمارا مطالعہ محدود ہے جس میں پشتون عوام (آزاد لوگ، تابع ہمسایے اور غالباً غلام) نے جاگیردارانہ اشرافیہ، ملاؤں اور بیرانی حملہ آوروں کے دانت کھٹے کئے۔ لیکن اس میں کوئی شبہ نہیں کہ روشنیہ تحریک (1560 تا 1638) تمام تحریکوں میں سب سے زیادہ توانا، طویل اور منظّم تھی۔ وہ واحد نہ تھی۔ بابر نے لکھا کہ پندرھویں صدی کے آخر اور سولھویں صدی کے شروع میں ان ہی علاقوں میں جہاں بعد میں روشنیہ کے بانی بایزید انصاری وعظ دیا کرتے تھے، ایک شاہ باز قلندر بھی رہتا تھا۔ ''اس قلندر نے کچھ یوسف زئیوں اور دل آزاکیوں کو بدعت اختیار کرنے کی ترغیب دی تھی۔ ہمارے حکم سے اس کی قبر کھود کر تہس نہس کر دی گئی،، ☆۔

پشتون معاشرے کے ادنی لوگوں کی معاشرتی جدوجہد کا نتیجہ یہ نکلا کہ تاریخی لحاظ سے نئے ترقی پسندانہ پیداواری تعلقات وسیع پیمانے پر بڑھ سکے۔ ان معاشرتی تحریکوں نے پشتون جرگہ کی بنیاد پر تقسیم کی دیواریں منہدم کر دیں، نسلیاتی استحکام میں مدد دی اور واحد پشتون قومیت کی تشکیل میں بڑا کردار ادا کیا۔

اٹھارویں صدی کے وسط تک ایک آزاد ریاست کے اندر پشتون سرزمین کے متحد ہونے کے لئے حالات پختہ ہو گئے تھے۔ اور ایسے اتحاد کے لئے جاگیردارانہ تعلقات نے داخلی حالات پیدا کئے۔ مناسب حال بیرونی اور وسطی ایشیا میں باہمی ہلاکت کے تصادم) نے سب سے بڑے قبیلے ابدالی کی

جاگیری اشرافیہ کے اس اتحاد کو قائم کرنے میں مدد دی۔ 1747 میں خودمختار پشتون ریاست ــــ سلطنت درانی وجود میں آئی۔

ایک آزاد جاگیری ریاست کا قیام پشتون معاشرے کی بالائی پرت کے مفاد کے عین مطابق تھا۔ اب اسے غریب لوگوں کے دبانے کے لئے اقتدار حاصل ہوگیا جن کا وہ استحصال کرتی تھی۔ ساتھ ہی وہ مغل اور ایرانی جاگیرداروں کو معاشرتی دولت بانٹنے سے آزاد ہوگئی۔ اس کے علاوہ ریاستی اقتدار کے بل پر یہ جاگیری پرت پڑوسی ملکوں اور عوام کے خلاف فوجی حملے کرسکی۔ ابتدا میں پشتون عوام آزاد پشتون ریاست کے قیام کا خیر مقدم کیا جو ایک مدت سے اپنے وطن کی آزادی کے لئے ایرانی اور مغل بادشاہوں سے لڑ رہے تھے۔

درانیوں کے عہد میں (1747 تا 1819) پشتون قبائل کی اشرافیہ اور چوٹی کے ملا بڑے جاگیرداروں کی مراعاتی جماعت بن گئے۔ زمین پر جاگیردارانہ دخل دو طرح سے بڑھا ــــ ایک طرف پشتون معاشرے کی بالائی پرت نے غیر پشتون (اور کچھ پشتون بھی) کسانوں کا استحصال کیا اور دوسری طرف درانی بادشاہوں نے زمین کی فیاضانہ جاگیری مراعات عطا کیں۔ پشتون معاشرے میں جاگیردارانہ نظام کی جڑیں مضبوط کرنے میں دو عناصر نے بھی مدد کی۔ یہ تھے قبائلی خانوں کو انتظامیے کے اختیارات سپرد کرنا اور احمد شاہ درانی کے فاتحانہ فوجی حملے۔

سولھویں اور اٹھارویں صدیوں کے درمیان زمانہ پشتونوں کی معاشرتی اور نسلیاتی تاریخ میں سنگ میل کی حیثیت رکھتا ہے۔ اسی دور میں وہ ایک جاگیردارانہ قومیت کی شکل میں مستحکم ہوئے۔

اس استحکام کے خاص علاقے وہ تھے جہاں شمال مشرقی اور جنوب مغربی حلقوں میں پشتون آباد تھے۔ پشاور اور قندھار کو ان کے بنیادی معاشی اور انتظامی سیاسی مرکز کہا جاسکتا ہے۔

جس عنصر نے پشتون نسلیاتی اتحاد کے خیال کو ابھارنے اور پروان چڑھانے میں مدد دی وہ پشتون قبائل کی مغل اور ایرانی بادشاہوں کے خلاف دو صدیوں سے زیادہ کی جدوجہد تھی جو ان کی سرزمین کو تاخت و تاراج اور لوگوں کا استحصال کرتے تھے۔ اسی جدوجہد کے دوران پشتونوں میں اتحاد کا احساس شدید ہوا اور اس کی خواہش بڑھی۔ یہ سب جانتے ہیں کہ بایزید انصاری کے بیٹے جو عرصے تک مغل بادشاہوں کے خلاف لڑتے رہے اپنے آپ کو "پشتونوں کے بادشاہ" کہتے تھے۔ ایسی شہادتیں بھی ملتی ہیں

جن سے ثابت ہوتا ہے کہ خود بایزید انصاری نے اپنے آپ کو پادشاہ پشتون اعلان کرنے کی کوشش کی تھی۔ مشہور شاعر خوشحال خان خٹک (1613 تا 1691) نے سترھویں صدی کی آٹھویں دھائی میں مغل بادشاہ کے خلاف مسلح بغاوت کی رہنمائی کی۔ انہوں نے اپنی نظموں کے ذریعے پشتونوں کو متحد ہونے کے لئے للکارا۔ احمد شاہ درانی نے بھی تمام پشتون قبائل کے اتحاد پر زور دیا☆۔

اٹھارویں صدی کے وسط میں متحد اور آزاد پشتون ریاست کے قیام کے سبب ایک حد تک جاگیری نراج اور قبائلی جھگڑے کم ہوگئے۔ زیر آبپاشی رقبے میں اضافہ ہوا، تجارت اور دستکاری بڑھی۔ جب پشتون ولایتوں میں، جو درانی سلطنت کے ستون تھیں، نسبتاً امن وامان اور سلامتی قائم ہوئی تو آبادی میں بھی اضافہ ہوا۔ ان حالات میں مختلف پشتون علاقوں کے درمیان ریاستی انتظامی اور معاشی رابطے مزید مضبوط ہوئے۔

پشتون علاقوں میں درانی سلطنت کے قیام اور جاگیری تعلقات کی تیزی سے نشوونما کے سبب شہروں کی تعداد بڑھنے لگی اور شہری زندگی پروان چڑھی۔ اس کی ایک اور وجہ یہ بھی تھی کہ خاص کر ہندستان سے ہزاروں قیدی دستکار لائے گئے تھے۔ اس کے علاوہ پشتون جاگیردار مفتوح علاقوں سے لوٹ کھسوٹ، محصول اور خراج کے ذریعے جو دولت سمیٹتے تھے اسے وہ شہروں ہی میں اڑاتے تھے۔ اس زمانے میں تجارت، خاص کر بیرونی تجارت نے بھی ترقی کی۔ اگرچہ تجارت پشتون سرداروں کے ہاتھ میں بھی تھی لیکن اس پر زیادہ تر ہندستانی تاجر حاوی تھے۔ ان میں سے اکثر نے بڑا سرمایہ جمع کر رکھا تھا۔ جیسے جیسے جنس زر کے تعلقات بڑھے اور مقامی تبادلے میں اضافہ ہوا اٹھارویں اور انیسویں صدیوں کے درمیان بڑے بڑے شہروں کابل، پشاور اور قندھار کے گرد مقامی منڈیاں ابھر آئیں۔

اس عہد کی ایک اور ممتاز خصوصیت پشتونوں کے ثقافتی اتحاد کی بالیدگی ہے۔ جنوب مغربی (قندھاری) اور شمال مشرقی (پشاوری) پشتو بولیوں کی بنیاد پر پشتو نے ادبی شکل اختیار کرنا شروع کی۔ اگرچہ اس وقت مذہبی زبان عربی اور ریاستی انتظامیے اور دفتری

☆ ''سب یک جان ہیں ___ ابدالی اور غلزئی۔ کتنا اچھا ہے کہ ان کی روحوں کا آئینہ شفاف ہے۔ تمام پشتونو، متحد رہو۔'' (دیوان احمد شاہ درانی)۔

کارروائی کی زبان فارسی تھی لیکن پشتو ادب بھی پھلا پھولا☆۔ سترھویں اور اٹھارویں صدیوں نے باکمال

شاعر پیدا کئے جن میں کاظم خاں شیدا، عبدالرحمٰن، عبدالحمید، افضل خاں خٹک قابل ذکر ہیں۔ اٹھارویں صدی کے آخر میں شاعر پیر محمد ککڑ نے پشتو کی پہلی قواعد لکھی ☆☆۔

اسی دور میں وقائع نگاری کی داغ بیل پڑی اور رواجی قانون کی تدوین کی گئی۔

ان تمام باتوں کے باوجود پشتون معاشرے میں پدرشاہی کی کافی باقیات اور جرگہ ادارے موجود رہے۔ان باقیات کے جاری رہنے کی ایک وجہ یہ تھی کہ پشتون عوام کی معاشی سرگرمی کی بنیاد خانہ بدوش اور نیم خانہ بدوش مویشی بانی رہی۔ آبادی کی خانہ بدوشوں اور آبادکاروں میں تقسیم (جو ماضی میں خانہ بدوش مویشی بانوں اور زمین پر آباد کاشتکاروں کے درمیان تقسیم کے سبب جاری رہی)، خانہ بدوش آبادی کے بسنے میں سست رفتاری (قابل کاشت زمین کی کمی کے سبب)، آباد زرعی علاقوں میں پدرشاہی دیہی برادری کی سخت جان ساخت ــــــ ان عناصر نے بھی جرگہ تعلقات کی باقیات قائم رہنے میں مدد دی۔

جرگے کی بنیاد پر آبادی کی تقسیم بدستور جاری رہی۔ اگرچہ اب پشتون قبائل خونی رشتے کے گروہ نہیں رہے تھے لیکن زمین اور پانی کی تقسیم لگان اور چنگی کا تعین اور وصولی، فوجی بھرتی وغیرہ عملاً جرگہ تنظیم کے اختیار میں تھی۔ ہر پشتون قبیلے کے پاس معین زمین ہوتی تھی جس میں چراگاہ بھی شامل تھی۔ اسے قلعہ بند کر دیا جاتا تھا۔ قلعے عام طور پر خانوں اور ملکوں کی رہائش گاہوں کا بھی کام دیتے تھے۔ قلعے پانی کی نالیوں کے سنگم یا ان کے منبع کے قریب تعمیر کئے جاتے تھے تاکہ قلعہ کا حکمراں ایک پورے زرعی علاقے پر اپنا قبضہ رکھ سکے۔ جرگہ تنظیم کی باقیات کے سبب پشتونوں میں مراعات یافتہ

☆ پشتو ادب کے ابتدائی نمونے پندرھویں صدی سے شروع ہوتے ہیں، مثلاً شیخ مالی نے تقریباً 1417 میں ''دفتر'' لکھا۔

☆☆ حال ہی میں سترھویں اور اٹھارویں صدیوں کی پشتو ادبی تصنیفات منظر عام پر آئی ہیں۔ انہیں دریافت کرنے اور شائع کرانے میں پشتو اکادمی پشاور کے سربراہ مولانا عبدالقادر کا بڑا حصہ ہے۔

اور غیر مراعات یافتہ قبائیلیوں کی تقسیم محفوظ رہی۔ آخر الذکر کو پشتو میں ہمسایہ یا فقیر کہتے ہیں۔ غلامی کے تعلقات کی باقیات کی طرح پدرشاہی غلامی جاری رہی۔ ایک انگریز افسر بے لیو نے یوسف زئیوں کے متعلق اپنی رپورٹ میں لکھا کہ اکثر خانوں اور ملکوں کے پاس غلام تھے، بعض اوقات ان کی تعداد سو سے بھی زیادہ تھی ☆۔ دوسرے پشتون قبائل میں بھی غلام ہوتے تھے جن کی محنت کاشتکاری اور گھریلو

کاموں میں استعمال کی جاتی تھی۔

زمین کی باقاعدہ تقسیم (ویش) کا ہنوز رواج تھا۔ جرگہ ___ خاندان کے سربراہ مردوں کا جلسہ خیل کے تمام اہم مسائل کو حل کرتا تھا۔ اگرچہ تمام پشتون مسلمان تھے اور پشتون معاشرے میں شریعت کے تدوین کئے ہوئے قوانین اور اصول بتدریج پھیلائے گئے تھے، لیکن جن علاقوں میں پشتون آباد تھے وہاں زیادہ تر رواجی قانون کا راج تھا۔ چھوٹے موٹے معاملات گاؤں کے جرگے میں طے ہوتے تھے اور زیادہ اہم مسائل ملک یا خان طے کیا کرتے تھے۔ بدلہ ___ وہ رسم جس کے مطابق ذاتی جسمانی ضرر یا جائداد کے تلف ہونے کا بدلہ لیا جاتا ہے ___ بدستور جاری رہا۔

جرگہ نظام کی باقیات کا جاری رہنا کسی حد تک پشتون جاگیری اشرافیہ کے مفاد میں تھا کیونکہ ان باقیات سے خانوں اور ملکوں کے ہاتھوں عام لوگوں کا استحصال فاش نہیں ہوتا تھا اور انہیں یہ حق ملتا تھا کہ اپنی قزاقانہ جنگوں کے لئے قبائلی دستوں (لشکر) کی فوجی قوت استعمال کریں۔ خان اور ملک بتدریج عام لوگوں سے محصول اور چنگی جمع کرنے لگے جو پہلے پورے قبیلے میں تقسیم کی جاتی تھی۔ جو مال غنیمت مشترکہ جنگی حملوں سے لوگوں کے ہاتھ آتا تھا اس پر بھی محصول عائد کر دیا گیا۔ پہلے جو محصول ضروریات عامہ کے لئے جمع کیا جاتا تھا وہ اب خانوں اور ملکوں کی جیبوں میں جانے لگا۔ انتہائی ترقی یافتہ علاقوں میں بھی خان اور ملک آزاد لوگوں سے ٹیکس وصول کرنے لگے۔

جب خان جاگیردار فرمانروا بن گئے تو بعض علاقوں میں پشتونوں کی جرگے اور قبیلے کی بنیاد پر تقسیم کی جگہ علاقائی تقسیم نے لے لی۔

H.W Bellew, <<A General Report on the Yusufzais>>, p. 184.*

جرگہ تقسیم باقیات کی حیثیت سے پشتونوں میں اٹھارویں صدی کے آخری نصف تک قائم رہی۔ اس کا ثبوت یہ ہے کہ درانی بادشاہ اور ان کے جاگیردار قبائل کو بنیادی طور پر انتظامیہ کی مالی اور فوجی وحدتیں خیال کرتے تھے۔ بعض موقعوں پر انہوں نے جرگے کے بجائے دوسری بنیاد پر پشتونوں کو تقسیم کیا۔ مثلاً احمد شاہ نے یوسف زئی، ترکلانی، مہمند، خٹک اور دوسرے مشرقی قبائل کا ایک واحد گروہ بنایا اور اسے بر (بالا) درانی کا نام دیا۔ اسی وفاق کے زمانے میں درانی سلطنت منہدم ہوئی۔ احمد شاہ نے بارک

زئی جرگے سے اچک زئی جرگہ اس لئے الگ کر دیا کہ اس جرگے کے طاقتور سردار کمزور ہو جائیں۔خود غلزئی جرگوں (جن کے ساتھ درانیوں کے رقابت تھی) کے سردار بن گئے۔ یہاں یہ بات قابل ذکر ہے کہ غیر پشتونوں کو بھی درانی کا لقب عطا کیا جاتا تھا۔ چنانچہ 54_1753 میں یہ لقب کا بشان کے ایک کرد قبیلے کو دیا گیا۔اٹھارویں صدی کے وسط میں فوجی خدمات کے عوض یوسف زئی کا لقب ہندستان کی ایک ضمنی ذات جمبل کو دیا گیا جس کا آبائی پیشہ چوب تراشی تھا۔

بطور خلاصہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ سولھویں اور اٹھارویں صدیوں میں پشتون قبائل ایک ایسی جاگیری قومیت میں مستحکم ہو گئے جس کا علاقہ، زبان اور ثقافت مشترکہ تھے اور جسے اپنی شناخت کا احساس بھی مکمل ہو گیا تھا۔

☆☆☆

قبل از مسیح کی صدیوں کے آخر اور پہلے ہزار سالہ عہد عیسوی کے اول نصف میں بلوچستان کی آبادی تین بڑے بڑے نسلیاتی گروہوں پر مشتمل تھی: جنوب مشرق میں ہند آریائی، مشرقی اور شمالی علاقوں میں ایرانی اور دراوڑی جو زیادہ تر مرکزی خطے☆ کے علاوہ کرمان (کیرمان) کے مشرق اور جنوب میں بھی رہتے تھے۔

☆الاصطخری کتاب ''مسالک الممالک'' میں لکھتے ہیں کہ خانہ بدوش البدھہ بت پرست لوگ کچھ گنڈاوا میں رہتے تھے۔شاید مراد البرھہ (بروھی) سے ہو۔

بلوچی نسلیاتی لسانی فرقے کی تشکیل کی تاریخ اس وقت سے شروع ہوتی ہے جب خانہ بدوش ایرانی قبائل کا ایک گروہ بحیرہ خزر کے جنوبی ساحل پر اپنی آبائی سرزمین کو چھوڑ کر کرمان اور مکران میں آباد ہوا تھا۔ یہ نقل مکان کیوں اور کب ہوئی، یہ واضح نہیں ہے۔ ہو سکتا ہے کہ جب خسرو اول انوشیرواں نے ان قبائل کے خلاف اپنی فوجی انوشیرواں نے ان قبائل کے خلاف اپنی فوجی مہمیں شروع کیں جو آج کے گیلان اور آزربائجان میں آباد تھے، یا شمالی ایران میں ایفطلیوں کی یلغاروں کی ابتدا ہوئی تو یہ نقل مکان عمل میں آئی ☆۔اگر آخر الذکر صحیح ہے تو پھر قیاس کیا جا سکتا ہے کہ ان پرانی قبائل نے تقریباً پانچویں اور چھٹی صدی کی ابتدا میں ترک وطن کیا تھا جو بلوچوں کی نسل سازی کی بنیاد بنے۔

یہ بھی ممکن ہے کہ بلوچوں کی تشکیل میں دوسرے عناصر کا بھی حصہ ہو اور نقل مکان بہت پہلے ہو چکی

ہو۔اس سلسلے میں اسٹرابون لکھتا ہے کہ کرمان کی آبادی کا ''اخلاق اور بولی اکثر ایرانی اور میدیائی ہے،، ☆☆ (نیچے خط کشیدہ مصنف کا ہے)۔ یہ اہم اشارہ ہے۔سوویت عالم اورانسکی نے اپنی تصنیف ''ایرانی لسانیات'' کی تمہید میں یہ خیال ظاہر کیا ہے کہ بلوچی زبان کی ابتدا ''قدیم ایرانی بولی سے ہوئی جو زیادہ تر میدیا اور پارتھیا میں رائج تھی،،۔یعنی ایرانی دنیا کے شمالی اور شمال مغربی علاقوں میں۔اسی بنیاد پر اس حقیقت کی تائید میں ٹھوس دلائل پیش کئے جا سکتے ہیں کہ بحیرہ خزہ کا جنوبی علاقہ بلوچوں کے جدامجد کا ابتدائی وطن تھا۔ یہ لوگ جو بولیاں بولتے تھے۔ان میں اور پارتھی زبان میں چند خصوصیات مشترک ضرور ہیں لیکن ان کے اپنے مخصوص عناصر زیادہ ہیں، جو انہیں پارتھی سے ممتاز کرتے ہیں۔ یہ رائے کہ یہ بولیاں میدیائی سے قریب ہیں صحیح معلوم ہوتی ہے۔ایران کے جنوب مغربی علاقے سے بلوچی قبائل کی جنوب مشرق کی جانب پیش قدمی کا ثبوت بلوچی اور ایرانی بولیوں فاروی اور خوری (وسطی ایران میں بیابانک، جنوب میں دیشت کاور) کے درمیان مشابہت ہے۔

M. Longworth Dames, <<The Baloch Race...>>, p. 29.*

strabon, <<Geographika>>, XV, 2,14. **

اور اس مشابہت کی وجہ یہ ہے کہ اس علاقے میں بلوچی قبائل مدت تک آباد رہے تھے☆۔

بلوچ (بیلوچ، بلوچ) نسلیاتی نام کی ابتدا اور اسمیاتی جڑ ہنوز مبہم ہے۔مغربی مورخ ہرز فیلڈ کا خیال ہے کہ اس کا مخرج میدیائی لفظ برزاواچیا ہے جو بعد میں برزاواک ہو گیا جس کے معنی ہیں بھاری چیخ، نامراواک کے مقابلے میں جس کا مطلب ہے گفتگو کا نرم اور شائستہ لہجہ☆☆۔اسمیاتی ابتدا کی ایک اور تاویل انگریز عالم لونگ ورتھ ڈیمس نے پیش کی ہے۔ان کا خیال ہے کہ ''بلوچ'' ''مرغ کی کلغی'' کی عرفیت ہے۔اس کے شواہد ملتے ہیں کہ ازمنہ وسطی کی ابتدا میں بلوچ اپنے خودوں کو کلغیوں سے سجاتے تھے۔ہوسکتا ہے کہ ان کے نسلیاتی نام کی ابتدا مرغ پرستی سے شروع ہوئی ہو۔

مسلم مورخوں نے بلوچوں کا علاقہ کرمان کے پہاڑوں اور میدانوں کو بتایا ہے (ہم پہلے ان علاقوں میں قدیم قبل از ہند یورپی آبادی کے آثار کے بارے میں لکھ چکے ہیں) جو وہاں ساتویں صدی کے وسط میں رہتے تھے☆☆☆۔دسویں صدی تک بلوچ بیشتر کرمان کے مغربی اور شمالی علاقوں میں آباد تھے۔عرب فوجی مہموں کی تاریخ میں ہمیں اس کا ذکر ملتا ہے۔سیستان اور مغربی مکران میں بھی بلوچوں

کی آبادیاں تھیں۔

خانہ بدوش اور نیم خانہ بدوش مویشی بانی بلوچوں کا خاص پیشہ تھا۔

جب عربوں نے ایران کے جنوب مشرقی علاقے کو فتح کرلیا تو بلوچوں میں بتدریج اسلام پھیلنا شروع ہوا۔ بلوچی معاشرے میں نئے مذہب کے جذب ہونے میں کافی عرصہ لگا۔ قبل از اسلام کے بعض عقائد کافی بلوچوں میں پھیلے رہے۔ المقدسی نے دسویں صدی

R.N. Rrye, <<Remarks on Baluchi History>>, pp.48_50.*

E. Herzfeld,<<Zprpaster and His World>>, Vol. II, pp. 734_735.**

☆☆☆ الطباری، ''تاریخ الرسول ولملوک،،، جلد 5، صفحات 2703__2705۔

میں کتاب ''احسان التقاسم'' میں لکھا کہ بلوچ ''صرف نام کے مسلمان ہیں،،۔

آج کے ان پاکستانی اور ایرانی علاقوں میں جہاں بلوچ بسے ہوئے ہیں عرب نائبین کی حکمرانی دسویں صدی کے آخر تک رہی (یہ زیادہ تر ساحلی خطوں تک محدود تھی۔ جہاں تک ان علاقوں کے مرکزوں کا تعلق ہے تو اقتدار بس قلعہ بند شہروں کی دیواروں تک محدود تھا جہاں حفاظتی فوج رہتی تھی)۔

976 تک عربوں کا بلوچستان کے بعض علاقوں پر قبضہ رہا۔ ابن خوقل نے لکھا ہے کہ ایک عرب نائب قزقانان (قائے قانان، قیقان، جواب قلات ہے) کا حکمراں تھا۔ اسی زمانے میں غزنی کے بادشاہ سبکتگین (97_977) نے اس کے شمال مشرقی علاقے پر قبضہ کرلیا۔ بعض ذرائع سے معلوم ہوتا ہے کہ سبکتگین کے جانشین جھالاواں میں خضدر کے حکمراں رہے اور ان میں سے ایک کو محمود غزنوی نے سخت لڑائی کے بعد شکست دی۔ یہ بھی مشہور ہے کہ مکران کا نواب اس بادشاہ کو خراج دیتا تھا☆۔

جب بلوچوں نے سیستان اور خراساں پر یورشیں کیں تو غزنویوں نے ظلم وتشدد سے اس کا بدلہ لیا۔ گیارھویں صدی کے شروع میں غزنوی فوج کرمان بھیجی گئی جہاں اس نے جیت کے قریب بلوچوں کو زبردست زک دی ☆☆۔ ان واقعات کی جلو میں گیارھویں صدی کے وسط میں ترکمانوں سلجوقیوں نے شمال مشرقی ایران میں داخل ہونا شروع کردیا۔ چنانچہ سیستان اور شمالی کرمان کو چھوڑ کر بلوچی قبائل اس کی مشرقی جانب شمالی مکران میں اور مغربی جانب بنجبور (موجودہ پنج گور) میں تیزی سے آنے لگے۔ اس

وقت وہاں پہلے سے بلوچی بستیاں موجود تھیں☆☆☆۔

اپنی نسلیاتی تاریخ میں موجودہ بلوچستان میں بلوچوں کی باہر سے آمد سنگ میل کی حیثیت رکھتی ہے۔ یہی وہ علاقہ ہے جہاں گیارھویں اور تیرھویں صدیوں کے دوران مقامی قبل از ہند یورپی،

☆ابوالفضل بے حقی،''تاریخ مسعودی،،،صفحات 235_236-

☆☆نظام الملک،''سیاست نامہ،،،صفحات 68_72-

☆☆☆المقدسی،''احسان التقاسم،،،صفحہ 478۔

ہند آریائی اور ایرانی آبادی کے ساتھ گھل مل کر اس نسلیاتی لسانی فرقے نے تشکیل پائی جو بعد میں بلوچی نسل سازی کی بنیاد بنا۔ یہاں ایک واقعہ بیان کرنا بے موقع نہ ہوگا جسے بلوچی عوامی گیتوں اور سلسلہ نسب کی داستانوں کے محققین نے لوگوں تک پہنچایا ہے۔ ان کے مطابق بلوچوں کا مورث اعلی میر جلال خاں تھا۔ اس کے چار لڑکے (رند، لشاری، ہوت اور کورائی) اور ایک لڑکی (جاتو) تھی۔ بلوچوں کے سب بڑے قبائل کے نام ان ہی سے منسوب ہیں جو گیارھویں اور بارھویں صدی سے تعلق رکھتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ یہ وہی زمانہ ہے جب بلوچی قبائل کے خاص وفاق قائم ہوئے جو بعد میں بلوچی جاگیردارانہ قومیت کا مرکز بنے۔

جب غزنویوں اور غوریوں نے قزاقانہ فوجی مہمیں چلائیں اور خاص کر منگولوں نے یورشیں کیں جن کا ایک حصہ (نکوداری اردو☆) تیرھویں صدی کے وسط میں مغربی افغانستان اور مشرقی ایران میں آباد ہو گیا تھا تو ان کا نتیجہ تباہ کاریوں میں نکلا___ بلوچستان کے زرعی نخلستان بنجر بن گئے، کاشتکار آبادی کی تعداد گھٹ گئی اور وہاں جو چھوٹی چھوٹی جاگیری ریاستیں فروغ پا رہی تھیں (بلوچستان کے مشرقی حصہ میں توران جس کا دارالخلافہ خضدر تھا، قندابیل___ موجودہ گنداوا، مغربی مکران میں کیچ وغیرہ) زوال پذیر ہونے لگیں۔

ان حالات کے سبب بلوچی قبائل مکران کے شمال اور شمال مشرق بعید میں پنجاب اور سندھ کی سرحدوں تک منتشر ہو گئے۔ وسطی بلوچستان (قلات کی سطح مرتفع) میں بلوچوں نے بروھی قبائل کے ہاتھوں شکست کھائی۔ اس کے بعد وہ دو حصوں بٹ گئے۔ ان میں سے ایک چودھویں صدی کے شروع میں جنوبی سندھ میں آ گیا۔ اور دوسرے حصے نے شمال میں سطح مرتفع قلات کے کنارے کنارے چل کر اس

خطے میں بود وباش اختیار کر لی جو اب ڈھرہ جات کے نام سے مشہور ہے۔ تقریباً 1470 میں ملتا کے فرمانرواشاہ حسین لنگاہ (1467 تا 1502) نے دریائے سندھ کے مغربی کنارے

☆ اردو تر کی لفظ ہے جس کے معنی ہیں لشکر، فوج، اسی سے انگریزی لفظ hoardes اخذ کیا گیا ہے۔

بلوچوں کو آباد ہونے کے لئے زمینیں عطا کیں۔ پندرھویں صدی کے آخر میں اسمعیل خاں، فتح خاں اور غازی خاں نے وہاں تین شہر آباد کئے جو آج بھی ان ہی کے ناموں سے پکارے جاتے ہیں۔

بلوچوں کے کرمان اور سندھ کے درمیان ایک وسیع علاقے پر بکھر جانے کی وجہ یہ ہے کہ ان میں جرگہ تنظیم ٹوٹنے لگی تھی اور جا گیردارانہ تعلقات تشکیل پا رہے تھے۔ اس تبدیلی کی جڑ پیداآور قوتوں کی آہستہ لیکن استوار نشو ونما تھی۔ جب آبادی بڑھی تو چراہ گاہیں کم پڑنے لگیں۔ بلوچ مجبور ہو گئے کہ نئی زمینوں کا رخ کریں۔ باہمی قبائلی جنگیں اور تصادم بھی بڑھ گئے۔ ان سے مفتوح قبیلے کو یا تو کامران قبیلے کی اطاعت قبول کرنا پڑی یا پھر اپنی سرزمین کو خیر باد کہہ کر وہ نئی زمین کی تلاش میں نکل پڑا۔ نظام الملک اپنے ''سیاست نامے'' میں لکھتے ہیں کہ فن حرب جو دسویں اور گیارھویں صدیوں میں بلوچوں کی زندگی پر غالب تھا جلد ہی عزت وسطوت کا نشان بن گیا۔

زمین کی کاشت کا تنزل، آبپاشی کے نظاموں کی تباہی اور آباد لوگوں کی تعداد میں کمی منگولوں کے حملوں اور پھر جا گیری نراج کی جلو میں آئے۔ اس سے بلوچستان کی معیشت میں خانہ بدوش اور نیم خانہ بدوش مویشی بانی بہت زیادہ بڑھ گئی۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ بلوچی قبائل کی اشرافیہ کی سیاسی قوت، اقتدار اور اثر زیادہ ہو گیا۔ ان تمام باتوں کا مشترکہ انجام یہ ہوا کہ بلوچستان کی سرزمین پر جا گیردارانہ تعلقات کے ارتقا کی رفتار سست پڑ گئی، اس علاقے کی آبادی کا جا گیری قومیت میں استحکام نسبتاً دیر سے ہوا اور جرگہ زندگی کی روایات اور رشتوں کی باقیات مستقبل میں بھی معاشرے میں پیوست رہیں۔ ان باقیات کے جاری رہنے کا بھی ایک سبب تھا۔ بلوچوں کی عرصے تک اپنی کوئی ریاست نہیں تھی، اس لئے جرگہ تنظیم ہی وہ قوت تھی جو پڑوسی جا گیردار حکمرانوں اور ان کے نائبوں کی چیرہ دستیوں سے بلوچوں کی جان و مال کو محفوظ رکھ سکتی تھی۔ اس لئے یہ باقیات مدت تک قائم رہیں۔ نوجوانوں کے فوجی دستے (جو جرگے کے اصول پر منظم کئے جاتے تھے) بلوچی قبائل کی ابھرتی ہوئی جا گیردار اشرافیہ کی قزاقانہ مہموں میں بھی کام آتے

تھے۔

میری رائے میں بلوچی جاگیردارانہ قومیت کی تشکیل تیرھویں اور پندرھویں صدیوں میں اس وقت شروع ہوئی جب قبائلی اتحاد ایک وسیع علاقے پر پھیل گئے اور مقامی آبادی کی زمینوں پر قبضہ کر کے وہ آباد ہونے کا مطلب یہ تھا کہ جرگے کے رشتے ٹوٹے۔ جو اتحاد پہلے خون اور شادی کی بنیاد پر قائم ہوتے تھے ان کی جگہ علاقائی اتحادوں نے لے لی۔ سوویت عالم پیکولن نے لکھا ہے کہ جب سولھویں صدی کے آخر میں بلوچ مشرقی علاقوں میں آباد ہو کر کاشت کرنے لگے تو واحد فرقے کی تشکیل ہونے لگی۔ بلوچی قبائل کی جرگہ اشرافیہ بھی آہستہ آہستہ مربوط جاگیری جماعت بندی بننے لگی۔ اس کا سبب یہ تھا کہ بلوچی اشرافیہ بہترین چراہ گاھوں اور قابل کاشت زمینوں پر قبضہ کر کے مقامی زرعی آبادی اور مفلس خانہ بدوش لوگوں دونوں کو اپنا ماتحت بنانے لگی۔ قبیلے اور اس کی ذیلی تقسیموں کی سرداری غضب کر کے موروثی بنا دی گئی۔ اور سارا اقتدار ''پھگ لوگ'' (لفظی معنی ہیں پگڑی کا مکان، خان کے اقتدار کا نشان) کے ہاتھ میں آ گیا، یعنی قبیلے کے خان خاندان میں۔ بلوچی قبائل کی فوجی فوقیت کے سبب ان کے جرگے کی اشرافیہ علاقے کے جاگیردار طبقے کی حکمراں پرت بننے لگی۔ منجملہ اور باتوں کے یہ اس سے بھی ثابت ہوتا ہے کہ کرمان اور سلسلہ کرتھار اور کوہ سلیمان کے درمیان جو علاقہ دسویں اور گیارھویں صدیوں میں سندھ کا حصہ تھا وہ آہستہ آہستہ بلوچستان میں شامل ہو گیا۔

بلوچوں میں جاگیردارانہ تعلقات کا ارتقا مختلف قبائل میں جدا جدا تھا۔ اس سلسلے میں پڑوس کی آبادیوں نے جنہوں نے جاگیرداری بہت پہلے اپنا لی تھی بہت اثر ڈالا۔ وہاں ترقی یافتہ جاگیردارانہ تعلقات کی وجہ سے بلوچ تجارت اور تبادلے میں شامل ہوئے۔ جاگیری ریاستوں کے حکمرانوں نے بلوچوں کی فوجی قوت اپنے مفاد میں استعمال کی، انہیں قزاقانہ حملوں اور مہلک جنگوں میں گھسیٹا۔ بلوچی قبائل کی جرگے کی جاگیردار بنتی ہوئی اشرافیہ کو لوٹ میں حصہ ملا اور ساتھ ہی زمینیں اور اعزاز بھی۔ جاگیری ریاستوں کے حکمرانوں کی اس پالیسی کا نتیجہ یہ نکلا کہ بلوچی معاشرے کے اندر سماجی عدم مساوات بڑھی، جاگیردارانہ تعلقات نے فروغ پایا اور قبل از جاگیرداری پدرشاہانہ جرگہ اداروں کو بدلا یا کمزور بنا دیا۔

بلوچوں کے نسلیاتی استحکام کا خاص علاقہ قلات سطح مرتفع کے شمال مشرق اور جنوب مغرب میں تھا۔ بلوچستان کے جنوب مغرب میں بم پور، کاسر کنڈ، کیچ اور پنج گور کے نخلستان معیشت اور ثقافت کے

خاص مرکز تھے اور انہوں نے خوب ترقی کی۔ مارکو پولو نے مشرق کی طویل سیاحت کے دوران ان علاقوں کی بھی سیر کی۔ اس نے دیکھا کہ یہاں کی آبادی زمین پر کاشت (چاول اور گیہوں) اور مویشی بانی کرتی ہے۔ اس نے تجارت اور دستکاری میں کوئی ابتری نہیں دیکھی۔ وہ اپنی خودنوشت میں لکھتا ہے: ''یہاں سمندر یا خشکی سے بڑی تعداد میں تاجر آتے ہیں۔ وہ اپنا مال لاتے ہیں اور واپسی پر مقامی اشیا ساتھ لے جاتے ہیں''۔ اس زمانے میں پنج گور (بنجبور) جنوب مغربی بلوچستان میں سب سے بڑا شہر تھا۔ مسلم مورخوں نے بتایا ہے کہ اس علاقے کی معیشت کا بڑا حصہ کھجوریں تھیں اور کاشت کی بنیاد نہری آبپاشی۔

کچھ گنڈاوا کا زرعی علاقہ جس کے قطعات زرخیزی کے لئے مشہور تھے اور سلسلہ کوہ سلیمان کے دامنی خطے شمال مغرب کے بنیادی معاشی اور ثقافتی مرکز تھے۔ اور اس علاقے کا دارالخلافہ قندابیل (موجودہ گنڈاوا) تھا۔

بلوچی قبائل کا نسلیاتی استحکام ہونے کے ساتھ ساتھ بلوچوں نے مقامی آبادی کو بھی جذب کیا۔ جن قومیتوں اور قبائل نے بلوچی جاگیردارانہ قومیت کی تشکیل میں حصہ لیا ان میں ایرانی بولنے والے تاجک، اورمری اور پشتون، ہندآریائی لوگوں میں سندھی اور پنجابی، دراوڑی بولنے والوں میں بروھی اور عرب آبادکاروں کی اولاد تھے۔

بعض عالموں کا خیال ہے کہ موجودہ ایک سب سے بڑا بلوچی قبیلہ ماری پشتونوں، کھیتر انیوں اور ایک ہندآریائی قومیت (یا قبائلی اتحاد) حسنی پر مشتمل ہے جو بلوچی حملے سے پہلے کوہ سلیمان کے جنوبی دامن میں رہتا تھا۔ ان سب کو بلوچوں نے اپنے اندر جذب کرلیا اور وہ ماری کہلائے۔

بروھی قبیلے کا ایک حصہ کردوسرے بلوچی قبیلے مزاری میں ضم ہوگیا۔ یہاں یہ یاد رکھنا مناسب ہے کہ بلوچ بروھی زبان کو کرگلی یا کرگلی کہتے ہیں۔ بروھی قبیلے کا دوسرا حصہ راہ شانی رندوں کی ساخت میں شامل ہوگیا۔ دو اور بلوچی قبائل گیچکی اور ردودائی میں زیادہ تر سندھیوں کا خون ہے۔ بولیدھی قبیلے میں عربوں کی اولاد شامل ہے۔

بروھی قبائل کے بٹ کر بلوچوں میں ضم ہونے کا ایک نتیجہ نکلا ــــ بلوچ دو بنیادی نسلیاتی گروھوں میں مستحکم ہوئے ــــ پہلا شمال مشرق میں (سلیمانی) اور دوسرا جنوب مغرب میں (مکرانی)۔ ابتدا میں ہندآریائی قومیتوں پنجابیوں اور سندھیوں نے اور پھر بعد میں پندرھویں صدی کے آخر اور سولھویں صدی

کے شروع میں پشتونوں نے اول الذکر گروہ کی تشکیل کافی اثر ڈالا۔ جہاں تک آخر الذکر گروہ کا تعلق ہے تو وہاں یہ کردار مشرقی ایرانیوں نے ادا کیا۔ اس کا اظہار زبان میں تو ملتا ہی ہے۔ معاشرتی ادارے، کاشتکاری کا طریقے اور مادی ثقافت بھی اس اثر سے آزاد نہیں ہیں۔

ایک مغربی مصنف مورگین اسٹیر نے کی رائے میں ''ایک ایرانی ضمنی شاخ نے جس کا تعلق اور مری سے تعلق تھا شمال مشرق میں بلوچی بولیوں کو متاثر کیا ہے۔ جنوب مغربی بولیوں کے مقابلے میں شمال مشرقی بولیوں کے ذخیرہ الفاظ پر ہند آریائی زبانوں سے حاصل کئے جانے والے الفاظ کی چھاپ گہری ہے۔ اس کے مقابلے میں جنوب مغربی بولیوں نے فارسی کا زیادہ اثر قبول کیا ہے۔ سوویت محقق پیکولن اپنی تصنیف ''بلوچ'' میں لکھتے ہیں کہ '' کاشتکاری کے طریقے، نہروں کی تعمیر، وزن کے پیانے اور رقبے کی پیمائش مشرقی بلوچوں نے سندھ اور پنجاب کے لوگوں سے اور مغربی بلوچوں نے ایران کے لوگوں سے حاصل کئے،،۔ شمال مغربی بلوچی قبائل پر جو سیستان کے جنوب میں آباد تھے اس علاقے کی تاجک آبادی کا خاصا اثر پڑا۔

سولھویں اور سترھویں صدیوں کے دوران بلوچستان کی سرزمین پر کئی ریاستی تشکیلیں ابھریں جن کی باگ ڈور بلوچی قبائل کی جاگیردار بنتی ہوئی اشرافیہ کے ہاتھ میں تھی۔ ان ریاستوں کے حکمراں ایرانی شاھوں اور عظیم مغلوں کے باجگزار تھے۔ اٹھارویں صدی کے وسط میں جب نادر شاہ کی سلطنت زوال میں آئی اور عظیم مغلوں کا اقتدار کمزور ہو گیا تو ایک واحد جاگیر دارانہ ریاست کے اندر پورے بلوچستان کو متحد کرنے کے حالات پختہ ہو گئے۔ اور یہ تاریخی فریضہ سب سے زیادہ طاقتور خان کی قلمرو قلات کے حکمرانوں نے انجام دیا۔ ان کا کمبرانی یا احمد زئی (خاندان شاہی کے بانی __ میر احمد جس نے 1666 سے 1695 تک حکمرانی کی __ کے توسط سے) خاندان شاہی سے تعلق تھا جس کا منبع بروہی تھا۔

بلوچستان کا بیگ لیر بیگ (بیگوں کا بیگ) ناصر خاں بلوچی (95_175) ان حکمرانوں میں سب سے طاقتور تھا۔ جنگوں کے وقت اسے پانچ بروھی قبائل کے وفاق کی حمایت حاصل ہوتی تھی۔ ان کے سرداروں کو ساراوان اور جھالاواں میں زمینیں ملی تھیں۔ ناصر خاں کی عمل داری میں مغرب میں بم پور، کا سرکنڈ اور دیزک، شمال میں شول (کوئٹہ) اور شمال مشرق میں خاران اور (ڈیرہ غازی خاں کے جنوب میں) داجیل شامل تھے۔ مشرق میں اس کی سرحدیں سندھ سے ملتی تھیں۔ جنوب میں لاس بیلا اور کیچ کے

خان ناصر خاں کے باجگزار تھے☆۔

یہ ٹھیک ہے کہ خود ناصر خاں بلوچ احمد شاہ درانی اور اس کے جانشینوں کا باجگزار تھا۔ لیکن باجگزاری صرف ایک شکل میں ادا کی جاتی تھی ــــ درانی فوج کے لئے سپاہیوں کی فراہمی۔ اس کے عوض ناصر خاں کی نگرانی میں شول، مستونگ، خاران اور داجیل تھے۔ اس کے علاوہ درانی شاہ خان کی قلمرو قلات کے اندرونی معاملات میں نہیں کر سکتے تھے☆۔

اٹھارویں صدی کے دوسرے نصف میں بلوچی قبائل کے سرداروں کی سربراہی میں چھوٹی چھوٹی جاگیروں میں اضافے اور ناصر خاں کی موت کے بعد ہنگامی حالات کی وجہ سے اس کی ریاست عملاً کئی صاحب اقتدار چھوٹی فرمانروائیوں میں بٹ گئی۔ ناصر خاں کی ریاست کی تباہی کا ایک اہم سبب یہ تھا کہ مختلف علاقوں کے حکمرانوں نے ریاست کی تباہی

A.W. Hughes, <<The country of Baluchistan>>, pp. 186-187.*

M. Elphinstone, <<An Account of the Kingdom of Caubul...>>, pp.449,** 496, 556.

کے امیر خان قلات کا جاگیری محصولات میں حصہ کم کر کے اپنا حصہ بڑھا لیا تھا۔ ناصر خاں کی مال گزاری 30 لاکھ روپیے سالانہ تھی۔ لیکن اس کے فرزند اور جانشین محمود خاں (1795 تا 1816) کی آمدنی ساڑھے تین لاکھ روپیے سے زیادہ نہیں بڑھی۔ وجہ یہ تھی کہ کیچ، پنج گور، لاس، دیزک اور خاران صوبوں کے جاگیردار حکمراں ہاتھ پیر نکال رہے تھے اور وہ تمام محصولات خود اینٹھ لیتے تھے جو وہاں کے لوگوں سے وصول کئے جاتے تھے۔

اٹھارویں صدی کے آخر اور انیسویں صدی کے شروع میں بلوچوں کے معاشرتی ڈھانچے کی ایک امتیازی خصوصیت یہ تھی کہ اس میں جرگہ نظام کی بہت سی باقیات موجود تھیں۔ ہر جگہ جرگہ تقسیم جوں کی توں تھی حالانکہ خونی رشتے اب بلوچی قبائل کی بنیاد نہیں رہے تھے۔ اس زمانے میں صرف ان بلوچوں میں جرگے کے بندھن بے معنی ہو گئے تھے جو سندھ اور پنجاب میں آباد تھے۔

اس دور میں بیشتر عام بلوچ قبیلے کے آزاد اور پورے رکن تسلیم کئے جاتے تھے۔ شمال مشرقی

بلوچستان میں زمین کی تقسیم باقاعدہ ہوتی تھی اور جرگہ ___ پورا حق رکھنے والے مردوں، خاندان کے سربراہوں پر مشتمل کونسل ___ قبائل میں سرگرم تھا۔ رواجی قانون کی فرمانروائی تھی اور قبائلی خانوں کو اس پر عمل کرنا پڑتا تھا۔ مکران میں بالائی جاگیردارانہ پرت کو وسیع اختیارات حاصل تھے۔ عام لوگوں کا ایک آزادی سے محروم کا بن گیا تھا درحقیقت ان کا درجہ گر کر تابع اور حقوق سے محروم کا بن گیا تھا ___ رعیت ہمسایہ۔ مشرقی بلوچستان میں آبادی کا یہ تابع زمرہ زیادہ تر غیر بلوچوں پر مشتمل تھا ___ تاجک، پنجابی، سندھی، مقامی اصلی آبادی کی اولاد یا وہ لوگ جو سندھ کی دوسری طرف سخت جاگیری استحصال سے بچنے کے لئے بلوچستان میں پناہ لینے آتے تھے۔ سب سے زیادہ حقوق سے محروم غلام تھے جو یورشوں کے وقت پکڑے جاتے یا پیسے سے خریدے جاتے تھے۔ مورخوں کا اندازہ ہے کہ ان استحصال کئے جانے والوں کی تعداد خاصی تھی۔

قبیلہ (تومان) جرگوں میں بٹا ہوتا تھا جسے پھاڑا (ماریوں میں ٹکر) کہتے تھے۔ ہر جرگہ پھلیوں میں منقسم تھا۔ قبیلے کا سردار تومان دار ہوتا تھا اور جرگے کا مقدم۔ اگرچہ قلات کے خان کو تومان دار اور مقدم مقرر کرنے کا اختیار تھا لیکن عملاً یہ عہدے موروثی تھے اور ہمیشہ ان ہی افراد میں سے لئے جاتے تھے جن کا تعلق اسی خان (پھگ لوگ) خاندان سے تھا۔

قابل کاشت زمین کی کمی تھی اور مویشی بانی وسیع پیمانے پر ہوتی تھی۔ اس کی وجہ سے جرگہ نظام کی باقیات جاری رہیں۔ اسی لئے اکثر بلوچ خانہ بدوشوں کی زندگی گذارنے پر مجبور تھے۔ بلوچوں کی بالائی جاگیری پرت معاشرتی تنظیم کی ان پسماندہ شکلوں کو برقرار رکھنا چاہتی تھی اس لئے کہ ان شکلوں کے ذریعے ان کا اپنا اقتدار مضبوط ہوتا تھا اور طبقاتی تضاد کی پردہ پوشی ہوتی تھی۔

بلوچی معاشرے کی بالائی جاگیری پرت تومانداروں، مقدموں اور ان کے رفقا کار پر مشتمل تھی۔ تومان دار خانہ بدوشوں کی چلن پھرن کا سربراہ ہوتا تھا اور اسے منظم کرتا تھا۔ قبیلے کی فوج کا وہ سپہ سالار بھی تھا۔ اپنے دستوں کی امداد سے تومان دار قبائلوں اور ماتحت آبادی میں عدل وانصاف قائم رکھتا تھا اور سزائیں دیتا تھا۔ وہ محصولات جمع کر کے خان قلات کے حوالے کرتا تھا۔ ان کا ایک حصہ قبیلے کے خان کے پاس بطور ''انعام'' چلا جاتا تھا۔

قلات میں خان کی قلمرو قائم ہونے کے بعد زمینوں کا ایک حصہ جنہیں احمد زئیوں نے فتح کیا تھا (یا

بطور انعام درانی شاہوں نے دیا تھا)، حکمراں خاندان شاہی کی ملکیت بن گیا۔ باقی حصہ بطور جاگیر بلوچی اور بروھی قبائل کے سرداروں اور خانوں کو عطا کر دیا گیا۔ یہ سردار اور خواتین تاجکوں، سندھیوں اور پنجابیوں سے اسی زمین پر کاشت کرنے کا لگان لیا کرتے تھے۔ انیسویں صدی کے شروع میں قبائل کے سردار عملاً بڑے بڑے زمیندار بن گئے۔ ان کے قبضے میں قابل کاشت زمینیں اور چراہ گاہیں آ گئیں۔ اب انہیں قانونی اعتبار سے بھی پورے قبیلے کی ملکیت نہیں سمجھا جاتا تھا۔ خواتین خانہ بدوش مویشی بانوں پر مویشی کا ٹیکس اور کاشت کاروں پر لگان عائد کرتے تھے۔ انہوں نے ان محصولات پر قبضہ کرنا شروع کر دیا جو پہلے اجتماعی طور پر قبیلے کا حق تھے۔ وہ ماتحت آبادی سے اپنے قلعوں کی تعمیر، پیغام رسائی اور ان کے لئے شکار کرنے کی بیگار بھی لیتے تھے۔

جاگیردار طبقے کی ایک اور مراعات یافتہ پرت ملاؤں کی جماعت پر مشتمل تھی۔ یہ لوگ اکثر ماہر دین اور بے شمار ولیوں کی اولاد تھے جو ریاست کے تمام فرائض اور پابندیوں سے آزاد تھے۔ جو زمینیں یا جائدادیں انہیں عطا کی جاتی تھیں ان سے محصول نہیں لیا جاتا تھا۔

دور جاگیرداری میں جو معاشرتی معاشی تعلقات قائم ہوئے ان پر تاجکوں، سندھیوں اور پنجابیوں نے دوررس اثر ڈالا۔ بلوچستان میں (اکثر پشتون قبائل کی طرح) دستکاری غیر بلوچوں کے ہاتھ میں رہی۔ بعض شہروں میں آبادی کی اکثریت غیر بلوچی تھی۔ اکثر ملتان اور شکار پور کے ہندو تجارت کا کام کیا کرتے تھے۔ انیسویں صدی کے شروع میں قلات میں ان کے 400_500 بڑے بڑے ذاتی مکانات تھے۔ حکام ان کی حفاظت اور سرپرستی کرتے تھے۔ مذہبی معاملات میں انہیں آزادی حاصل تھی۔ ہندو تاجر زمینداروں سے وہ اجناس (اناج اور مویشی) خریدتے تھے جو انہیں بطور محصول اور لگان حاصل ہوتی تھیں اور انہیں وہ اشیا فراہم کرتے تھے جنہیں ہندستان، ایران، افغانستان اور وسطی ایشیا سے درآمد کیا جاتا تھا۔

بلوچی ادب صدیوں تک بنیادی طور پر لوگ کہانیاں گیتوں کی شکل میں پروان چڑھا جو زبانی ایک نسل سے دوسری نسل تک پہنچتا رہا۔ وجہ یہ تھی کہ بلوچستان معاشی اور ثقافتی لحاظ سے پسماندہ تھا، مدنی زندگی ابتدائی منزل میں تھی اور بڑے شہر وجود میں نہیں آئے تھے۔ جب بلوچی ریاست قائم ہوئی تو پڑوسی ملکوں کی طرح اس کی سرکاری زبان بھی فارسی قرار پائی۔ عربی مذہبی زبان رہی۔ اس لئے بلوچی ادب

پنپ نہ سکا۔ بلوچی زبان کے ادبی شاہکار، جہاں تک معلومات دستیاب ہیں، زیادہ نہیں ہیں۔ اور جو ہیں ان کے متعلق یہ کہا جا سکتا ہے کہ لوک کہانیاں اور گیت ہی (چند اضافوں کے ساتھ) ضبط تحریر میں لائے گئے ہیں۔

چوتھا باب

بورژوا قوموں کی تشکیل

اٹھارویں صدی کے وسط میں برصغیر پاکستان و ہند میں عظیم مغل سلطنت کا شیرازہ بکھر گیا، ہلاکت آمیز جنگیں ہونے لگیں، ایرانیوں اور افغانیوں کے حملے شروع ہو گئے۔ ان حالات نے برطانوی نوآباد کاروں کو اپنے غارتگری کے منصوبے پورے کرنے میں بڑی مدد دی۔ یہ ٹھیک ہے کہ ایسٹ انڈیا کمپنی کو برصغیر پر قبضہ جمانے میں لگ بھگ ایک صدی (1757 تا 1849) لگی، اسے بعض اوقات سخت شکستیں بھی ہوئیں۔ لیکن چونکہ نوآباد کاروں کو انفرادی اور مادی طور پر برتری حاصل تھی اور ہندستان جاگیردارانہ نفاق کا شکار تھا اس لئے برطانیہ کا کامیاب ہونا یقینی تھا۔ انیسویں صدی وسط تک پورا ملک برطانوی حکمرانی کے تحت آ گیا۔ شمال مغرب میں بعض علاقے (بلوچستان، ہندوکش کے آس پاس کی فرمانروائیاں اور پشتون قبائلی علاقہ) آزاد رہے لیکن انہیں بھی انیسویں صدی کے دوسرے نصف میں مفتوح بنا لیا گیا۔

برطانوی تسخیر ایک کھلم کھلا اور بے پناہ لوٹ مار تھی۔ "پوری اٹھارویں صدی کے دوران ہندستان سے جو خزانے انگلستان منتقل ہوئے وہ تجارت کے ذریعے بہت کم اور ملک کے براہ راست استحصال کے ذریعے حاصل کئے گئے۔ اس طرح اس کی بے انتہا دولتیں انگلستان کو برآمد کی گئیں، انہیں وہاں پہنچایا گیا۔"☆ برطانوی حملے سے پہلے ہندستانی محنت کشوں کے جاگیردارانہ استحصال

☆ کارل مارکس، "ہندستان پر مضامین"۔

کے جو طریقے رائج تھے ان پر برطانوی نوآباد کاروں نے نہ صرف تکیہ کیا بلکہ انہیں مضبوط بھی بنایا۔ انہوں

نے لگان و محصولات کی شرح بہت زیادہ بڑھا کر اور ہندستانی کسانوں اور دستکاروں کی پیدا کی ہوئی معاشرتی زائد پیداوار کو مفت جبری طور پر حاصل کر کے ملک کی معیشت کی بنیاد کھوکھلی کر دی۔ سرکاری اعداد و شمار کے مطابق ایسٹ انڈیا کمپنی نے صرف 1757 اور 1812 کے درمیان 10 کروڑ پونڈ سے زیادہ منافع کھسوٹا۔ ایسی بڑی بڑی رقموں سے نہ صرف برطانیہ کے حکمراں طبقات دولت مند ہوئے بلکہ وہاں سرمایہ داری نے بھی ترقی کی، اس کی مادی بنیاد مستحکم ہوئی، صنعتی انقلاب مکمل ہوا اور برطانوی صنعت نے نشوونما پائی۔ دوسری طرف برطانوی نوآبادکاروں نے اتنے زیادہ محصولات عائد کر دئے کہ براہ راست ہندستانی پیداکاروں کو نہ صرف پوری زائد بلکہ ضروری پیداوار کا بھی ایک حصہ ادا کرنا پڑا۔ اس نے سادہ تجدید پیداوار مشکلات میں مبتلا کر دیا اور لاکھوں لوگ قحط اور موت کے شکار ہوئے۔

1813 کے بعد جب ہندستانی تجارت پر ایسٹ انڈیا کمپنی کی اجارہ داری ختم کر دی گئی تو ابتدائی اجتماع زر کے ذریعے اس ملک کے عوام کے استحصال کے طریقوں میں چند تبدیلیاں ہوئیں۔ اب برصغیر برطانوی اشیا کی منڈی اور برطانیہ کے لئے خام مال کا پیداکار بننے لگا۔ جن وسائل نے برطانوی اشیا کو ہندستانی منڈی میں آنے میں مدد دی وہ سڑکوں کی تعمیر اور نوآبادکاروں کا عائدشدہ محاصل کی شرح تھی۔ سڑکوں کو بیرونی حملہ آوروں نے اپنے فوجی اور معاشی مقاصد کے تحت بنایا تھا۔ ہندوستان کی دستکاری کی وہ پیداوار جو برطانیہ کی تیارشدہ اشیا کا مقابلہ کرتی تھی اسے برطانوی مشینی صنعت اور نوآبادیاتی محصولات نے کچل کر تباہ کر ڈالا۔

اٹھارویں صدی کے آواخر اور انیسویں صدی کے پہلے نصف میں نوآبادکاروں نے لگان کے نظام میں جو تبدیلیاں کیں (1793 میں بنگال میں بندوبست استمراری کا نفاد، 1793 اور میں بنگال میں بندوبست استمراری کا نفاد، 1793 اور 23_1817 میں جنوبی ہندستان میں بندوبست رعیت واڑی اور انیسویں صدی کی ابتدا میں وسط ہند میں موضع وار یا مالگزاری نظام وغیرہ) انہوں نے برصغیر ہندو پاک کو برطانوی منڈی اور خام مال کے اڈے میں تبدیل کر دیا۔ ان تبدیلیوں نے جاگیردارانہ زرعی تعلقات ختم نہیں کئے بلکہ نوآبادیاتی انتظامیے کو ایک ایسا موثر حربہ حوالے کر دیا جس کی مدد سے وہ برصغیر کے عوام کے استحصال کو بڑھا سکا اور ملک کے معاشی ارتقا کی سمت نوآبادکاروں کے مفاد میں مقرر کر سکا۔ زر کی شکل میں بھاری محصولات ادا کرنے کے لئے کسانوں کو تجارتی فصلیں پیدا کرنا پڑیں اور ان کا بڑا حصہ پیداواری

لاگت کا لحاظ کئے بغیر فروخت کرنا پڑا۔

برطانوی حملے نے برصغیر کے معاشرتی معاشی ارتقا کی قدرتی راہ روک دی۔ وسیع پیانے پر لوٹ کھسوٹ، قحط اور وباؤں سے لاکھوں لوگوں کو موت، شہروں اور دستکاری کے زوال، روایتی معاشی رابطوں کے ٹوٹنے اور ہندستان کے لئے ضروری صنعتوں کو توڑ دینے اور مٹا دینے سے مفتوح ملک کی پیدآور قوتوں کی نشو ونما رک گئی۔ برطانیہ نے ''ہندستانی معاشرے کا پورا ڈھانچہ منہدم کر دیا، تعمیر نو کا کہیں بھی کوئی نشان نہیں ملتا،، ☆۔

قبل از نو آبادیاتی عہد کے ہندستان میں سرمایہ داری کی خود رو طور پر کونپلیں پھوٹنا شروع ہو گئی تھیں۔ نو آبادیاتی جوئے نے کئی دھائیوں تک انہیں پروان چڑھنے سے روکے رکھا۔ برصغیر کے سب سے زیادہ ترقی یافتہ علاقوں میں شہر اور دیہات کے درمیان معاشرتی محنت کی تقسیم کا جو عمل شروع ہو گیا تھا اسے نو آبادکاروں نے تباہ کر دیا۔ اس کی معاشی معاشرتی پسماندگی نو آبادیاتی استحصال کا نتیجہ بلکہ اس کی ایک اہم وجہ بھی ثابت ہوئی۔ برطانوی حکمراں طبقات نے جو زوال پذیر جاگیردارانہ تعلقات کو برقرار رکھنا چاہتے تھے سرمایہ دارانہ نظام کی تشکیل کی رفتار سست کرنے کی ہر ممکن کوشش کی۔ اگرچہ برصغیر حاکم ملک کے ساتھ تبادلہ جنس میں شامل ہو گیا (جب نو آبادکاروں نے اس پر برطانوی صنعت اور مقامی زرعی پیداوار کی بے ہودہ تقسیم محنت مسلط کر دی تھی) اور اس نے برصغیر کو عالمی سرمایہ دارانہ منڈی کے نظام میں بتدریج شامل ہونے اور جنس زر کے تعلقات کو نشو ونما دینے میں مدد دی۔

☆ کارل مارکس، ہندستان پر مضامین،،۔

لیکن بذات خود یہ عمل اتنا تیز اور وسیع نہیں تھا کہ مفتوح ملک میں نئے تعلقات پیداوار کی تخلیق کرتا۔

برطانوی نو آبادیاتی جوئے نے برصغیر کی معاشرتی ارتقا کو دھیما اور مسخ کیا لیکن اسے وہ قطعی طور پر روک بھی نہیں سکا۔ زمین کی نجی جاگیری ملکیت نے لگان کی ان تبدیلیوں کی حدود میں فروغ پایا جنہیں نو آبادکاروں نے نافذ کیا تھا۔ ہندستانی کسانوں کے حق ملکیت کو وسیع پیانے پر جبریہ طور سے غصب کرنے اور برصغیر کو برطانیہ کا زرعی دم چھلا اور اس کی تیار شدہ اشیا کی منڈی بنا دینے سے اس کی دیہی معیشت منتشر ہونے لگی۔ یہ معیشت خود کفیل تھی۔ ملک کے بڑے بڑے ساحلی شہروں اور اندرون ملک کے درمیان بوسیدہ روابط کی جگہ نئے معاشی رابطے لینے لگے۔ جدا جدا زرعی خطوں کی تخصیص ہونے لگی، لیکن

آہستہ۔ صنعتی فصلوں کی پیداوار اور اشیا کا اندرونی تبادلہ بڑھنے لگا۔ مقامی تجارت اور سودی سرمائے کی افزائش کے ساتھ ساتھ منیبی (comprador) تجارت بھی ترقی کرنے لگی۔ انیسویں صدی کے وسط میں مقامی تاجروں نے منیبی تجارت اور سودخوری کے علاوہ صنعتی کارخانے بھی قائم کرنا شروع کر دیے۔

برصغیر ہندو پاکستان میں انیسویں صدی کی ابتدا سے سرمایہ دارانہ نظام نے تشکیل پانا شروع کیا۔ اس عمل کو تیز کرنے میں برطانوی سرمائے کی برآمد نے مہمیز کا کام دیا جو انیسویں صدی کے دوسرے نصف میں کی گئی۔ یہ خود برطانیہ میں بعض بنیادی معاشرتی معاشی تبدیلیوں کا تقاضہ تھا___ برطانیہ سرمایہ داری سامراج کی بلند منزل میں بتدریج داخل ہو رہا تھا۔ ہندستان کو صرف اس لئے سرمایہ برآمد نہیں کیا گیا کہ اس وقت برطانیہ میں بہت زیادہ زائد سرمایے کا اجتماع ہو گیا تھا، بلکہ اس کی وجہ یہ بھی تھی کہ برصغیر ہندو پاکستان میں جاگیری تعلقات ٹوٹ رہے تھے اور سرمایہ کاری ممکن تھی (محنت کی منڈی، اندرونی صارف کی منڈی وغیرہ موجود تھی)۔

برصغیر میں سرمایہ داری نظام کا ارتقا نوآبادیاتی محکومی کے حالات میں ہوا۔ اس نے اس عمل پر اپنی مخصوص چھاپ چھوڑی___ اس کی تشکیل بے ڈھب اور ناہموار ہوئی۔ سمندر پار کے آقاؤں نے ہندستان کے معاشرتی معاشی ڈھانچے میں جاگیرداری کی باقیات محفوظ رکھیں۔ نوآبادکاروں نے ملک پر غیر مفید تقسیم محنت عائد کی۔ چنانچہ وہ تجدید پیداوار کی ایسی راہ معین کر سکے، جو ملک کی ہمہ پہلو معاشی ترقی کے لئے مضر تھی اور نوآبادکاروں کے واسطے مفید۔

سرمایہ دارانہ تعلقات کے قیام سے ان نسلیاتی عوامل پر دوررس اثرات پڑے جو برصغیر ہندو پاکستان میں ہو رہے تھے۔ شمال مغربی علاقے میں انیسویں صدی کے وسط سے اور شمال مشرقی علاقے میں انیسویں کے شروع سے تاریخ لحاظ سے ایک نیا نسلیاتی فرقہ___ بورژوا قومیں ابھرنے لگیں۔ ملک چونکہ نوآبادیاتی حکمرانی کے تحت تھا اور اس کے جدا جدا خطوں کا معاشرتی معاشی ارتقا بالکل یکساں نہیں تھا اس لئے ان عوامل نے انتہائی متضاد اور پیچیدہ شکلیں اختیار کیں۔

☆☆☆

سرمایہ دارانہ پیداوار کبھی ساکن نہیں رہتی بلکہ کئی منزلوں سے گزرتی ہے___ پہلے سادہ سرمایہ دارانہ تعاون باہمی، پھر کرخنداری اور اس کے بعد بڑے پیمانے پر مشینی صنعت۔ ان منزلوں میں سرمایہ داری

کے بنیادی طبقات تشکیل پاتے ہیں__ بورژوازی اور پرولیتاریہ۔ اور یہی منزلیں بورژوا تعلقات کے دوران لوگوں کے قومی استحکام کی سطح معین کرتی ہیں۔

چونکہ برصغیر ہند و پاک کی حیثیت نوآبادی کی تھی اس لئے کلاسیکی سرمایہ دارانہ پیداوار کا ارتقا عام قاعدے (سادہ تعاون__ کرخنداری__ کارخانے کی صنعت) کے مطابق نہیں بلکہ بطور استثنا ہوا۔ چنانچہ وہاں بورژوا معاشرے کے خاص طبقات کی تشکیل اور اس کے ساتھ بورژوا قوموں کے استحکام نے ایک مخصوص راہ اختیار کی۔

☆☆☆

ایسٹ انڈیا کمپنی نے سندھ کو 1843 میں اور پنجاب (ستلج کے مغرب میں) کو 49_1845 میں تخت و تاراج کیا۔

برطانیہ کی فتح کے بعد پنجاب (اور سندھ) حاکم ملک کا بتدریج زرعی ضمیمہ بن گیا اور عالمی سرمایہ دار منڈی میں شامل ہو گیا۔ وہاں برآمدی زرعی فصلیں اگانے کی ترغیب دی گئی۔ اس کے لئے سرمایہ دارانہ پیداوار کی مادی شرائط درکار تھیں (ریلوں، بندرگاھوں وغیرہ کی تعمیر)۔ چونکہ برصغیر کے شمال مغربی علاقے کم تباہ و برباد ہوئے تھے اس لئے وہاں زراعت میں وسیع پیمانے پر تجدید پیداوار کے مواقع زیادہ تھے۔ زراعت ہی اس علاقے کی معیشت کا خاص حصہ تھی۔ جیسے جیسے پیدآ ورقوتیں آہستہ آہستہ لیکن ثابت قدمی سے پروان چڑھیں اور دقیانوسی جاگیردارانہ تعلقات تدریجاً کمزور پڑے تو معاشرے کے لئے ایسے خارجی مواقع پیدا ہو گئے کہ وہ نئی، بلند تر تشکیل کی راہ اختیار کر سکے۔ سرمایہ داری کی۔ اور ساتھ ہی نسلیاتی فرقے کی نئی تاریخی قسم ترتیب دے سکے: بورژوا قوم کی۔ لیکن برطانوی ہند کے دوسرے علاقوں کی طرح یہاں بھی نوآبادیاتی حکمرانی کے سبب ان عوامل کا جامع ارتقا نہ ہو سکا اور وہ مسخ شدہ اور ناہموار طور پر بڑے۔

انیسویں صدی کے وسط میں ملک کے استحصال کے وہ طریقے جو ابتدائی اجتماع زر کے لئے مقصود تھے بتدریج پس پشت ڈال دیئے گئے۔ اسی لئے برصغیر کے شمال مشرقی خطے کے مقابلے میں شمال مغربی علاقے کی معاشرتی معاشی زندگی میں نوآبادیاتی حکام کی دخل گیری چال باز اور کم سخت رہی۔ لیکن مقاصد یکساں تھے: شمال مغربی علاقے کو نوآبادیاتی خراج گذار، برطانوی مال کی منڈی اور برطانوی صنعت کے

لئے سامان کا ذریعہ بنانا۔ پنجاب سرحد پر واقع تھا۔اس کا بلاشبہ حاکم ملک کی پالیسی پر اثر پڑا۔اس کے علاوہ نوآبادیاتی حکام نے مقامی عوام کی ان توانا روایات کو بھی پیش نظر رکھا کہ وہ ظالموں اور حملہ آوروں کے خلاف مسلح ہو کر اٹھ کھڑے ہوتے ہیں۔

پنجاب کی جانب (اور سندھ کی بھی) برطانوی پالیسی کئی منزلوں سے گزری۔ حملے کے بعد کے ابتدائی برسوں میں حکام نے اپنی توجہ سب سے پہلے الحاق شدہ علاقوں میں اپنی حکمرانی مستحکم کرنے اور افغانستان، ایران اور وسطی ایشیا میں وسیع پسندی کے لئے انہیں اپنا اڈا بنانے پر دی۔آٹھویں اور نویں دھائیوں میں اس علاقے کو حاکم ملک کا زرعی ضمیمہ بنانے کا خیال غالب رہا۔ جب نوآبادکار حکام نے پنجاب اور سندھ کے معاشی ارتقا کی تشکیل کی تو ان کے سامنے یہی مقصد تھا۔انہوں نے سرمایہ دارانہ تعلقات کو بڑھنے سے روکا، معاشرتی معاشی ڈھانچے میں جاگیرداری کی باقیات برقرار رکھیں اور ان مقامی استحصال کرنے والی پرتوں کی پشت پناہی کی جو دقیانوسی قبل از سرمایہ داری نظام میں پیوست تھیں۔ یہ تھے نیم جاگیری زمیندار اور مہاجن، برطانوی حکمرانی کے سماجی ستون۔

نوآبادیاتی حکام برصغیر کے شمال مغربی علاقے پر اپنی حکمرانی کو مضبوط کرنا چاہتے تھے۔اس لئے انہوں نے ایسے معاشرتی گروہ پیدا کئے جن کا اس حکمرانی پر انحصار تھا اور ان کے تحفظ کیلئے بہبودی کی مادی بنیادیں بھی ڈالیں۔اسی لئے انہوں نے تمام مفتوح علاقوں کا الحاق نہیں کیا اور چالیس سے زیادہ جاگیری ریاستیں برقرار رکھیں (سب سے بڑی ریاستیں پنجاب میں پٹیالہ اور بھاولپور اور سندھ میں خیرپور تھیں) اور ان کے فرمانرواؤں کو تاج برطانیہ کا مطیع بنالیا۔اس طرح جاگیری ظلم برقرار رہا۔اس نے پنجاب اور سندھ کی معاشی ترقی کو روکا اور ان علاقوں کے ریاستی انتظامی اور معاشی اتصال میں رخنہ ڈالا جہاں پنجابی اور سندھی قومیں تشکیل پا رہی تھیں☆۔

جب نوآبادیاتی حکام نے لگان میں تبدیلیاں کیں اس وقت بھی مقاصد یہی تھے۔ان کا مقصد جاگیری زمیندار کی ملکیت کو مستحکم کرنا اور زمینداروں کی ایک ایسی جماعت پیدا کرنا تھا جن کا وجود نوآبادیاتی حکمرانی سے وابستہ ہو☆☆۔مزید برآں،

☆1947 میں ان ریاستوں کا رقبہ کل پنجاب اور سندھ کے علاقے کا 27 فیصدی حصہ تھا اور کل برصغیر کی آبادی کا 154 فیصدی۔

ایس۔ایم۔اختر اپنی تصنیف ''پاکستان کی معاشیات،، میں لکھے: یہ ''زمین پر حق ملکیت عطا کرنا) اس ملک کی روایات کو نظر انداز کرنے، برطانوی نظام زمینداری کی مثال قائم کرنے کے لئے کیا گیا یا ایک ایسا طبقہ پیدا کرنے کے لئے جس کی وفاداری ان اصلاحات نے زمینداروں کو ایک طبقے کی شکل میں مستحکم کیا اور انہیں برطانوی حکمرانی کا ستون بنا دیا۔ان اصلاحات کے سبب زمینداروں کی زمین کی پیداوار بھی کسی حد تک بڑھی۔اس سے برطانوی تاجروں کو فائدہ ہوا جو پنجاب اور سندھ کی زرعی پیداوار برآمد کرتے تھے۔

لگان کی اصلاحات کے تحت لگان کی ادائیگی نقد میں ہونے لگی۔اگر چہ برطانوی حکام نے (مقامی کسانوں کو ناراض کرنے کے ڈر سے اور سرکاری خزانے کی ضروریات کے سبب) پنجاب میں عام لوگوں کے حقوق ملکیت تسلیم کئے اور اوپر کے مزارعوں کو تحفظ کے تحت صاحب ملکیت جماعت کا درجہ دیا لیکن پنجابی کسانوں پر قرضے کا بوجھ بڑھنے لگا ☆ اور نتیجے میں رہنوں کی تعداد بڑی تیزی سے بڑھنے لگی، کسانوں میں ملکیت کا فرق تیز ہونے لگا۔کسانوں کا ایک حصہ زمین سے محروم ہو گیا اور وہ گاؤں کے دولت مندوں مثلاً زمینداروں اور ساھوکاروں کی ملکیت میں آ گئی ☆☆۔

چونکہ سرمایہ دارانہ تعلقات ابتدائی منزل میں تھے اس لئے زمین سے محروم کسان پرولیتاری نہیں بنے بلکہ بدترین شرائط پر

کا ہندستان میں برطانوی اقتدار سہارا لے سکے،،۔ایک بھی ایسا بڑا زمیندار نہیں ملتا جس نے زمین پر حق ملکیت غدر 1857 سے پہلے حاصل کیا ہو۔

☆1925 تک پنجاب میں زرعی قرضہ اس رقم سے 19 گنا تھا جو حکومت کو مال گزاری کی شکل میں ملا۔اس کا تخمینہ 90 کروڑ روپے تھا (یا 76 روپے فی کاشتکار)۔ 1931 میں قرضہ 50 فیصدی بڑھ گیا۔حوالے کے لئے ملاحظہ ہو:

S.M. Akhtar, <<Economics of Pakistan>>, pp. 132_133.

☆1866 سے 1891 تک پنجاب میں جو قابل کاشت زمین فروخت ہوئی وہ چار گنی تک پہنچ گئی__ ایک لاکھ 35 ہزار ایکڑ۔ 1891 سے 1921 تک 4 لاکھ 20 ہزار زمین کے مالک کسان، کل کسانوں کا 116 فیصدی حصہ بے زمین ہو گئے۔مزارع کاشتکاروں کی طرح ذرائع پیداوار میں

شریک ہو گئے ☆۔ چنانچہ پنجاب کا زرعی ڈھانچہ بنیادی طور پر جوں کا توں رہا اور زراعت میں سرمایہ دارانہ پیداوار کے عبور کے لئے موجود امکانات کو بڑی حد تک عمل میں نہیں لایا گیا۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ زرعی آبادی مستقل طور پر بے حد گنجان ہو گئی۔ ان حالات میں تباہ شدہ کسانوں کا زیادہ تر حصہ ''مسلسل شہری یا کرخنداری پرولیتاریہ میں تبدیل ہونے لگا اور اس تبدیلی کے لئے جو سازگار حالات ہو سکتے تھے انہیں تلاش کرنے لگا،، ☆☆۔

سرمایہ دارانہ تعلقات کی طفل سالی کے سبب نوآبادیاتی پنجاب کی صاحب ملکیت بالائی پرت کے لئے زمین کی خرید زیادہ نفع بخش اور سرمایہ کاری کی قابل ضمانت شکل بن گئی۔ چنانچہ زمینداروں کا ایک نیا طبقہ ابھرنے لگا جو سابق ساہوکاروں پر مشتمل تھا جو تباہ شدہ کسانوں کی زمینیں خرید خرید کر زمیندار بن گئے تھے، اور بعض جاگیرداروں اور زمینداروں پر بھی۔ چونکہ ان ساہوکاروں میں سے زیادہ تر کا تعلق ہندوؤں کی بیوپاری ساہوکاری ذاتوں سے تھا اس لئے (خاص کر پنجاب کے مغربی حصے میں) آبادی کے مختلف گروہ اپنی اپنی مذہبی اور فرقے وارانہ خصوصیات سے ممتاز کئے جانے لگے۔

دولت مند زمینداروں کے ہاتھ میں ملکیت آراضی کے ارتکاز کی وجہ سے غیر حاضر باش زمیندار پیدا ہوئے جو شہر یا اپنی املاک میں رہتے تھے۔ ان کا خاص مشغلہ سیاسی مہم بازیاں، اپنے دشمنوں کے خلاف سازشیں اور مزارعوں کا استحصال تھا۔ ان غیر حاضر باش زمینداروں کو ظاہر ہے املاک کی سرمایہ دارانہ خطوط پر نشوونما سے کم دلچسپی تھی۔ پنجاب میں نوآبادیاتی حکام نے جو معاشرتی معاشی ماحول پیدا کیا اس مدد سے زمیندار مزارعوں کا جاگیردارانہ

☆ بیسویں صدی کی چوتھی دھائی میں پورے پنجاب میں کل قابل کاشت زمین کے 26.7 فیصدی حصے پر مزارع کاشت کیا کرتے تھے۔ ان میں سے زیادہ تر غیر میعادی مزارع تھے، جس زمین پر وہ کاشت کرتے تھے اس پر ان کا کوئی حق نہیں تھا۔

☆☆ کارل مارکس، ''سرمایہ،،، جلد اول۔

استحصال کر کے خوب دولت سمیٹتے تھے ☆۔ اس کے علاوہ مہاجنی چکی بھی مزارعوں کو پیستی تھی۔

اس طرح نوآبادیاتی محکومی پنجاب کی زراعت میں سرمایہ دارانہ تعلقات کے بڑھنے میں مخل ہوئی، اس ارتقا کی عبوری منزلوں کو روکا اور درمیانی شکلوں کو برقرار رکھا۔ چنانچہ آبادی کے اس حصے کی بورژوا

معاشرے کے طبقات میں تشکیل رک گئی جس کا تعلق زرعی پیداوار سے تھا۔ چنانچہ نوآبادیاتی محکومی پنجابیوں کے ایک بورژوا قوم میں مستحکم ہونے میں رکاوٹ بنی۔

پنجاب میں انیسویں صدی کے آخر اور بیسویں صدی میں سرمایہ دارانہ تعلقات کے ارتقا کو قوت رفتار اس وقت ملی جب نوآبادکاروں نے برآمدی زرعی پیداوار کو بڑھانے کے لئے وسیع پیمانے پر نہریں تعمیر کیں۔ 1887 سے لے کر 1921 تک پنجاب میں نہر سے آبیار ہونے والا علاقہ 23 لاکھ سے ایک کروڑ ایکڑ تک پہنچ گیا، 400 فیصدی سے بھی زیادہ۔ اس سے بعض زرعی اشیا (خاص کر کپاس اور گندم) کی پیداوار اور برآمد نے بھی جست لگائی۔

نہروں کی تعمیر کے ساتھ ساتھ نہری زمینوں پر آبادکاری بھی ہوئی۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ اندرونی نقل مکان تیز ہوگئی۔ نقل مکان نے خاص کر پہلی عالمی جنگ کے بعد بڑی تیزی اختیار کی۔ 1921 اور 1931 کے درمیان آبادی ساہیوال کے آس پاس 45.8 فیصدی، ملتان کے اردگرد 31.1 فیصدی اور بھاولپور کے اطراف میں 26 فیصدی بڑھی۔

ریلوں کی تعمیر جنہوں نے برصغیر کے شمال مغربی علاقوں کو بحیرہ عرب کے ساحل سے ملا دیا☆☆ اور برآمدی تجارت کے فروغ نے ان

☆ پاکستان کے ماہر معاشیات جناب اختر نے لکھا ہے کہ مزارع بعض اوقات اپنی فصل کا 90 فیصدی حصہ زمیندار کو دیتا تھا۔

☆☆ انیسویں صدی کی چھٹی دھائی میں کراچی ___ حیدرآباد ریلوے لائن تعمیر ہوئی، ساتویں دھائی میں امرتسر ___ لاہور ___ ملتان ریلوے لائن بنائی گئی جو 1878 میں حیدرآباد تک بڑھا دی گئی۔ 1882 میں لاہور ___ پشاور لائن کا آغاز ہوا۔ 1891 شہروں کے بڑھنے میں بڑی مدد کی جو ریلوے جنکشنوں پر واقع تھے: ملتان، لاہور، ساھیوال، کیمپبل پور وغیرہ۔ شہروں کے پھیلنے سے غذائی ضروریات بڑھیں۔ اس نے مضافاتی تجارتی معیشت کو ترقی دی: پھلوں سبزیوں کی کاشت، شیرخانہ داری (ڈیری فارمنگ)۔

پنجاب کے زرعی علاقے تجارت میں شامل ہونے لگے، محنت کی تقسیم بڑھی اور دیہات میں جنس اور زر کے تعلقات گہرے ہوگئے۔ 1911 میں ایک سرکاری رپورٹ میں کہا گیا: ''تقریباً ہر ریلوے

اسٹیشن برآمد کا مرکز ہے۔آس پاس کے علاقوں سے اناج، کپاس وغیرہ ان اسٹیشنوں کو لائی جاتی ہے۔اور جب پیداوار وہاں پہنچتی ہے تو برآمدی فرموں کے دلال اسے خریدنے کا انتظام کرتے ہیں،،☆۔

مختلف زرعی معین قسم کی پیداوار کے لئے مخصوص ہو گئے اور اس طرح علاقائی پیانے پر محنت کی تقسیم قائم ہوئی۔ چنانچہ پنجاب کے جنوب مغرب میں نہری علاقوں میں خاص کر گیہوں اور کپاس اگائی جانے لگی۔ گجرات، منٹگمری، اٹک، جہیلم اور راولپنڈی میں وسیع پیانے پر مویشی بانی شروع ہوئی۔ ابنالہ، ہانسی اور شملہ میں تجارتی منڈی کے لئے سبزیاں اور پھل کے باغات بغیچے کثیر تعداد میں لگائے گئے۔

جب لوگوں میں تقسیم محنت اور جنس کے تعلقات بڑھے تو مقامی تجارتی اور ساہوکاری سرمائے کے درمیانی عوامل بھی وسیع ہو گئے۔اس کے نمائندے برطانیہ کی بڑی برآمدی فرموں کے دلالوں کا کام کرنے لگے۔اس طرح انہوں نے پنجاب کے دیہات کے استحصال میں نوآبادکاروں کی مدد کی۔ گجرات اور مارواڑ کی بیوپار اور ساہوکار ذاتوں سے تعلق رکھنے والے پنجاب میں بسنے لگے☆☆۔مقامی اور

میں روھڑی___ کوئٹہ لائن کھلی جو جیکب آباد اور سبی سے گزرتی ہے۔

<<Punjab Census Report (911)>> from D.R. Cadil's <<The Industrial* Evolution of India...>>, p. 167.

☆☆انگیریز مصنف کروک اپنی کتاب ''شمالی ہندستان کے لوگ،، میں لکھتا ہے کہ اکثر پنجابی ساہوکار ہندوؤں کی تجارتی اور ساہوکاری گجراتی مارواڑی بیوپار اور ساہوکار بورژوازی تیزی سے بڑھنے لگا۔ پنجاب میں 1868 سے 1911 تک بنک کاروں اور ساہوکاروں کی تعداد (خاندان شامل کر کے) 53263 سے 193890 ہوگئی (43 سال میں 364 فیصدی کا اضافہ!)۔

لیکن پنجاب میں صنعتی پیداوار بہت کم بڑھی۔ بیسویں صدی کے شروع میں وہاں 200 چھوٹے صنعتی ادارے تھے جہاں تقریباً 30 ہزار مزدور کام کرتے تھے۔ دوسری عالمی جنگ سے پہلے 1939 میں چھوٹے صنعتی اداروں کی کل تعداد 800 تھی اور مزدوروں کی 78 ہزار۔ان میں سے ایک تہائی کارخانے موسمی تھے جو سال میں صرف چند مہینے چالو رہتے تھے۔ نوآبادیاتی غلامی کے حالات میں مقامی صاحب ملکیت طبقات کے لئے ایسی کوئی ترغیب نہیں تھی کہ وہ اپنی اجتماع کی ہوئی دولت کو صنعتی پیداوار میں لگائیں۔ اس لئے وہ اسے زمین اور تجارت پر صرف کرنا زیادہ محفوظ خیال کرتے تھے۔ جہاں تک

نوآبادیاتی حکام اور برطانوی تاجروں کا تعلق ہے انہوں نے پنجاب کی معیشت کی صرف ان شاخوں کو ترقی دی جنہوں نے صوبے کو برطانیہ کا زرعی ضمیمہ بنائے رکھا☆۔

نوآبادیاتی حکمرانی کا نتیجہ یہ نکلا کہ برصغیر ہندو پاکستان کے مختلف علاقوں میں سرمایہ دارانہ تعلقات نے یکساں طور پر نشوونما نہیں پائی اور شمال مغربی خطہ بیسویں صدی کی ابتدا تک بنگال اور بمبئی کے مقابلے میں پسماندہ رہا اور بتدریج زرعی ضمیمہ بن گیا۔ جو مقامی سرمایہ دارانہ ادارے موجود تھے ان کی سطح انتہائی پست تھی۔ جدید مشینی صنعت (سوائے سرکاری ریلوے

ذاتوں سے تعلق رکھتے تھے۔ یہ تھے اروڑہ (مغربی علاقے میں)، کھتری (مرکزی حصے میں) اور اگروال۔ پنجاب کی اندرونی تجارت اور افغانستان سے تجارت پر ان کا قبضہ تھا۔ ان ہی کے خاندانوں سے دفاتر کے لئے لوگ ملازم رکھے جاتے تھے۔

☆ پنجاب میں 1881 میں کپاس صاف کرنے اور بیلنے کی 6 ملیں تھیں، 1891 میں 12 اور 1904 میں 114۔ زیادہ تر کپاس بدیس یا برطانوی ہند کے دوسرے صوبوں کو برآمد کی جاتی تھی۔

ورکشاپوں کے جو لاہور اور دیگر شہروں میں تھیں) صفر کے برابر تھی۔

پنجاب میں سرمایہ داری کے مخصوص ارتقا کا وہاں کے نسلیاتی عوامل پر براہ راست اثر پڑا، پنجابی بورژوا قوم کی تشکیل پر جو انیسویں صدی کے آخر اور بیسویں صدی میں شروع ہوئی تھی۔

بنگال میں پرولیتاریہ اور بورژوا دانشوروں کا استحکام بنگالی بورژوازی کے استحکام سے چند دہائیاں پہلے ہوا۔ پنجاب میں (سندھ کی طرح) یہ بعد نہیں تھا۔ پنجاب میں بورژوا معاشرے کے بنیادی طبقات اور معاشرتی پرتیں انیسویں صدی کے آخر میں پہلو بہ پہلو تشکیل پانے لگی تھیں۔

اس کا سبب یہ تھا کہ بنگال میں بیرونی سرمائے کے عمل کی بدولت پرولیتاریہ اور بورژوا دانشور پیدا ہونے لگے۔ اس کے بہت بعد قبل از سرمایہ داری کے معاشی نظام سے وابستہ مقامی صاحب ملکیت طبقات اپنے سرمادارانہ ادارے قائم کر سکے اور بورژوازی بنے۔ انیسویں صدی کے آخر اور بیسویں صدی کی ابتدا میں پنجاب میں برطانوی سرمائے کے ذریعے جو سرمایہ دارانہ کاروبار کھلے (خاص کر صنعتی پیداوار کے شعبے میں) وہ بہت کم تھے☆۔ اسی لئے وہاں مقامی سرمایہ دارانہ پیداوار کے قیام اور ارتقا کے پہلو بہ پہلو بورژوا معاشرے کے طبقات تشکیل ہوئی۔ لیکن یہ عمل سامراجی حکمرانی کے سبب بے حد سست تھا اور

نوآبادیاتی دور میں اس کے تمام پہلو مکمل نہیں ہوئے۔

نوآبادیاتی عہد میں پنجاب میں جو سرمایہ دارانہ ادارے ابھرے ان کی سطح پست تھی۔ اکثر صنعتوں کا معیار گھریلو کام سے زیادہ بلند نہیں تھا۔ مکمل شکل میں سرمایہ داری عنقا تھی۔ عام طور پر سرمایہ دارانہ ادارے کھولنے والے زمیندار تاجر اور ساہوکار تھے یہ لوگ اپنا پرانا پیشہ چھوڑنا نہیں چاہتے تھے کیونکہ نوآبادیاتی حکمرانی اور بورژوا تعلقات کی محض ابتدا کے سبب وہ

☆1911 کی مردم شماری کے مطابق پنجاب میں برطانوی سرمایہ رجسٹر شدہ صنعتی اداروں کے 13.5 فیصدی حصے پر محیط تھا۔ ان میں اکثر ریلوے ورکشاپیں تھیں۔

نیم جاگیردارانہ استحصال اور ساہوکاری کے ذریعے بھاری منافع حاصل کر سکتے تھے۔ نہ صرف پوری زائد پیداوار سے بلکہ ضروری پیداوار سے بلکہ ضروری پیداوار کے ایک بڑے حصے سے بھی۔ جیسا کہ ہم پہلے کہہ چکے ہیں وہ گردش زر کے میدان یا ملکیات آراضی کی خرید میں رقم لگانے کو زیادہ منفعت بخش سمجھتے تھے۔ جہاں تک صنعتی پیداوار کا تعلق ہے تو ابتدا میں وہ اسے اپنے روایتی پیشوں کا محض ذیلی حصہ تصور کرتے تھے۔

یہی سبب ہے کہ پنجاب میں جن صنعتوں نے ترقی کی وہ بنیادی طور پر نیم تیار زرعی پیداوار سے تعلق رکھتی تھیں ___ کپاس اور چاول کی صفائی، کپاس کا تیل اور گڑ کی تیاری، آٹے کی پسائی۔ بعض کارخانے زرعی آلات اور تعمیری سامان تیار کرتے تھے۔ ان میں زیادہ تر کارخانے موسمی تھے۔ دستکاری بھی ترقی پر تھی جو مقامی صارفوں کے لئے اشیا تیار کرتی تھی (برتن، فرنیچر، قالین، کپڑا، زیورات، جوتے وغیرہ)، اگرچہ پنجاب میں دستکاری کو برطانوی کارخانوں میں تیار شدہ اشیا کا مقابلہ کرنے سے کافی نقصان ہوا۔

زراعت میں سرمایہ دارانہ تعلقات قائم ہونے سے بتدریج ایک بورژوا پرت پیدا ہوئی۔ چونکہ یہ عمل بے حد سست تھا اس لئے طویل اور عبوری وقفوں کے بعد مکمل شکل میں زرعی بورژوازی نہیں کے برابر تھا۔ البتہ مغربی پنجاب میں جہاں نہری زمینیں تھیں وہاں خوش حال کسانوں میں زرعی بورژوازی کے آثار نظر آنے لگے۔

مجموعی طور پر ابھرتے ہوئے پنجابی بورژوازی کی تعداد زیادہ نہیں تھی اور (بعض وقت فرد کی شکل

میں)اس کا نیم جا گیر دار زمینداروں، تاجروں اور ساھوکاروں سے گہرا تعلق تھا کیونکہ وہ ان ہی لوگوں میں سے ظہور میں آیا تھا۔

یہاں یہ بات پیش نظر رکھنی چاہئے کہ انیسویں صدی کے انیسویں صدی کے آخر اور بیسویں صدی کی ابتدائی دہائیوں میں پنجابی بورژوازی زیادہ تر مقامی زمینداروں میں سے ابھرا جو یا تو ہندو تھے یا تاجروں اور ساہوکاروں کی ہندو ذاتوں کی اولاد۔ وسطی پنجاب میں ان کا تعلق سکھ فرقے کی صاحب ملکیت بالائی پرت سے تھا☆۔ مسلمان بورژوازی

☆اس بورژوازی کا مثالی نمائندہ تھا بیوپاری لالہ رام سرن داس جس کا تعلق ایک خاندان اشرافیہ سے تھا۔ اس خاندان کی کئی نسلوں

بہت ہی قلیل تعداد میں تھا۔ اس کا اندازہ یوں ہوسکتا ہے کہ انیسویں صدی کی نویں دہائی میں شہریوں کی اکثر آبادی ہندوؤں پر مشتمل تھی (67 فیصد) مغربی پنجاب تک میں یہی حال تھا۔ جہاں زرعی آبادی میں مسلمان 92 فیصدی تھے۔

کاروبار کے میدان میں مسلمان ہندوؤں کے بعد آئے۔ بیسویں صدی کی ابتدا میں مسلمان کی ابتدا میں مسلمانوں کے صنعتی کاروباروں کو انگلیوں پر گنا جا سکتا تھا۔ بعد کی دہائیوں میں دولت مند پنجابی زمینداروں نے خاص کر گردش زر میں پیسہ لگایا: درمیانی تجارت، بنک کاری اور ساہوکاری۔ صرف دوسری عالمی جنگ کے زمانے میں پنجاب کے لیے معاشی ترقی کے مفید حالات پیدا ہوئے☆۔ اسی زمانے میں مسلمانوں میں چوٹی کے صاحب ملکیت افراد نے کاروبار میں سرگرمی سے حصہ لینا شروع کیا اور صنعتی پیداوار میں بھی سرمایہ لگایا۔ ان حالات میں ابھرے ہوئے بورژوا طبقے کے مختلف حصوں کے درمیان دولت کمانے میں سخت مقابلہ ہوا۔

مندرجہ بالا عناصر کے علاوہ بمبئی، گجرات اور راجستھان کے بیوپاریوں کے پنجاب میں آنے سے بھی پنجابی بورژوازی کی نشو ونما ہوئی۔ وہ پنجاب کے مالی قرضے اور بینک کے کاروبار پر چھا گئے اور برآمدی تجارت اور اندرونی منڈی پر بھی۔ ان بیوپاریوں کے کاروبار بڑے پیمانے پر تھے۔ کس حد تک وہ صوبے کی معیشت پر حاوی تھے، اس کا اندازہ یوں ہوسکتا ہے کہ انیسویں صدی کی نویں دہائی میں ان کی تعداد 30 ہزار سے کم تھی (مغربی پنجاب میں خوجے تھے) دو دہائیوں کے بعد وہ ایک لاکھ ہو

نے مقامی کسانوں کو لوٹ لوٹ کر کافی دولت جمع کر لی تھی۔ تیسری دہائی میں لالہ رام پنجاب کا ایک نمایاں سرمایہ دار بن گیا۔ اس کے لاہور اور دوسرے شہروں میں کئی کارخانے تھے۔ وہ ''امپیریل بینک آف انڈیا'' کا ایک ڈائریکٹر اور کئی انشورنس کمپنیوں کا منیجر تھا۔ اس طرح دولت مند زمیندار اور سردار اجل سنگھ کی کئی فیکٹریاں تھیں)۔

☆ (سرمایہ کاروں کی تعداد 800 سے 1200 ہو گئی اور مزدوروں کی 78 ہزار سے ڈیڑھ لاکھ ان میں زیادہ تر لوگ گجرات سے آئے تھے۔ پنجاب میں دوسرے تاجر اور ساہوکار گجرات کے بوہرے اور بھاٹیہ ذات سے تعلق رکھنے والے راجستھانی بیوپاری اور سود خور تھے۔

جن حالات میں بورژوا معاشرے کے دوسرے بنیادی طبقے ___ پنجابی پرولتاریہ کی تشکیل ہوئی وہ بھی کم پیچیدہ نہیں تھے۔ سخت جان جماعت بندی کے تصورات اور ذات پات کی دیواریں آبادی کی آزاد اور وسیع گروہ بندی کو علیحدہ علیحدہ طبقات میں بانٹنے کی راہ میں حائل رہیں، حالانکہ طبقات میں بٹنے کا عمل سرمایہ داری کی بنیادی خصوصیت ہے۔ یہی سبب ہے کہ پنجابیوں کا بورژوا قوم میں استحکام نہیں ہو سکا۔

کام کے ابتر حالات اور انتہائی قلیل اجرات کے سبب عام پرولتاریوں کی نمو کی رفتار بہت سست رہی۔ صنعتی پرولتاریہ کی پرت تعداد کے لحاظ سے کم تھی اور شہری مزدوروں کی اکثریت کا گہرا تعلق دیہات سے تھا جہاں ان کے کنبے رہتے تھے۔ بنگال کی طرح مقامی مزدوروں کی نہیں بلکہ برصغیر کے دوسرے علاقوں ہندوستان، شمال مغربی سرحدی صوبے اور بلوچستان کے مزدوروں کی صنعت، ریلوے، بندرگاہوں اور تعمیر میں اکثریت رہی۔ دوسری طرف بہت سے پنجابی پرولتاریہ نے پنجاب کی سرحدوں کے باہر بھی جنم لیا۔ خاص کر بمبئی میں جہاں وہ عارضی طور پر کام کرنے جایا کرتے تھے۔

پرولتاریہ کی بڑی تعداد زرعی مزدوروں پر مشتمل تھی۔ بیسویں صدی کے شروع میں ساڑھے تین لاکھ تھے۔

برصغیر کے دوسرے علاقوں کی طرح پنجاب میں بھی مزدور طبقے کے سرمایہ دارانہ استحصال کی انتہائی شدید شکلیں عام تھیں جن کا مطلق قدر زائد پیدا کرنے سے تعلق تھا۔ اس سے مزدور فاقہ کشی اور غربت کا شکار رہتے تھے۔ چنانچہ ان کی تجدید پیداوار کو خطرہ رہا اور اجرتی مزدوروں کے پرولتاری طبقے میں مستحکم ہونے میں دیر لگی۔

بنگال کے مقابلے میں پنجابی بورژوا دانشور بھی آہستہ آہستہ ابھرے۔ یہ عمل پنجاب میں سرمایہ دارانہ ارتقا کی مجموعی طور پر پست سطح کے سبب تھا۔ایسے سرکاری حکام اور آزاد پیشوں کے ارکان پیدا کرنے کی غرض سے جو برطانوی نوآبادکاروں کے وفادار ہوں سامراجیوں نے پنجاب میں مغربی طرز کے کئی تعلیمی ادارے کھولے (لاہور میں اورینٹل کالج 1870 میں اور پنجاب یونیورسٹی لاہور 188 میں وغیرہ)۔

برصغیر کا شمال مغربی علاقہ عیسائی مبلغوں کی سرگرمیوں کا ایک خاص مرکز رہا۔انیسویں صدی کی ابتدا ہی میں انہوں نے انجیل کا پنجابی میں ترجمہ شائع کیا___ یہ پنجابی میں پہلی چھپی ہوئی کتاب تھی۔ پہلے پنجابی بورژوا دانشوروں نے جن کا تعلق صاحب ملکیت خاندانوں سے تھا ان اسکولوں میں تعلیم حاصل کی جنہیں مشنریوں اور نوآبادیاتی حکام نے کھولا تھا۔صرف انیسویں صدی کے آخر اور بیسویں صدی کے شروع میں خوشحال کسان، درمیانی کاروباری اور تاجر بھی پنجابی دانشوروں کی صفوں میں شامل ہوئے۔ مذہب کے لحاظ سے وہ زیادہ تر سکھ اور ہندو تھے۔ان میں مسلمان بھی تھے لیکن بہت کم۔ان دانشوروں میں سے بہت سوں نے آگے چل کر برطانیہ کے خلاف پروپیگنڈے اور سامراج دشمن جدوجہد میں حصہ لیا۔

انیسویں صدی کے آخر اور بیسویں صدی کی ابتدائی دھائیوں میں پنجاب کی معاشرتی معاشی اور ثقافتی تاریخ کے بنیادی پہلوؤں کا مطالعہ کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ برصغیر کے اس خطے میں سرمایہ دارانہ تعلقات قائم ہو چکے تھے اور ترقی کی راہ پر تھے۔مختلف علاقوں میں محنت کی علاقائی تقسیم ہو گئی تھی جو مخصوص تجارتی پیداوار کے حامل تھے۔ پنجاب کی قومی منڈی بڑھ رہی تھی۔ جن علاقوں میں پنجابی رہتے تھے وہاں نقل مکان زوروں پر تھی۔شہروں کی تعداد میں اضافہ ہو رہا تھا۔ لاہور، ملتان، سیالکوٹ پنجاب کے بنیادی سیاسی اور انتظامی، معاشی اور ثقافتی مرکز بنتے جا رہے تھے۔اس زمانے میں پنجاب کے معاشرے میں نظریاتی اور ثقافتی تبدیلیاں بھی ہو رہی تھیں۔اس عمل کا تعلق معاشرتی، طبقاتی ساخت میں تبدیلی سے تھا___ یعنی بورژوا، معاشرتے کے بنیادی طبقات اور معاشرتی پرتوں کی تشکیل سے: بورژوا، پرولیتاریہ اور بورژوا دانشور۔ پنجابی قومی زبان پروان چڑھ رہی تھی۔ پنجابی بیرونی عناصر اور دوسرے چھوٹے چھوٹے نسلیاتی گروہوں (بلوچی، راجھستانی، ایرانی وغیرہ)۔کو جذب کر رہے تھے☆۔اس عمل کا ایک ثبوت یہ

ہے کہ پنجابی زبان اپنے علاقے پر حاوی ہوتی جا رہی تھی اور بتدریج دوسری بولیوں کی جگہ لے رہی تھی جنہیں چھوٹے نسلیاتی گروہ پنجاب میں استعمال کیا کرتے تھے۔

ابھرتی ہوئی پنجابی قوم کی ایک امتیازی خصوصیت یہ تھی کہ بنیادی طور پر سرمایہ دارانہ تعلقات وسیع اور گہرے نہ ہونے کے سبب جاگیرداری کی باقیات اور مذہبی نظریات حاوی تھے، مختلف علاقوں میں معاشرتی معاشی ارتقا یکساں نہ تھا، ابھرتی ہوئی قومی زبان (ایک ادبی زبان کی حیثیت سے) اپنے دامن میں تمام پنجابی معاشرے کو، ادب اور ثقافت کی تمام شکلوں کو نہ لے سکی۔ اسی لئے پنجابی کے ساتھ ساتھ اردو اور ہندی اور ایک حد تک فارسی ادبی زبانوں کی طرح رائج رہیں اور انہوں نے ترقی بھی کی۔ اس کے علاوہ پنجابی کے مقابلے میں وہاں اردو اور ہندی میں کہیں زیادہ کتابیں شائع ہوئیں۔

اردو نے ایک ادبی زبان کی حیثیت سے پنجاب میں اہم مقام حاصل کیا۔ 1931 میں وہاں پنجابی کے مقابلے میں اردو کے پڑھے لکھے لوگوں کی تعداد 4.5 گنی تھی__198000 کے مقابلے میں 908000۔ ''اورینٹل کالج میگزین'' کی طرح بعض رسالے تیسری اور چوتھی دھائی میں اردو اور پنجابی دونوں میں شائع ہوتے تھے۔

اس کے کئی اسباب ہیں۔ ان میں سے ایک سوویت ماہر شرقیات دیاکوف نے یوں بیان کیا ہے: جب پنجاب برطانیہ کی حکمرانی میں آ گیا تو برصغیر کے اس خطے میں سرکاری اسکولوں میں اردو بطور سرکاری زبان رائج کی گئی۔ ایک اور وجہ یہ ہے کہ انیسویں صدی کی آٹھویں دھائی سے مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے سربراہوں اور ان کے ہم نشینوں نے پنجاب کے مسلمانوں میں بڑے جوش وخروش سے اردو کو فروغ دیا (جو آبادی کی اکثریت تھے) ☆۔ پنجابی صاحب ملکیت کے افراد اور ابھرتے ہوئے دانشور علی گڑھ جا کر اردو کی تعلیم حاصل کیا کرتے تھے اس لئے کہ وہ بہت مقبول تھی۔

☆ 1911 میں پنجاب میں 70600 بلوچی زبان بولنے والے رہتے تھے۔ 1901 میں ان کی تعداد گھٹ کر 4700 رہ گئی۔ اس عرصے میں بلوچوں نے پنجاب نہیں چھوڑا۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ وہ پنجابیوں میں جذب ہو گئے۔

پنجابیوں میں اردو کے پھیلنے کی ایک اور وجہ یہ بھی ہے کہ پنجاب اور ہندستان کے عوام اپنے مشترکہ دشمن برطانوی نوآبادکاروں کے خلاف شانہ بشانہ لڑے۔ ہندستان نے پنجاب کی معاشرتی سیاسی زندگی

پر کافی اثر ڈالا۔ ان ہی تمام وجوحات کی بنا پر ابھرتی ہوئی پنجابی قوم کی اردو ادبی زبان بن گئی۔ اس کے علاوہ اردو اور پنجابی زبانیں آپس میں بہت ملتی جلتی ہیں☆☆۔ یہ قومی تحریک آزادی کا تقاضہ اور منطق تھی جس کی وجہ سے پنجاب کے سیاسی رہبروں، مفکروں، شاعروں، ادیبوں اور صافیوں (علامہ اقبال، ظفرعلی خاں، حفیظ جالندھری، کرشن چندر وغیرہ) نے اردو کو اپنا ذریعہ اظہار بنایا۔

پنجابی زبان کی نشو ونما میں ان خصوصیات اور خارجی مشکلات کے باوجود یہ کہا جا سکتا ہے کہ انیسویں صدی کے آخر اور بیسویں صدی کی ابتدا میں لاہور امرتسر کے علاقے کی بولی کی بنیاد پر پنجابی قومی زبان کی تشکیل ہوئی۔ بتدریج ادبی اور بات چیت کی زبان کی درمیان فرق کم ہوتا گیا۔ اس عمل میں پنجابی سکھ مصنفین کا بڑا حصہ ہے جنہوں نے عام لوگوں کی زبان میں ادب تحریر کیا۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ آج بھی بولیوں میں فرق کے باوجود وہ ایک واحد پنجابی زبان تسلیم کی جاتی ہیں۔

انیسویں صدی کے آخر اور بیسویں صدی کے شروع میں پنجابی معاشرے کی معاشی بنیاد اور معاشرتی ڈھانچے میں جو تبدیلیاں ہوئیں ان کا بالائی ڈھانچے کے عوامل پر بھی اثر پڑا۔ بعض نظریاتی ردو بدل نظر آئے۔ معاشرے کے ترقی پسند حلقوں میں محبت وطن

☆ 1881 اور 1911 کے درمیان پنجاب کی آبادی میں مسلمان 51 فیصدی ہندو تقریباً 36 فیصدی اور سکھ تقریباً 12 فیصدی تھے۔

☆☆ ابھی تک یہ دلچسپ بحث چلی آ رہی ہے کہ اردو کا سرچشمہ کیا ہے ___ کھڑی بولی جو دھلی کے ارد گرد بولی جاتی تھی یا لاہوری (ماجھی) جو پنجابی بولی تھی۔

تحریکوں اور سامراج دشمن جذبات کی وجہ سے پنجاب کی تاریخ اور اس کے ماضی سے دلچسپی پیدا ہوئی۔ پنجاب کا ادب اور اس کی تاریخ کا مطالعہ کرنے کی غرض سے کئی انجمنیں قائم ہوئیں۔

اسی دور میں جدید پنجابی ادب نے جنم لیا۔ اگرچہ اس کی نشو ونما کی راہ میں پنجاب کی عام ثقافتی پسماندگی، عوام الناس کی ناخواندگی اور مذہبی اور ذاتوں کی بنیاد پر تقسیم حائل ہوئی، پھر بھی 1875 اور 1880 کے درمیان پنجابی زبان میں 784 کتابیں شائع ہوئیں۔

یہ بات ذہن نشین کرنا ضروری ہے کہ مسلمانوں، ہندوؤں اور سکھوں سب ہی نے پنجابی کو ادبی زبان کی حیثیت سے استعمال کیا۔ کئی مسلمان پنجابیوں نے اپنی مادری زبان میں کتابیں لکھیں اور شائع

کیں۔ دلچسپ چیز یہ ہے کہ موضوعات خالص مذہبی اسلامی تھے۔ یہ صحیح ہے کہ سکھوں کو گرمکھی، ہندوؤں کو دیوناگری اور مسلمانوں کو اردو رسم الخط میں بھی شائع کیں۔ پنجابی ادبیات کے لئے رسم الخط منتخب کرنے میں طباعت کی اور دوسری ٹیکنکی آسانیاں پیش نظر رکھنا بھی ضروری تھا۔ پنجاب کی جدید تاریخ میں ہمیں جو گہرا مذہبی اور فرقہ وارانہ تعصب نظر آتا ہے وہ برطانوی نوآبادکاروں کی جانی بوجھی پالیسی اور ان کے مقامی رجعت پرست حاشیہ برداروں کی کوششوں کا نتیجہ تھا۔ لیکن انیسویں صدی کے آخر اور بیسویں صدی کے آغاز میں جدید پنجابی ادب کی تشکیل میں اس تعصب نے کوئی خاص کردار ادا نہیں کیا۔

بیسویں صدی کے شروع میں پنجابی ادب میں جدید طرز نگارشات مثلاً ناول، افسانہ، کہانی لکھے جانے لگے۔ تیسری دھائی میں پنجابی ڈرامہ ظہور میں آیا۔ اس کے بعد جب پنجاب میں اخبارات اور رسائل کی اشاعت شروع ہوئی تو پنجابی صحافت وجود میں آئی۔ افسانوی ادب میں نت نئے موضاعات شامل ہوئے، شاعروں، ادیبوں اور ڈرامہ نویسوں نے اپنے اردگرد کی زندگی سے وجدان حاصل کیا۔ معاشرتی برائیوں اور عدم مساوات کی نکتہ چینی کی گئی، ظالم سامراجیوں کا پردہ چاک کیا گیا اور پنجابی عوام سے اپیل کی گئی کہ وہ آزادی کے لئے جدوجہد کریں۔ ہماری صدی کی تیسری دھائی سے پنجابی مصنفوں نے اشتراکیت کے خیالات پھیلانا شروع کئے۔ پنجابی مصنفین کی انجمنیں قائم ہوئیں۔

افسانوی ادب کے علاوہ فن تعمیر، فنون لطیفہ، تاریخ، لسانیات، فلسفے، معاشیات جغرافیہ، طب، قانون، فن حرب، تعلیم پر پنجابی زبان میں کتابیں لکھی گئیں اور شائع ہوئیں۔ لکھنے والوں میں مسلمان، ہندو، سکھ اور عیسائی سب ہی شامل تھے۔ پنجابی قوم کے تشکیل کے ساتھ ساتھ پنجابی زبان بھی سیاست، معیشت اور ثقافت کے میدانوں میں داخل ہوئی۔ لیکن اس رجحان نے 1947 تک زیادہ نشوونما نہیں پائی۔

پنجاب میں سرمایہ دارانہ طریقہ پیداوار کا ارتقا اور وہاں کے لوگوں کا پنجابی بورژوا قوم میں استحکام سامراج مخالف جاگیرداری مخالف نوعیت کی قومی آزادی کی عوامی تحریک کے پہلو بہ پہلو ہوا۔

چونکہ پنجابیوں اور پاکستان کے دوسرے عوام کی قومی تحریک کی تاریخ اور خصوصیات کے متعلق ایک علحدہ تصنیف☆ میں بتایا جا چکا ہے اس لئے ان کے متعلق ہم یہاں تفصیل سے بحث نہیں کریں گے۔ لیکن ایک اہم نکتے کا ذکر کرنا ضروری ہے۔

برصغیر کے عوام کی قومی آزادی کی تحریکیں دراصل ابھرتی ہوئی قوموں کی تحریکیں تھیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کا ایک بنیادی مقصد ان رکاوٹوں کو ہٹا دینا تھا جنہیں برطانوی نوآبادکاروں اور ان دلالوں نے قومی استحکام کی راہ میں تمام برصغیر میں ڈال رکھی تھیں۔

چونکہ قومی استحکام مکمل نہیں ہوا تھا اس لئے جاگیردارانہ تصورات اور تعصّبات ان لوگوں کے راستے میں حائل رہتے تھے جو آزادی کی جدوجہد میں مصروف تھے۔ مزید برآں، اس عنصر نے نہ صرف قومی تحریک آزادی کو کمزور بنایا بلکہ نوآبادی کاروں کو موقع دیا کہ وہ آزادی کی قوتوں میں پھوٹ ڈالنے کے لئے جاگیردارانہ تعصّبات کو استعمال کریں۔

ایک اور عنصر جس نے نوآبادکاروں کی پھوٹ ڈالنے کی پالیسی

☆یوری گنوک فسکی، ''پاکستان میں قومی سوال اور قومی تحریک'' (روسی زبان میں)۔

کو کامیاب بنایا یہ تھا کہ ابھرتا ہوا بورژوازی قومی تحریکوں کا رہنما تھا۔ اس کے جاگیرداروں اور برطانوی سرمایہ داروں سے گہرے رشتے تھے (اور اسی دوعملی نے اس کی پالیسی کو غیر ثابت قدم بنایا)۔ اسی لئے وہ متضاد گروھوں اور فرقوں میں بٹ گیا۔

جب برصغیر کے عوام نے ان خارجی مشکلات پر عبور حاصل کر لیا، جاگیرداری مخالف اور سامراج مخالف قوتیں متحد ہوگئیں اور جاگیرداری سے ورثے میں پائے ہوئے نظریاتی خیالات دور کر دیے گئے تو قومی آزادی کی تحریکوں نے بڑا زور پکڑا۔ تحریک آزادی نے قومی شعور کی تشکیل میں بہت مدد دی۔ اس طرح بورژوا قوموں میں برصغیر کے عوام کی تشکیل مکمل ہوئی۔

☆☆☆

نوآبادیاتی دور میں سندھ کے معاشرتی معاشی ارتقا کی خصوصیت نے بنیادی طور پر سندھی بورژوا قوم کی تشکیل کے امتیازات معین کئے۔ جب برصغیر کا یہ علاقہ (دوسرے خطوں کی طرح) حاکم ملک کا زرعی ضمیمہ بن گیا تو اس سے زراعت میں برآمدی شاخوں کو ترقی دینے کی ترغیب ملی اور جنس زر کے تعلقات بڑے۔ بعض رقبے معین قسم کی پیداوار کے لئے تخصیص کر دئے گئے۔ زمیندارانہ ملکیت کی جڑیں مزید گہری ہوگئیں۔ جیسا کہ اوپر بیان کیا جاچکا ہے قبل از نوآبادیاتی دور ہی میں سندھ کی اجتماعی زندگی میں انتشار شروع ہوگیا تھا۔ مقامی کسان اپنے پڑوسی پنجاب کے مقابلے میں بڑی تیزی سے زمینوں سے محروم

ہو رہے تھے۔ بیسویں صدی کے آغاز میں کل زمین کے 80 فیصدی حصے پر غیر میعادی مزارع کاشت کرتے تھے۔

برطانوی سامراجیوں کے ہاتھوں سندھ کے استحصال کی بدولت تجارتی اور ساھوکاری سرمائے میں اضافہ ہوا۔ اس کے نمائندے برطانوی فرموں کے دلالوں کا کام کرتے تھے، زیادہ تر زرعی پیداوار کی برآمد پر ان کا قبضہ تھا۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ اکثر زمیندار (کسان اور چھوٹے زمیندار) ساھوکاروں کے قرضے کی زنجیروں میں جکڑ گئے اور انہیں اپنی املاک سے ہاتھ دھونا پڑا۔ چنانچہ بیسویں صدی کے شروع میں سندھ کی کل قابل کاشت زمین کا 42 فیصدی حصہ ساھوکاروں کے چنگل میں آ چکا تھا۔

ریلوں کی تعمیر، شمالی سندھ میں نہری نظام، برآمدی اور اندرونی تجارت میں فروغ ہونے سے شہروں کو بڑی ترقی نصیب ہوئی۔ کراچی☆ سندھ کا سب سے بڑا معاشی، انتظامی اور ثقافتی مرکز بن گیا۔ حیدرآباد، شکارپور اور سکھر بھی پھلے پھولے☆☆ نقل مکان بہت تیز ہوئی۔ بعض خود کفیل علاقوں کی معاشی تقسیم اور علیحدگی ختم ہوگئی۔ بعض لوگوں میں اور علاقائی بنیاد پر تقسیم محنت بڑھنے لگی تو معاشی زندگی میں اجتماعیت پیدا ہوئی، جو سرمایہ دارانہ تشکیل کی بنیاد ہے۔

انیسویں صدی کی آخری دھائیوں میں سندھ میں بورژوا معاشرے کے بنیادی طبقات اور معاشرتی پرتیں ابھرنے لگیں۔ مقامی بورژوازی کے بیشتر حصے کا تولیدی تعلق ہندو ذاتوں سے تھا__ لوہانا، کھتری، ساھتا، چھپرو وغیرہ۔ سندھ میں برطانوی حکمرانوں نے سرمایہ دار کاروبار بڑھانے میں رکاوٹیں ڈالیں۔ نتیجہ یہ نکلا کہ سندھی بورژوازی نہ صرف صوبے بلکہ برصغیر کی سرحدوں سے بھی باہر ابھرا۔ سب سے پہلے پوھومل نے مصر میں سرمایہ دارانہ کاروبار قائم کیا۔ ایک اور واسی مل نے ملایا میں اپنا بیوپار جمایا۔ شری ٹھاکر اپنی کتاب ''سندھی ثقافت'' میں لکھتے ہیں: ''بھاری منافع اور خوشحالی کے سبب حیدرآباد، شکارپور اور دوسرے مقامات کے کئی تاجر کرہ ارض کے مختلف گوشوں میں چلے گئے...وہ دنیا کے کسی

☆1848 سے 1857 تک کراچی بندرگاہ پر نکاسی 44 لاکھ روپے سے بڑھ کر ایک کروڑ 42 لاکھ روپے ہوگئی، درآمد 2.4 تجارت گنی بڑھی اور برآمد میں 4.7 گنا اضافہ ہوا۔ آئندہ 6 برسوں میں تجارت 28 گنی ہوگئی۔ شہر کی آبادی نے بھی اسی رفتار سے ترقی کی۔ برطانیہ کے قبضے سے عین پہلے کراچی

کی آبادی 14 ہزار تھی جو 1881 میں 68 ہزار ہوگئی اور 1891 میں تقریباً ایک لاکھ۔

☆ سندھ کی شہری آبادی 1881 میں 10.3 فیصدی تھی، 1931 میں 17.4 میں اور 1941 میں 18.9 فیصدی۔

بھی حصے میں ہوں مینیجروں، حصے داروں، محرروں یہاں تک کہ معمولی نوکروں کے لئے سندھی ہندوؤں ہی کو رکھتے تھے جو تمام سندھ سے حاصل کئے جاتے تھے،،۔

سندھی بورژوازی کی نشوونما میں ایک اور عنصر حائل تھا۔ یہ تھا بمبئی، گجرات اور راجھستان کے کاروباریوں سے مقابلہ۔ سندھ میں ''تجارت اور صنعت زیادہ تر بیرونی لوگوں کے ہاتھ میں تھی،، ☆۔

صوبے کے نوآبادیاتی ہونے سے سندھی پرولیتاریہ کی تشکیل پر بھی منفی اثر پڑا۔ بیسویں صدی کے آغاز میں سندھ میں کل 40 چھوٹے صنعتی کاروبار تھے جن میں تقریباً 8 ہزار مزدور کام کرتے تھے۔ ان میں سے 75 فیصدی کپاس کو صاف کرنے اور بیلنے والی ملوں کے مزدور تھے برطانوی فرموں کو برآمد کی جاتی تھی۔

سندھ میں قابل کاشت زمین پر آبادی انتہائی زیادہ گنجان تھی۔ اس لئے آجر محنت کی قدر سے بھی کم پرولیتاریوں کو اجرتیں دیتے تھے ☆☆۔ اس سے سرمایہ دارانہ کاروبار کے مالکوں کو زائد منافع حاصل ہوتا تھا اور عام مزدوروں کو منظّم کرنے میں بھی مشکلات ہوتی تھیں۔ گہرے ذات پات کے تعصّبات نے بھی مزدوروں کی تنظیم کو مضبوط نہیں ہونے دیا۔

سندھی بورژوا دانشوروں کی بالیدگی کا عمل بھی سست رہا۔ ان کا تعلق زمینداروں سے تھا جو برطانوی حکمرانوں کی لگان کی پالیسی کے سبب اپنی املاک سے ہاتھ دھو بیٹھے تھے۔ ان کے سامنے صرف ایک راہ تھی ــــ نوآبادیاتی انتظامیے میں نوکری کرنا۔ اس کے لئے انہوں نے مغربی تعلیم حاصل کی جس کے بغیر کارکی بھی حاصل نہیں ہوسکتی تھی ☆☆☆۔ لیکن 1920 تک سندھی دانشوروں کی تعداد کم تھی۔ اگرچہ سندھ کی نوآبادیاتی حیثیت کے خلاف ان کے دل میں جذبہ تھا اور وہ ناخوش تھے لیکن مسلمان زمینداروں کے ساتھ ان

O.H.K. Spate, <<India and Pakistan>>, p. 481.☆

☆☆ بیسویں صدی کے شروع میں ہنرمند مزدور کو زیادہ سے زیادہ ایک روپیہ اور غیر ہنرمند کو 4

آنے سے 8 آنے تک یومیہ اجرت ملتی تھی۔ (<<The Imperial Gazetteer of India>>, Vol. XXII, pp. 416__417)

☆☆ پیر حسام الدین راشدی، ''سندھی ادب،،، صفحہ 96۔

کے تعلقات کے سبب ان سامراج دشمن جذبات کا کردار مذہبی تھا۔

سرمایہ دارانہ عناصر کے ارتقا نے سندھی قومی زبان کی تشکیل اور سندھ کے معاشرے کے نظریے دونوں پر اپنا اثر ڈالا۔

انیسویں صدی کے آخر اور بیسویں صدی کی ابتدائی دہائیوں میں سندھی زبان نشیبی سندھ کی بولیوں کی بنیاد پر (سب سے زیادہ ترقی یافتہ علاقوں کی جن کے مرکز کراچی اور حیدرآباد تھے) پروان چڑھی اور اس میں بہترین سندھی مصنفین نے بڑھ بڑھ کر حصہ لیا۔ انیسویں صدی کے آخر سے سندھی زبان اسکولوں، مقامی انتظامیے اور نچلی عدالتوں میں استعمال کی جانے لگی۔ خواندگی میں اضافے، اخباروں رسالوں کی اشاعت اور شہروں کے پھیلنے سے ادبی زبان اور مقامی بولیاں ایک دوسرے میں گھل مل گئیں۔ سندھی رسم الخط کی اصلاح (اس کا بیڑہ وتھان صاحب نے انیسویں صدی کے وسط میں اٹھایا تھا)، سندھی قواعد پر کئی کتابوں کی اشاعت اور سندھی زبان کی تاریخ کی بابت تصانیف (دیوان پر بھاداس آنندرام اور مرزا صادق علی شاہ بہادر) ☆ نے ادبی زبان کی بنیادی مضبوط کیں۔

جب سندھیوں نے قومی استحکام کی راہ اختیار کی تو انہوں نے بیرونی عناصر بھی جذب کئے (بلوچ، بروھی، راجھستانی، عرب، ایرانی)۔ سندھی نے جدا جدا نسلیاتی گروھوں کی بولیوں کی جگہ لے لی اور نوآبادیاتی عہد کے آخر تک غالب زبان بن گئی۔ جو نسلیاتی تبدیلی ہو رہی ہے اس کا ایک ثبوت یہ ہے کہ سندھی بولنے والوں کی تعداد ان لوگوں سے زیادہ ہے جو اسے اپنی مادری زبان سمجھتے ہیں ☆☆۔

انیسویں صدی کی آخر دہائیوں میں سندھ میں روشن خیالی کے کئی ھادی پیدا ہوئے۔ ان میں مولوی اللہ بخش ابوجھا (وفات 1901) سب سے زیادہ نمایاں تھے۔ اپنی تصنیفات میں انہوں نے سندھ کے زوال کے اسباب بتائے اور اس کی ترقی کا راستہ دکھایا۔ وہ جدید تعلیم کے علم بردار تھے۔ انہوں نے سندھ کی تاریخ میں پہلی بار کراچی میں لڑکیوں کا اسکول کھولا۔ اردو کے مشہور شاعر

☆ پیر حسام الدین راشدی، ''سندھی ادب'' صفحہ 83۔

☆☆''مردم شماری پاکستان، 1951''، جلد 6، صفحہ 105۔

اور مصلح مولانا الطاف حسین حالی (1837__1914) نے مولوی اللہ بخش کے نظریات اور عمل کو ڈھالنے میں بہت بڑا کردار ادا کیا۔

انیسویں صدی کے آخر میں سندھ میں عوامی تنظیمیں ابھرنا شروع ہوئیں جن کا مقصد ''قومی اصلاح'' تھا۔ اسی کے زیر اثر مغربی نمونے کے اسکول قائم ہونے لگے جہاں سندھی میں تعلیم دی جاتی تھی۔

جدید سندھی ادب نے انیسویں صدی کے آخری نصف میں جنم لیا۔ اس کی نشو ونما میں سندھی نثر کے بانی اور کئی مقبول ناولوں کے مصنف مرزا قلیچ بیگ (1855_1929) کا بڑا ہاتھ ہے۔

سندھی رسالوں کی اشاعت اور سندھی صحافت کی ابتدا کے سلسلے میں مرزا قلیچ بیگ، حکیم فتح محمد سوستانی، جیٹھامل پرس رام کے نام گنائے جاسکتے ہیں۔

بیسویں صدی کی پہلی دھائیوں میں سندھی میں پہلی بار افسانوی ادب اور تاریخی رسالے شائع ہوئے (''تعلیم،، ''الکشف'' اور ''توحید'')۔ نت نئے اسلوب تخلیق کئے گئے۔ سندھی مصنفین (کریمل، اخوند لطف اللہ ولید قریشی، حاجی امام بخش وغیرہ) نے نئی ادبی تخلیقات کیں اور فارسی، اردو، سنسکرت اور یورپی زبانوں کے ادب پاروں کے ترجمے کئے۔ ان تخلیقات اور ترجموں کے موضوع نوع بنوع تھے___ تاریخ، جغرافیہ، ادبی تنقید، تعلیم۔ ترقی پسند مصنفین نے نئے معاشرتی مسائل پیش کئے، سامراجی غلامی کی مذہب کی، اور معاشرتی مسائل پیش کئے، سامراجی غلامی کی مذمت کی، اور معاشرتی اخلاقی اصلاحات کا مطالبہ کیا۔ بعض طنز نگاروں (محمود ہاشم مخلص، نور محمد نظامانی، شمس الدین بلبل) نے سندھ کے ان بالائی طبقات سے تعلقات رکھنے والوں کا خوب مذاق اڑایا جو برطانوی نوآبادکاروں کے سامنے سجدے کیا کرتے تھے، انہوں نے خالص سندھی ثقافت کے لئے آواز بلند کی۔

جدید سندھی ادب کو ترقی دینے میں مسلمانوں کے علاوہ ہندوؤں کا بھی بڑا ہاتھ ہے۔

سندھیوں کے قومی فرقے کی تشکیل کا اظہار ان کے قومی شعور اور قومی تحریک سے ہوا۔

☆☆☆

پشتونوں اور بلوچوں کا جن حالات میں قومی استحکام ہوا وہ پنجابیوں اور سندھیوں کے مقابلے میں

زیادہ پیچیدہ تھے۔

1893 میں ڈیورانڈ لائن نے کئی پشتون قبائل (مہمند، شنواری، آفریدی، وزیری، کگڑ وغیرہ) کو افغانستان اور برطانوی ہند میں بانٹ دیا۔ اکتوبر 1901 میں جب شمال مغربی سرحدی صوبہ قائم ہوا تو پشتونوں کی سرزمین ایک بار پھر تقسیم کر دی گئی، اس مرتبہ انتظامیے کی حدود کے ذریعے۔ پشتون قبائل (کگڑ، پنی، ترین، شیرانی) کا ایک حصہ بلوچستان میں شامل کر دیا گیا اور کوہستانی پشتون میدانی پشتونوں سے جدا کر دئے گئے۔ مزید برآں، چند ایسے علاقے جہاں غیر پشتون آباد تھے صوبہ سرحد میں ملا دئے گئے۔

جن علاقوں میں پشتون اور بلوچ آباد تھے ان کی انتظامی تقسیم نے پشتونوں اور بلوچوں کا قومی استحکام مشکل بنا دیا۔ اس کے علاوہ دو رکاوٹیں اور تھیں ــــ پشتون اور بلوچی قبائل کی ایک دوسرے سے معاشی عدم مطابقت اور معاشرتی ارتقا کی مختلف سطحیں۔ پہاڑی علاقے ایک دوسرے سے علحدہ تھے، ان کے درمیان باہمی رابطہ نہیں تھا۔ پھر دوسری برطانوی افغانی جنگ (1878_80) کے بعد برطانوی نوآبادکاروں نے ان علاقوں کو مصنوعی طریقے سے ایک دوسرے سے جدا کر دیا جہاں پشتون اور بلوچی قبائل آباد تھے۔ ان عناصر کے سبب جاگیردارانہ تعلقات محفوظ رہے اور پشتونوں اور بلوچوں کی ذہنیت اور عام زندگی میں گہرے قبائلی تعصّبات باقی رہے☆۔ یہی وجہ ہے کہ جرگہ تنظیم ــــ خاندانوں کے مرد سربراہوں کی کونسل ــــ اکثر علاقوں میں جاری رہی حالانکہ

☆ یہ باقیات انیسویں صدی کے آخر اور اس کے بعد بھی موجود رہیں۔ مثلاً یوسف زئیوں میں پابندی سے زمین تقسیم کرنے کا رواج (ویش) پہلی عالمی جنگ کے بعد ختم ہوا۔ ایک بڑے بلوچی قبیلے ماری میں جو ڈیرہ غازی اسمٰعیل خاں تقریباً 10 ہزار مربع کلومیٹر کے رقبے پر بسا ہوا ہے تمام زمین مشترکہ ملکیت خیال کی جاتی تھی۔ دوسری عالمی جنگ کے بعد ہی اس کی تقسیم ہوئی۔ قبائل کے اکثر سرخیل تومان دار، سردار، خان اور ملک انیسویں صدی کے اختتام تک بڑے بڑے زمیندار بن چکے تھے۔

ان علاقوں میں جہاں پشتون بسے ہوئے تھے۔ سرمایہ دارانہ عناصر کا ارتقا انیسویں صدی کے آخر میں شروع ہوا۔ شہری آبادی بڑھی، تجارتی بورژوازی اور قلیل تعداد میں مغربی تعلیم یافتہ بورژوا زمیندار دانشور ابھرے۔ زمینداروں کی نجی ملکیت وجود میں آئی۔ منڈی کے لئے زرعی پیداوار میں اضافہ ہوا۔

زرعی پیداوار میں اضافے کے ساتھ ساتھ (برآمدی تجارت بڑھنے کے سبب) ایسے جدا جدا علاقے بھی وجود میں آئے جو معین فصلیں پیدا کرنے کے لئے مخصوص تھے۔ اس سے ان علاقوں کے درمیان تبادلہ شروع ہوا اور قومی منڈی کی تشکیل میں مدد ملی☆۔

لگان جنس کے بجائے نقد میں لیا جانے لگا۔ اس سے پشتون کسان مختلف پرتوں میں بٹنے لگے۔ بعض کسانوں کو اپنی زمینیں زمینداروں اور ساہوکاروں کے حوالے کرنا پڑیں۔ یہاں یہ بات پیش نظر رکھنے کی ضرورت ہے کہ پہلے بھی انیسویں صدی کے وسط میں یہ عوامل موجود تھے۔ ان کا ان علاقوں پر احاطہ تھا جو بعد میں ڈیورانڈ لائن کے مغرب اور مشرق میں آ گئے۔ مثلاً بنوں میں انیسویں صدی کے وسط تک زیادہ تر زمین کے مالک ساہوکار تھے اور باحقوق عام لوگوں کے مقابلے میں ہمسایوں (حقوق سے محروم غریبوں) کی تعداد دگنی تھی۔ سندھ کے دائیں ساحل پر برطانوی نوآبادیاتی حکمرانی قائم ہونے کے بعد ٹیکسوں کی بھرمار ہو گئی۔ چنانچہ پشتون کسان تیزی سے زمین سے محروم ہونے لگے۔

(برطانوی ہند کے دوسرے علاقوں کی طرح) زمینداروں کو اپنے معاشرتی ستون بنانے کی غرض سے برطانوی حکام نے مشترکہ اور کسانوں

☆ پہاڑی علاقوں جہاں پشتون قبائل مویشی بانی کرتے تھے اور میدانوں کے درمیان اچھی خاصی تجارت ہوتی تھی۔ آزاد قبائلی علاقے اور دیر اور سوات کی ریاستوں سے انتظامیہ کے علاقوں میں مویشی، اون، چمڑہ، لکڑی، ایندھن، رسیاں، پھل، آلو، تمباکو، دستکاری کی اشیا آتی تھیں اور انتظامیے کے علاقے پہاڑی خطوں کو گیہوں، مکئی، نمک، ماچس، دھات کے ظروف، کپڑا بھیجتے تھے۔

کی زمین کا استحصال کرنے اور ان پر قابض ہونے میں ان کی مدد کی، انہیں فیاضی سے جاگیریں بخشیں (جو جلد ہی نجی ملکیت بن گئیں) اور خطابات عطا کئے☆۔ اس پالیسی کی بدولت صوبہ سرحد کے انتظامیے کے علاقوں میں بیسویں صدی کی چوتھی دہائی تک تمام قابل کاشت زمین کا 60 فیصدی حصہ پشتون زمینداروں کے قبضے میں آ گیا۔ مزارعوں، جن کا اس زمین پر کوئی حق نہیں تھا جس پر وہ کاشت کرتے تھے، اور کھیت مزدوروں کی تعداد کل زرعی آبادی کا 48 فیصدی حصہ ہو گئی۔ صرف 1911 سے 1931 تک مالک کسانوں کا تناسب گھٹ کر 72.5 فیصدی سے 42 فیصدی رہ گیا☆☆۔

زمیندار کی نجی ملکیت کی تشکیل اور پشتون کسانوں کی پرت بندی ہونے کے پہلو بہ پہلو پشتون

دولت مند تاجر بھی ابھرے۔ یہ لوگ پہلے بیرونی تجارت میں بیچ کے بیوپاری ہوا کرتے تھے۔ یہ بات قابل فہم ہے چونکہ تجارتی سرمایہ کم از کم ابتدا میں ان بیرونی صارفوں سے ہی منافع حاصل کر سکتا تھا جو مقامی پیداوار کو استعمال کرتے تھے یا بیرونی پیداوار کے مقامی صارفوں سے۔ بعد میں جب جنس زر کے تعلقات بڑھے تو بتدریج وہ پشتون سے آباد پہاڑی علاقوں اور میدانوں کے درمیان اور پھیلتے ہوئے شہروں اور زرعی دیہات کے درمیان اندرونی تجارت پر حاوی ہوتے گئے۔

سڑکوں اور ریلوں کی تعمیر اور گزرگاہوں پر حفاظتی تدابیر کی بدولت پشتون تجارتی سرمایہ خوب بڑھا۔
پشتونوں کی سرزمین پر دستکاری کی پیداوار میں خاصی تخصیص

☆☆ مثلاً خواجہ محمد خاں خٹک کو برطانوی حکام کی خدمات انجام دینے کے عوض خٹکوں کی سرزمین کا مغربی حصہ بطور جاگیر اور خاں بہادر اور نواب کے خطابوں سے نوازا گیا۔ ایسی اور بہت سی مثالیں دی جا سکتی ہیں۔

☆☆ ڈیورانڈ لائن کے مغربی علاقوں میں بھی زمینداری ملکیت بڑھی۔ اس کا عمل انیسویں صدی میں شروع ہو گیا تھا۔ جب امان اللہ خاں (1919_1929) نے لگان میں اصلاحات کیں تو یہ عمل اور تیز ہو گیا جس کے تحت زمین کی خرید و فروخت پر تمام پابندیاں منسوخ کر دی گئیں۔

ہونے لگی۔ کئی ترقی یافتہ علاقوں میں کارخانوں کے بنے ہوئے برطانوی سامان سے مقابلے کی وجہ سے بہت سے دستکاروں کا دیوالیہ نکل گیا۔ وہ بیچ کے بیوپاریوں، ساہوکاروں، بیرونی فرموں کے دلالوں کے جال میں پھنس گئے۔ عملاً وہ گھریلو مزدور بن گئے۔ اس سے پشتون زمینداروں اور تاجروں کے لئے یہ ممکن ہو سکا کہ وہ جمع شدہ رقموں کو صنعتی پیداوار میں صرف کر سکیں۔

ابتدائی صنعتی اور نقل و حمل کے کاروبار کے قیام سے بورژوازی اور پرولیتاریہ ابھرنے لگے۔ محنت کی منڈی تشکیل پانے لگی۔

سرمایہ دارانہ تعلقات کا ارتقا او بورژوا معاشرے کے طبقات کی تشکیل مختلف پشتون علاقوں میں ایک دوسرے سے کافی مختلف ہوئی۔ میدانی خطوں میں جن کے شہری مرکزوں سے گہرے رابطے تھے یہ عمل زیادہ توانا تھا۔ لیکن پہاڑی وادیوں میں سرمایہ داری دوسری عالمی جنگ کے خاتمے تک اپنی ابتدائی منزل میں ہی رہی۔ جاگیردارانہ تعلقات جو جرگہ نظام کی باقیات کی وجہ سے بوجھل ہو گئے تھے معاشرے

پر حاوی رہے۔

یہ عمل اگرچہ یکساں نہیں تھا لیکن اس میں کوئی شبہ نہیں کہ 1947 میں بورژوا معاشرے کے بنیادی طبقات__ بورژوازی اور پرولیتاریہ موجود تھے۔

1901 اور 1947 کے درمیان جب پشاور اور مردان نے معاشی ترقی کی اور شہر پھیلے تو اندرونی نقل مکان بھی بڑھی۔ تباہ شدہ پشتون کسان روز افزوں تعداد میں نہ صرف قبائلی علاقوں بلکہ افغانستان تک سے صوبہ سرحد کے شہروں میں عارضی مزدوروں کی طرح آنے لگے۔ شہری آبادی کا تناسب بڑھنے لگا۔ نئے مدنی مرکز ابھرے☆۔

☆ پشاور کی آبادی 1901 میں 90147 (چھاؤنی میں 21804) تھی جو بڑھ کر 1941 میں 173420 ہوگئی۔ صرف 1931 سے 1941 تک صوبہ سرحد کے انتظامیے والے علاقوں کی آبادی میں 25.2 فیصدی اضافہ ہوا۔ 1941 میں شہری آبادی صوبے کی کل آبادی کا 18.2 فیصدی تھی (1911 میں 13 فیصدی)۔ 1901 سے 1941 تک شہری آبادی کی تعداد دگنی ہو گئی۔

شہری دستکاری، صنعت اور تجارت کے فروغ پانے سے شہر بہت بڑھے۔ 1931 میں انتظامیے کے علاقے کی ایک چوتھائی سے زیادہ خود کفیل آبادی دست کاری اور صنعتی پیداوار میں مصروف تھی☆۔

جیسے جیسے زیادہ لوگ دیہات سے شہر آئے پشتون شہروں کی آبادی نسلیاتی اعتبار سے بدلتی گئی۔ انیسویں صدی کی ابتدا میں جیسا کہ ہم پہلے لکھ چکے ہیں سرحد میں ایک بھی ایسا شہر نہ تھا جہاں تعداد کے لحاظ سے پشتون اکثریت میں ہوں۔ لیکن بیسویں صدی کی چوتھی دھائی میں شمال مغربی صوبہ سرحد کے 26 شہروں میں سے 15 شہروں میں ان کی اکثریت تھی۔ باقی دوسرے شہروں میں پشتونوں کا بڑا حصہ آباد تھا۔ شہری صنعت اور دستکاری میں جتنے مزدور کام کرتے تھے تقریباً ان کے نصف پشتون تھے۔ چھوٹے پیمانے کے کاروباروں کے مالکوں میں بھی ان کی تعداد زیادہ تھی۔

لیکن عام پرولیتاریوں کی تشکیل آہستہ ہوئی۔ بہت سے کسان اور دست کار جو شہر آتے تھے اپنے کنبوں کو دیہات ہی میں چھوڑ دیتے تھے کیونکہ قلیل اجرتیں ان ہی کے لئے کافی نہ ہوتی تھیں۔ 1931 میں صوبہ سرحد کے شہروں میں 1000 مردوں کے مقابلے میں 561.3 عورتیں تھیں (دیہات میں ان کی تعداد 872.2 تھی)

ڈیورانڈ لائن کے مشرق پشتون علاقے میں 1947 میں ایسے چند درجن کارخانے تھے جن میں 5__6 ہزار مزدور کام کرتے تھے۔ چھوٹے پیانے پر دستکاری قسم کے کاروباروں میں مزدوروں کی جتنی تعداد کام کرتی تھی ان کا شمار کرنا مشکل ہے۔ لیکن اتنا ضرور کہا جاسکتا ہے کہ وہ بہت زیادہ تھے۔ مزدور طبقے کی زیادہ

☆ وہ رسے، ٹوکریاں، موم، فرنیچر، چوب کاری، قالین، کپڑا، اونی کمبل، ہڈی کا آٹا، روغنی اشیا تیار کرتے تھے۔ غذائی صنعت خاص کر خشک اور ٹین بند پھلوں کی صنعت پر عمل کرنے کے 29 اور میرن شاہ میں 6 کارخانے تھے۔ پروفیسر نفیس احمد کا خیال قبائلی علاقوں سے حاصل کئے جاتے تھے (Nafis Ahmed, <<The Basis of Pakistan>>, pp. 147_149).

تعداد دیہی پرولیتاریہ پر مشتمل تھی۔ ان کی تعداد لاکھوں تک تھی۔

جن علاقوں میں پشتون آباد تھے وہاں سرمایہ داری کا ارتقا ابتدائی منزل میں رہا۔ اس لئے پشتون بورژوازی اور پرولیتاریہ سرحد سے باہر بھی ابھرے۔ پشتونوں کی مسلسل نقل مکان شمالی اور مغربی ہندستان کی جانب رہی جہاں تباہ شدہ کسان اپنی قوت محنت بیچ سکتے تھے ☆ اور پشتون تاجر اپنا سرمایہ بہ آسانی لگا کر نفع حاصل کرسکتے تھے۔

شمال مشرق بلوچستان میں اپنے آبائی علاقوں سے بھی پشتونوں نے نقل مکان کی۔ وہ زمین کھود نے اور مزدوری کرنے کے لئے نکلے۔

انیسویں صدی کے آخر اور بیسویں صدی کی ابتدائی دھائیوں میں بورژوا پشتون دانشوروں نے تشکیل پائی۔ یہ زمینداروں اور تاجروں کے بیٹے تھے جنہوں نے لاہور یونیورسٹی، علی گڑھ یونیورسٹی اور پشاور انگلش کالج (1855 میں قائم ہوا) میں تعلیم حاصل کی تھی۔ یہ لوگ صوبے کے انتظامیے میں اہلکار ہو گئے یا مدرس وکیل، ڈاکٹر وغیرہ بن گئے۔ ان میں سے کئی مشنری اسکولوں میں تعلیم سے فارغ ہوئے تھے۔ بعض تعلیم مکمل کرنے کے لئے یورپ گئے (مثلاً ڈاکٹر خاں صاحب جو مشہور سیاسی شخصیت گزرے ہیں)۔

یورپی طرز کے تعلیمی ادارے قائم ہونے سے پٹھان دانشوروں کی تعداد میں اضافہ ہوا ☆☆۔

اس کالج نے سب سے زیادہ دانشور پیدا کئے جسے عبدالقیوم خاں یوسف زئی نے 1913 میں پشاور میں

قائم کیا تھا۔

پٹھان معاشرے کے نظریات میں بھی اہم تبدیلیاں ہوئیں۔ مذہب کے لباس میں نئے خیالات کی وکالت کی گئی۔ خارجی طور پر ان کا مقصد فرسودہ جاگیردارانہ اداروں کی اصلاح کرنا اور انہیں ابھرتے ہوئے نئے بورژوا تعلقات کے مطابق بنانا تھا۔ سید جمال الدین افغانی (1838 تا 1897) اور ان کے پیروؤں کی سرگرمیوں کا ایک خاص مقصد یہی تھا۔

☆ جو رقم وہ گھر بھیجتے تھے وہ قلیل نہیں تھی۔ 1921 اور 1931 کے درمیان پنجاب میں پٹھان مزدوروں کی تعداد 34 ہزار سے بڑھ کر 53 ہزار ہوگئی، یعنی 55 فیصدی زیادہ۔ بمبئی میں پشتون عارضی مزدور کافی تعداد میں تھے۔ (1931 میں 11 ہزار سے زائد)۔

☆☆ 1903 میں صوبہ سرحد کے تعلیمی اداروں میں 26 ہزار طالب علم تھے۔

جدید پشتو ادب انیسویں صدی کے آخر سے شروع ہوا۔ قاضی میر احمد شاہ رضوانی (1863 تا 1937) منشی احمد جان (1882 تا 1951) محمود طرزی (1867 تا 1935) اور دیگر ادیبوں کو اس کا بانی کہنا چاہیئے۔ اسی دور میں صحافت کی داغ بیل پڑی اور پشتو میں اخباروں کی اشاعت شروع ہوئی۔ افسانوی ادب کے نئے اسلوب تخلیق کئے گئے۔ بورژوا روشن خیالی پھیلنے لگی اور پہلی عوامی ثقافتی تنظیمیں (ادبی انجمنیں) قائم ہوئیں۔ مقامی زبان اور لوک داستانوں سے دلچسپی بڑھی۔ یادگار پشتو لوک داستانیں جمع کر کے شائع کی گئیں۔ پشتو زبان کی پہلی قواعد، نصابی کتابیں اور لغات چھپیں۔ پشتو میں مغربی مصنفین اور سائنس دانوں کی تصانیف کا ترجمہ کیا گیا۔

پنجاب کی طرح پشتونوں کے علاقے میں بھی پشتون معاشرے کی بالائی پرت میں قومی زبان کے معیار تیزی سے نہیں بلند ہو سکے۔ یہی وجہ ہے کہ پشتو کے پہلو بہ پہلو فارسی اور اردو ادبی زبانوں کی حیثیت سے استعمال کی جاتی رہیں۔

کئی ماہرین لسانیات کے مطالعے سے ظاہر ہوتا ہے کہ حالیہ دہائیوں میں قومی پشتو زبان کے معیاروں کی تشکیل ہو رہی ہے۔ اپنے ارتقا کے دوران قومی زبان مشرقی پشتو کی ادبی شکلیں اختیار کر رہی ہے اور مغربی بولیوں سے الفاظ حاصل کر رہی ہے۔ اسکولوں، اخبارات، ریڈیو وغیرہ کی وساطت سے ادبی زبان مقامی بولیوں کی نشو ونما میں مدد دے رہی ہے۔ پشاور میں پشتو اکادمی قواعد زبان کے معیار

مرتب کرنے اور پشتو رسم الخط کو یکساں بنانے کے لئے سرگرم ہے۔ ترقی پسند پشتو ادیبوں اور شاعروں کی تخلیقات پشتو قومی زبان کی تشکیل میں اہم کردار ادا کر رہی ہیں۔

پشتونوں کا قومی استحکام جیسا جیسا مسلسل ترقی کر رہا ہے وہ بتدریج چھوٹی قومیتوں اور علحدہ نسلیاتی گروھوں کو اپنے اندر جذب کر رہے ہیں۔ ماہرین لسانیات اور نسلی جغرافیہ کے مشاہدات کے علاوہ یہ پاکستان کی 1951 کی مردم شماری سے بھی ثابت ہوتا ہے۔ صوبہ سرحد میں جو لوگ پشتو اپنی مادری زبان خیال کرتے ہیں ان کے مقابلے میں پشتو بولنے والوں کی تعداد ساڑھے تین لاکھ زیادہ تھی۔ یہ نسلیاتی تبدیلی کا ثبوت ہے جو قومی استحکام کی جلو میں ہوتی ہے۔

جیسے جیسے سرمایہ دارانہ تعلقات ترقی کر رہے ہیں اور پشتون ایک بورژوا قوم میں مستحکم ہو رہے ہیں ان کا قومی شعور بھی پختہ ہو رہا ہے اور قومی تحریک بھی توانا ہو رہی ہے۔ ان عوامل پر روس میں 19.5 اور 1917 کے انقلابی واقعات اور برصغیر میں تحریک آزادی نے دوررس اثرات ڈالے ہیں۔

جاگیردارانہ خیالات جنہیں مذہبی عقائد کہہ کر پیش کیا جاتا ہے آہستہ آہستہ کمزور ہوتے جا رہے ہیں۔ اور ان کی جگہ نظریات کی نئی شکلیں ابھر رہی ہیں۔ پشتون قومی اتحاد اس حقیقت پر مبنی ہے کہ تمام پشتونوں کا نسب مشترک ہے، ان کی زبان، روایات، رسوم یکساں ہیں، ان کی سرزمین ایک ہے۔ پشتون قومی نظریے کی ایک امتیازی خصوصیت اس کا سامراج دشمن، نوآبادیاتی نظام مخالف کردار ہے جو بالکل آشکارا ہے۔

☆☆☆

بلوچستان کے زیادہ تر رقبے پر برطانیہ کا قبضہ ان عہدناموں کے تحت ہوا جو 1854، 1876 اور 1879 میں قلات اور کابل کے حکمرانوں پر عائد کئے گئے تھے۔

برطانیہ کے زیر حکمرانی جو بلوچی سرزمین تھی اسے تین حصوں میں بانٹ دیا گیا ــــ برطانوی بلوچستان، ایجنسیوں کا علاقہ اور بلوچی ریاستوں (قلات، خاران، مکران اور لاس بیلا) کا وفاق جس کے سربراہ قلات کے خان تھے۔

بلوچستان میں سرمایہ دارانہ ارتقا کی کونپلیں بیسویں صدی کے آغاز سے پھوٹنا شروع ہوئیں۔ یہ اس وقت کی بات ہے جب 95.5 فیصدی آبادی دیہات میں رہتی تھی۔ زیادہ تر لوگ مویشی بانی پر گزر بسر

کرتے تھے۔ان کی زندگی خانہ بدوش یا نیم خانہ بدوش تھی۔ بلوچستان میں کل 6 شہر تھے اور ان کی آبادی 40 ہزار تھی۔ کوئٹہ کو استثنا کہا جا سکتا ہے، اس کی آبادی 24600 تھی۔ باقی سب قصبوں کی طرح تھے اور مدت تک ایسے ہی رہے۔ شہری آبادی کا صرف 15.8 فیصدی حصہ خالص بلوچی تھا (یعنی ان کی تعداد صرف 6 ہزار تھی)، باقی سب باہر سے آئے ہوئے لوگوں پر مشتمل تھی۔ یہ برطانوی فوج کے سپاہی تھے یا سرکاری ملازم یا فوج اور انتظامیہ کی ضروریات پوری کرنے والے۔ علاقے میں ابتدائی معاشی تعلقات غالب تھے۔ تجارت زیادہ تر اشیا کے بدلے اشیا سے ہوتی تھی☆۔

جب 1891 اور 1905 کے درمیان بلوچستان کے شمال اور شمال مشرق میں ریلوے تعمیر کی گئی، سڑکیں بنائی گئیں اور مکران کی بندرگاہیں گواڈر اور پسنی کو جدید کیا گیا (یہ سب فوجی حکمت عملی کے تحت کیا گیا تھا) تو اناج اور زرعی خام مال کی برآمد اور کارخانے کی بنائی ہوئی بیرونی اشیا کی درآمد میں اضافہ ہوا۔ بلوچستان کی زراعت منڈی کے لئے پیدا کرنے لگی۔ بعض علاقے جن کی پیداوار کا انحصار پہلے گردو پیش کے حالات پر ہوتا تھا، نہ کہ منڈی کی ضروریات پر، اب معین تجارتی اشیا پیدا کرنے کے لئے مخصوص ہو گئے (ماری بگٹی اور خاران داجیل علاقے میں مویشی بانی، کوئٹہ پشین میں پھلوں کی کاشت، مکران میں مچھلی اور کھجور کی پیداوار)۔ ساتھ ہی جب کوئٹہ صوبے کا شہری مرکز بنا تو غذائی ضروریات بھی بڑھیں۔ اس سے غذائی پیداوار کے فروغ کو اکساوا ملا۔ کوئٹہ کے نواح میں سبزیاں اور پھل بہتات سے پیدا ہونے لگے۔

ریلیں چلنے سے کان کنی کی اہمیت محسوس ہوئی۔ چنانچہ بلوچستان کے شمال میں کانوں سے کوئلہ کھودا جانے لگا۔ 1886 میں 122 ٹن کوئلہ کھودا گیا تھا جو 1891 میں 10300 اور 1903 میں 47300 ٹن تک پہنچ گیا۔ کوئلے کی کانوں کی مالک نارتھ ویسٹرن اسٹیٹ ریلوے تھی، لیکن برطانوی سرمایہ ان کا اصل مالک تھا اور انگریز ماہرین ان کا نظم و نسق چلاتے تھے۔ چھوٹے پیمانے پر کانوں سے نمک اور دوسری معدنیات بھی نکالی جانے لگیں۔ پہلے صنعتی کاروبار شروع ہوئے۔ بیسویں صدی کے شروع میں کوئٹہ کے نواح میں چار بھاپ کی ملیں، ایک بھاپ کا پریس اور دو خنک ساز آلے کام کرنے لگے۔ بعد میں مشینی اور ریلوے ورکشاپیں قائم ہوئیں۔ پہلی اور دوسری عالمی جنگوں کے درمیان ایک اور اہم بات یہ ہوئی کہ کرومائیٹ نکالا جانے لگا (1936 میں 21 ہزار ٹن)۔

☆ایک سرکاری برطانوی رپورٹ میں بتایا گیا ہے کہ اناج کا تبادلہ نمک سے، مچھلی کا کھجوروں

سے، کپڑے کا گھی اور اون سے کیا جاتا تھا۔

برطانوی عہد میں بلوچستان میں محصولات کی بھر مار تھی۔ سبی علاقے میں 80_1879 اور 03_1902 کے درمیان ان میں 82 فیصدی کا اضافہ ہوا اور کوئٹہ علاقے میں 1882 اور 1895 کے درمیان 350 فیصدی کا۔ محصولات اتنے زیادہ بڑھانے کی وجہ یہ تھی کہ وہ جنس (گیہوں) کی شکل میں وصول کئے جاتے تھے جو برطانوی افواج کو فراہم کیا جاتا تھا۔

جب محصولات بڑھے تو کسان بے زمین ہونے لگے۔ پہلی عالمی جنگ کے بعد یہ عمل اور بھی تیز ہوگیا۔ اس کا سبب یہ تھا کہ برطانوی حکام نے لگان میں اصلاحات کر دی تھیں اور اب تقریباً ہر جگہ لگان جنس کے بجائے نقد میں لیا جانے لگا تھا۔ اس سے کسانوں میں تفریق زیادہ بڑھ گئی۔ ایک برطانوی سرکاری رپورٹ کے مطابق 03_1901 میں زیادہ تر زمین پر مالک کسان کاشت کرتے تھے، مزارع بہت کم تھے اور کھیت مزدوروں کا وجود ہی نہ تھا۔ لیکن 1931 میں مزارعوں اور کھیت مزدوروں کی تعداد خاصی تھی (زراعت کرنے والے تمام خاندانوں کی بالترتیب 22.4 فیصدی اور 7.7 فیصدی)۔ ابھی تک بلوچستان میں آدھے سے زیادہ کسان (52.4 فیصدی) اپنی ہی زمین پر کاشت کرتے تھے☆۔ بتدریج زمینداروں اور ساھوکاروں نے زیادہ تر زرخیز زمینوں پر قبضہ جمالیا۔ یہ عمل اس لئے بھی تیزی سے ہوا کہ برطانوی حکام نے زمین کی نجی ملکیت کے حقوق کو قانونی درجہ دے دیا تھا تاکہ زمیندار اور ساھوکار ان کے اقتدار کے معاشرتی ستون بن جائیں۔

نوآبادکاروں، جاگیرداروں اور ساھوکاروں کے ظلم کے خلاف بلوچوں نے اکثر علم بغاوت بلند کیا۔ 98_1897 اور 1901 میں بلوچستان کے شمال مشرق اور مرکزی علاقوں میں بغاوتیں ہوئیں۔ 1897 اور 1900 کے درمیان بم پور اور دیزک کے بلوچوں نے ظلم کے خلاف سرکشی کی۔

☆''مردم شماری ہندستان، 1931،،، جلد 4، صفحہ 22۔

07_1905 میں روسی انقلاب اور بعد میں ایران اور ہندستان میں انقلابی تحریکوں نے بلوچوں کی سامراج دشمن، جاگیرداری مخالف جدوجہد پر گہرا اثر ڈالا۔ 1907 میں قلات میں بغاوت ہوئی اور ایرانی بلوچستان میں بلوچوں نے شاہی فوج اور حکام کو مار بھگایا اور اس علاقے پر قبضہ کرلیا۔

آنے والے برسوں (16_1915، 1925، 28_1927) میں بھی بلوچوں کی کئی بغاوتیں

ہوئیں۔

بلوچوں کے معاشرتی اور معاشی اور ارتقا کی سطح بلند نہیں تھی، سیاسی پارٹیوں کی کمی تھی اور عوامی تنظیمیں مفقود تھیں۔ اسی سبب سے یہ بغاوتیں اتفاقی اور خود رو تھیں۔ برطانوی اور ایرانی حکام اکثر باہمی قبائلی تصادم بھڑکاتے اور سرداروں کی بزدلی اور اپنی فوجی برتری سے فائدہ اٹھا کر بغاوتوں کو بے رحمی سے کچل دیا کرتے تھے☆۔

بغاوتیں اگرچہ ناکام رہیں لیکن ان کا نتیجہ مثبت نکلا۔ نوآبادکاروں کے خلاف جدوجہد کے پیش نظر کئی بلوچی قبائل نے اپنے پرانے تنازعات بھلا دئے اور آپس میں متحد ہو گئے۔ اس کے علاوہ بغاوتوں سے بلوچی معاشرے کی جاگیردارانہ بنیادیں بھی ہلیں اور انہوں نے سب سے زیادہ ترقی پسند عناصر کو سیاسی سرگرمی کے لئے متحرک کیا۔

جب برطانوی نوآبادکاروں نے بلوچستان کا الحاق کیا تو اس کے دو نتائج نکلے ___ جنس زر کے تعلقات تیزی سے بڑے، اور صوبہ حاکم ملک کا زرعی ضمیمہ بن گیا۔ کارخانوں کی بنی ہوئی اشیا (خاص کر سوتی کپڑے) کی درآمد بڑھ گئی۔ بھاری محصولات کے علاوہ اس نے بھی مقامی دستکاروں کو دیوالیہ بنا دیا۔ صرف 1921 اور 1931 کے درمیان ان کی تعداد 63 فیصدی کم ہوگئی۔

براہ راست پیدا کرنے والے ___ کسانوں اور دستکاروں کے استحصال کے سبب بے روزگاری بڑھی اور محنت کی منڈی نے تشکیل پائی۔ معاشی لحاظ سے زیادہ ترقی یافتہ علاقوں میں نقل مکان بڑھ گئی۔ خانہ بدوش اور نیم خانہ بدوش قبائل کی تعداد کم ہونے لگی۔ 1911 میں بلوچستان کی کل آبادی کا 54.3 فیصدی حصہ باقاعدہ بسا ہوا تھا۔ 1921 میں آباد لوگوں کی تعداد 59.9 فیصدی اور 1931 میں 62.7 فیصدی ہوگئی۔ تین دھائیوں (1901 تا 1931) میں شہری آبادی 162 فیصدی بڑھی (40 ہزار سے ایک لاکھ 3 ہزار تک)۔ شہر کوئٹہ نے خاص طور پر ترقی کی اور وہ صوبے کا اہم ترین سیاسی، انتظامی، معاشی اور ثقافتی مرکز بن گیا۔ بلوچستان کے مختلف علاقوں کے درمیان معاشی رابطے مضبوط ہوئے۔ علاقائی بنیاد پر تقسیم محنت نے بلوچی قومی منڈی کی تشکیل شروع کر دی۔

☆ تفصیلات کے لئے ملاحظہ ہو ''تاریخ بلوچستان'' از میر گل خاں، جلد 2،

بلوچستان میں سرمایہ دارانہ تعلقات قائم ہونے کے ساتھ ساتھ بورژوا معاشرے کے بنیادی

طبقات بھی تشکیل پانے لگے۔

1903 میں پرولیتاریوں کی تعداد ایک ہزار سے زائد نہیں تھی جن میں 8 سو کان کن تھے۔ 29_1928 میں بلوچستان کے صنعتی کاروباروں میں کام کرنے والے مزدوروں کی تعداد 8041 اور 30_1929 میں 8667 ہوگئی۔ ان کے علاوہ چند ہزار مزدور ریلوے میں مرمت کا کام کرتے تھے۔ پرولیتاریہ کے تعداد میں اضافے کے پہلو بہ پہلو کام کے سخت حالات اور بے حد قلیل اجرتیں تھیں۔ بیسویں صدی کے آغاز میں کان کن کو صرف 12 آنے یومیہ ملتے تھے۔ ہنرمند مزدور زیادہ تر پنجاب کے تھے۔ اکثر بلوچ غیر ہنرمند تھے۔ بلوچی پرولیتاریہ اپنے صوبے کی سرحدوں کے باہر بھی ابھرا۔ ہر سال مفلس بلوچ روزگار کی تلاش میں پنجاب، سندھ اور بمبئی کا رخ کرتے تھے۔

بلوچستان کے ان حالات میں خالص بورژوازی کی تشکیل انتہائی مشکل تھی۔ وہاں جو چوٹی کے صاحب ملکیت لوگ (تقریباً تمام تر زمیندار) تھے انہیں اپنی جمع کی ہوئی دولت لگانے کی نہ کوئی ترغیب تھی اور نہ موقع۔ بظاہر ایسا معلوم ہوتا تھا کہ جاگیردارانہ باقیات وسیع پیمانے پر قائم رہنے کے باوجود جنس زر کے تعلقات بڑھنے سے زمینداروں کا ایک حصہ تاجر اور ساہوکار بن کر بتدریج بورژوازی ہو جائے گا۔ لیکن سامنے سندھی، گجراتی اور پنجابی تاجروں اور ساہوکاروں کی اجارہ داری کی دیوار حائل تھی۔ ان کا برطانوی سرمایہ داروں سے گہرا تعلق تھا، انہیں اندرونی منڈی، قرضے اور مالی کاروبار میں مراعات حاصل تھیں۔ قلات میں تھوک تجارت پر سندھ کے ہندوؤں اور کچھ کے زمینداروں خوجوں کا قبضہ تھا اور خوردہ فروشی ہندوؤں کے ہاتھ میں تھی۔ سبی کی تجارت پر شکارپور کی فرموں کے دلال حاوی تھے۔ یہی حال لاس بیلا اور بلوچستان کے دوسرے خطوں کا تھا☆۔

بلوچی دانشوروں کی خاص طور پر سست رفتاری سے تشکیل ہوئی۔ 1903 میں پورے بلوچستان میں صرف 2 ثانوی اور 22 ابتدائی اسکول تھے جن میں زیادہ تر غیر بلوچی طلبا، برطانوی انتظامیہ کے ملازمین کے بچے پڑھتے تھے۔ مقامی طلبا کی تعداد 349 تھی۔ ذریعہ تعلیم ہندستانی اور پنجابی تھا۔ ثانوی اسکولوں میں تمام مضامین انگریزی میں پڑھائے جاتے تھے۔ بلوچی زبان کا کہیں دخل نہیں تھا۔ 40 برس بعد بھی صوبے میں کل 80 اسکول تھے۔ 1947 میں مدرسین میں صرف 2 فیصدی بلوچ تھے، یعنی تقریباً دو درجن☆☆۔

صوبے کا معاشرتی معاشی ارتقا انتہائی ناہموار ہوا۔ ہماری صدی کی پانچویں دھائی میں ریاستوں کی شہری آبادی (جو مشرقی بلوچستان کے 60 فیصدی رقبے پر محیط تھیں) صرف 4 فیصدی تھی۔ اس میں بھی اکثر غیر بلوچی لوگ تھے۔ کوئی بھی شہر بلوچی قومی استحکام کا مرکز نہیں تھا۔ سرمایہ داری بس ترقی یافتہ شمال مشرقی علاقوں میں شروع ہوئی اور وہ بھی اس خطے میں برطانوی اجارہ دارانہ سرمایہ کے عمل کے نتیجے میں۔ بلوچستان کے درسرے علاقوں میں فرسودہ جرگہ نظام کی باقیات کے سبب جاگیر دارانہ تعلقات چھائے رہے۔ یہ اس لئے کہ بلوچی معاشرے کی جاگیری زمیندار ان باقیات سے فائدہ اٹھا کر اپنے اقتدار کو پائدار کرنا اور طبقاتی تضادات پر پردہ ڈالنا چاہتے تھے۔ اور برطانوی سامراج کی پالیسی یہ تھی کہ مختلف قبائل کو آپس میں لڑا کر اور سرداروں کو رشوتیں دے کر اپنی حکمرانی مضبوط کرے۔ صرف 29_1926 میں سرکاری طور پر غلامی ختم کی گئی۔

بلوچستان کی نوآبادیاتی محکومی اور معاشرتی معاشی پسماندگی (برطانوی ہند کے دوسرے خطوں کے مقابلے میں) نے صوبے میں نسلیاتی عوامل پر منفی اثر ڈالا۔ سامراجیوں نے بلوچستان کے عوام کو غربت اور جہالت کا شکار بنایا، سرمایہ دارانہ تعلقات کو بڑھنے سے روکا اور بورژوا معاشرے، اس کے بنیادی طبقات اور سماجی پرتوں ی نشو ونما میں رکاوٹیں ڈالیں۔ اس طرح انہوں نے بلوچوں کا قومی استحکام انتہائی مشکل بنا دیا، اس نے بے متوازن ساخت کی تشکیل پائی۔ تباہ شدہ بلوچ مویشی بان، کاشتکار، دستکار اپنے وطن میں اپنی قوت محنت فروخت نہیں کر سکتے تھے اس لئے ہزاروں کی تعداد میں نقل مکان کرنے پر مجبور ہوئے، خاص کر سندھ میں۔ دوسری عالمی جنگ کے دوران اور بعد از جنگ کے برسوں میں سندھ میں بلوچوں کی تعداد کی تعداد 2 لاکھ 35 ہزار سے بڑھ کر 4 لاکھ 42 ہزار ہو گئی، یعنی 88 فیصدی کا اضافہ ہوا۔ اس کے علاوہ ایک لاکھ بلوچ کراچی کے نواح میں رہنے لگے۔

R. Hughes-Buller, <<Baluchistan>> pp. 52, 142, 184, 189.*

I.M.Khan, <<Baluchistan>>, p. 8. **

جب پاکستان قائم ہوا تو بلوچ بلوچستان کے مقابلے میں سندھ میں زیادہ تھے۔ سندھ ہی میں بلوچی پیٹی بورژوازی اور بورژوا دانشوروں نے تشکیل پائی۔ 1951 تک اکثر پڑھے لکھے بلوچ (2104) بلوچستان کی سرحدوں کے باہر رہتے تھے، خاص کر کراچی میں۔ سندھ ہی میں چوتھی دھائی میں

بلوچوں کے اخبار ورسائل شائع ہوئے (پہلے اردو میں اور پھر پانچویں دھائی میں بلوچی زبان میں)۔ خود بلوچستان میں ایک واحد اخبار ''بلوچستان گزٹ'' انگریزی میں کوئٹہ سے شائع ہوتا تھا۔ بلوچی زبان میں نہ اخبارات شائع ہوئے اور نہ کتابیں۔ بلوچوں میں اردو اور فارسی ادبی زبانوں کی طرح استعمال کی جاتی تھیں۔ صرف پانچویں دھائی میں کوئٹہ سے ایک ماہانہ بلوچی رسالہ شائع ہونا شروع ہوا لیکن چند سال تک بھی جاری نہیں رہ سکا۔ پانچویں دھائی میں روشن خیالی کی بلوچوں کی پہلی انجمنیں قائم ہوئیں (ان میں سب سے بڑی انجمن اصلاح بلوچاں 1946 میں ہاشمی صاحب نے قائم کی تھی)۔

انیسویں صدی کی آخری دھائی اور بیسویں صدی کی ابتدائی دھائیوں میں برطانیہ کی سامراجی پالیسی کی بدولت بلوچوں کا علاقائی انتشار عمل میں آیا۔ اس نے ان کا قومی استحکام انتہائی مشکل بنا دیا اور اب بھی بنا رہا تھا۔ بلوچ ایک علاقے پر آباد نہیں ہیں۔ وہ بڑے گروھوں کی شکل میں دوسری قوموں میں بکھرے ہوئے ہیں۔ پاکستان کی 1951 کی مردم شماری کے مطابق بلوچستان میں ایسے گنے چنے علاقے ہیں جہاں بلوچوں کی اکثریت ہے ___ چاغی اور سبی ضلع (جہاں 60 اور 54 فیصدی بلوچ ہیں)، خاران اور مکران (81 اور 100 فیصدی)۔

ان تمام رکاوٹوں کے باوجود بلوچی قوم تشکیل پا رہی ہے۔ 1951 میں مشرقی بلوچستان میں ان بلوچوں سے جن کی مادری زبان بلوچی ہے وہ لوگ 78 ہزار کی تعداد میں زیادہ تھے جو بلوچی بولتے ہیں۔

جب برطانوی نو آبادکاروں نے برصغیر پاکستان و ہند کو خیر باد کہا تو بلوچ پاکستان کے وہ واحد لوگ تھے جو بورژوا قوم میں مستحکم نہیں ہوئے تھے۔ ہمارے دور میں بھی بلوچوں کے قومی استحکام کا عمل جاری ہے۔ بلوچی پرولیتاریہ کی تعداد بڑھ رہی ہے۔ بورژوازی اور دانشور پیدا ہو رہے ہیں☆۔ بلوچی قومی شعور آشکار ہو رہا ہے۔ بلوچی ادب پروان چڑھ رہا ہے۔ بلوچی ادیبوں میں گل خاں ناصر، آزاد جمال دینی پیش رو ہیں۔ بلوچوں کی کئی قومی تنظیمیں وجود میں آئیں (کل پاکستان بلوچ لیگ، بلوچ طلبا کی لیگ، بلوچ پارٹی یا استومنگل وغیرہ)۔ ان کے ارکان بورژوازی اور دانشوروں کے علاوہ زمیندار بھی ہیں۔ بلوچستان کو ایک علحدہ صوبہ بنانے کا مطالبہ پورا ہو چکا ہے۔ اس سے بلوچی قومی کی تشکیل کے امکانات بڑھ گئے ہیں۔

☆ 1951 کے شروع میں بلوچستان میں 1600 پیشہ ور لوگ تھے (انجنیر، مدرسین، ڈاکٹر

وغیرہ)۔1200 اعلیٰ تعلیم یافتہ تھے اور 6000 ثانوی تعلیم یافتہ۔

نتائج

پاکستان کے عوام کی نسلیاتی تاریخ کی بنیادی منزلوں کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ برطانوی سامراج کی حکمرانی سے پہلے ہی انہوں نے جاگیردارانہ قومیتوں کی شکل اختیار کر لی تھی۔ ساتھ ہی ملک کے مختلف علاقوں میں معاشی معاشرتی ارتقا میں فرق ہونے کے سبب بعض قومیتوں (خاص کر پشتونوں اور بلوچوں) میں قبائلی نظام کی روایات، خیالات اور عناصر کی گہری باقیات محفوظ رہیں۔ اس فرق کی وجوہات کئی تھیں ___ پشتونوں اور بلوچوں کے علاقے پہاڑوں میں واقع تھے جو ایک دوسرے سے علحدہ اور رسائی سے باہر تھے۔ اس لئے ان پر ترقی یافتہ معاشی اور ثقافتی مرکزوں کا اثر بہت کم پڑا۔ پھر ان پر مسلسل یلغاریں ہوتی رہیں جنہوں نے پیدآورقوتوں کو بڑے پیمانے پر تباہ برباد کیا۔ بعض اوقات حملہ آور پسماندہ خانہ بدوش قومیتوں اور قبائل سے تعلق رکھتے تھے۔ اس نے معاشرتی نظام کی مزید ابتدائی شکلوں کو جنم دیا۔ اس کے مقابلے میں ملک کے سب سے زیادہ ترقی یافتہ خطوں میں نئے معاشرتی نظام کے انفرادی عناصر نے پختہ ہو کر جاگیرداری کی جگہ لی۔ چنانچہ لوگوں کے نسلیاتی فرقے کو ایک نئی تاریخی شکل کی جانب عبور کے امکانات فراہم ہوئے ___ لوگوں کے بورژوا قوموں میں مستحکم ہونے کے امکانات۔

یہاں یہ مدنظر رکھنے کی ضرورت ہے کہ ازمنہ وسطی کے آخر میں پاکستان کے علاقے میں بسنے والی ایک بھی جاگیردارانہ قومیت کا رشتہ براہ راست قدیم زمانے کی غلامی کے نظام کی قومیتوں (یا قرابت کے قبائل کے اتحاد) سے نہیں ملتا۔ ازمنہ وسطی کی تمام جاگیردارانہ قومیتوں نے تشکیل کے عمل کے دوران اپنی ساخت میں انتہائی انواع واقسام کے نسلیاتی اور نسلی عناصر شامل کئے۔ ساتھ ہی پیچیدہ نسلیاتی آمیزشوں اور تقسیموں (مختلف پیمانے پر اور مختلف سلسلے میں) کی وجہ سے ایک ہی قسم کے نسلیاتی عناصر کئی جاگیردارانہ قومیتوں کی ساخت میں شامل ہوئے۔

پاکستان کے عوام کی نسلیاتی تاریخ سے معلوم ہوتا ہے کہ بیرونی حملوں نے جن کی جلو میں کافی نقل مکان اور نسلیاتی آمیزشیں ہوئیں پنجابیوں، سندھیوں، پشتونوں اور بلوچوں کی نسل سازی پر اہم اثر ضرور ڈالا لیکن اسے معین نہیں کیا۔

نقل مکان کے وقت باہر سے آنے والوں نے اصلی مقامی آبادی کو کبھی صفحہ ہستی سے نہیں مٹایا اور نہ اس کی جگہ لی۔ برصغیر کے شمال مغربی علاقے کی تاریخ کے آغاز تک میں کبھی ایسا نہیں ہوا کہ اصل مقامی آبادی نے اپنی زبان بدل دی ہو اور وہ دوسرے نسلیاتی عناصر کے ساتھ مدغم ہو کر نئی نسلیاتی لسانی فرقہ بن گئی ہو۔ جب آمیزش سے کوئی نیا فرقہ ابھرا تو اصل مقامی آبادی نے نہ صرف اپنے ثقافتی بلکہ انسانیاتی عناصر بھی برقرار رکھے۔

قدیم زمانے اور ازمنہ وسطی میں پاکستانی عوام کے مشرق وسطی اور مشرق قریب، وسطی اور جنوبی ایشیا کے ممالک کے ساتھ تعلقات نے ان کی مادی اور روحانی ثقافت کے کئی عناصر کو تشکیل دینے میں بڑا کردار ادا کیا۔ لیکن ان رشتوں کی اہمیت کے باوجود ثقافتی اور تاریخ ترقی اور اس کی بنیاد کا فیصلہ کن جز ہمیشہ خود پاکستان کے عوام کا اندرونی معاشرتی اور معاشی ارتقا رہا۔ اسی ارتقا کے سبب یہ ممکن ہو سکا کہ انہوں نے پڑوسی ملکوں اور لوگوں کی ثقافت کے عناصر جذب کئے۔

پاکستانی عوام کی مادی اور روحانی ثقافت کے بنیادی عناصر اصلی (قدیم) آبادی کی تہذیب کے منطقی ارتقا کے سبب مقامی سرزمین پر پروان چڑھے۔ بیرونی ملکوں کے جو عناصر داخل ہوئے انہوں نے اہم کردار ضرور ادا کیا لیکن فیصلہ کن نہیں۔

پاکستانی عوام کی نسلیاتی تاریخ کا مطالعہ کرتے وقت ان کی نسلیاتی ساخت میں جو تبدیلیاں نظر آتی ہیں ان کا زیادہ تعلق فتوحات، نقل مکان یا بیرونی اثر سے نہیں بلکہ مقامی معاشرے کی پیداآور قوتوں کے قدرتی ارتقا اور نشو ونما سے ہے۔ پیداآور قوتوں کا مسلسل ارتقا، خواہ وہ بے حد سست اور غیر نمایاں ہی کیوں نہ ہو، اور اس کی بنیاد پر توسیعی تجدید پیداوار ــــ یہی دونوں عناصر مقامی معاشرے کے وجود کے خارجی حالات میں تبدیلی، لوگوں یعنی پیداکاروں میں تبدیلی لاتے ہیں (جیسا کہ مارکس نے لکھا ہے کہ لوگ پیداوار کے ذریعے اپنے آپ کو از سر نو بنا کر، اپنے اندر نئی قوتیں، نئے خیالات، آپس میں مواصلت کے نئے طریقے، نئی ضروریات اور نئی زبان تخلیق کر کے اپنے اندر نئی صفات پیدا کرتے ہیں اور اپنا ارتقا کرتے ہیں) ☆

پاکستان کے عوام کی نسلیاتی تاریخ کا مطالعہ بتاتا ہے کہ جو قومیتیں جاگیری عہد میں بنیں ان میں بیرونی اثرات کے نوع بنوع عناصر کے خلاف بڑا استحکام تھا۔ نہ تو فاتحوں کے لشکر اور نہ بیرونی آبادی کی

بڑی سے بڑی نقل مکان ان کے نسلیاتی فرقے کو تباہ کر سکی۔

یہ نسلیاتی فرقہ اس وقت بھی برقرار رہا جب برصغیر مغربی ریاستوں کی نوآبادیاتی توسیع پسندی کی جولاں گاہ ہوا اور اٹھارویں صدی کے آخری نصف اور انیسویں صدی کے پہلے نصف میں سیاسی آزادی سے محروم ہوکر وہ برطانوی نوآبادی بن گیا۔

جب انیسویں صدی کے آخری نصف میں وہاں سرمایہ دارانہ تعلقات بڑھنا شروع ہوئے تو اس کا موجودہ پاکستان میں نسلیاتی عوامل پر گہرا اثر پڑا اور نتیجہ بورژوا قوموں کی تشکیل میں نکلا۔ ملک کے مختلف علاقوں میں معاشرتی معاشی ارتقا کی سطح میں فرق اور نوآبادیاتی محکومی کے حالات میں ان کے تاریخی ارتقا کی ممتاز خصوصیات کی وجہ سے ملک کے تمام نسلیات خطوں میں بورژوا قوموں کی تشکیل ایک ساتھ نہیں ہوئی اور تشکیل کی رفتار بھی یکساں نہیں رہی۔

نوآبادیاتی جوئے نے سرمایہ دارانہ تعلقات کے ارتقا میں رکاوٹیں ڈالیں اور انہیں مسخ کیا۔ اس وجہ سے موجودہ پاکستان کے عوام کے بورژوا قوموں میں مستحکم ہونے کے عمل پر منفی اثر پڑا۔ لیکن یہ جوا تاریخی ارتقا کو روکنے میں ناکام رہا۔

پاکستان کے عوام کی نسلیاتی تاریخ کا علم اس ملک میں ان نسلیاتی عوامل کا صحیح طور پر مطالعہ کرنے اور ان کا جائزہ لینے میں مدد دیتا ہے جو آج وہاں رونما ہیں۔

K. Marx, <<Forms Preceeding Capitalist Production>>.*

آج کے پاکستان میں جو نسلیاتی عوامل جاری ہیں ان کی تحقیق دکھاتی ہے کہ ان میں بعض بنیادی رجحانات جبلی ہیں۔ دوسرے ایشیائی اور افریقی ملکوں کی طرح ہمیں پاکستان میں بھی یہ بات دکھائی دیتی ہے کہ معیشت اور ثقافت کے میدانوں میں نوآبادیاتی ماضی کا ورثہ دور کرنے، معاشرتی معاشی شعبے، نظریات اور معاشرتے کے سماجی ڈھانچے سے قبل از سرمایہ داری کے تعلقات پیداوار کی باقیات کو ختم کرنے کے ساتھ ساتھ متصل علاقوں پر آبادی کے نسلیاتی لحاظ سے قریب گروہوں کے درمیان جدا کرنے والی دیواریں منہدم ہو رہی ہیں اور وہ ایک قومی فرقے کی شکل اختیار کر رہے ہیں (اس رجحان کے اظہار کی بڑی واضح مثال بلوچوں اور داردی قومیتوں سے مل سکتی ہے جو شمالی پاکستان میں رہتی ہیں)۔ ان انفرادی ترکیبی اجزا کے درمیان علاقائی (بعض وقت قبائلی)۔ اختلافات مٹ رہے ہیں جو اس بڑے

نسلیاتی فرقے (قوم) کا حصہ ہیں جس کی تشکیل کا عمل ہو رہا ہے۔ زرعی آبادی کی شہروں میں نقل مکان، معیشت اور ثقافت کی ترقی، لسانی استحکام کا عمل اور دوسرے عناصر ان اختلافات کو ختم کر رہے ہیں۔ ساتھ ہی چھوٹے نسلیاتی گروہ یا لوگوں کے علحدہ گروہ جو مختلف وجوہات کی بنا پر بڑے فرقے (قوم) کے علاقے میں رہتے ہیں قوم کی تشکیل کے عمل کے دوران اس میں جذب ہوتے جا رہے ہیں۔ ماضی کی معاشی ثقافتی پسماندگی اور قبائلی زندگی کی باقیات دور ہونے کے ساتھ ساتھ خواندگی پھیلنے سے جدا جدا نسلیاتی گروہ ختم ہو رہے ہیں اور آپس میں گھل مل کر ایک بڑے فرقے (قوم) کی تشکیل کر رہے ہیں۔

ہم عصر پاکستان میں نسلیاتی عوامل کا مطالعہ اس میں مدد دیتا ہے کہ ان میں جو اہم ترین رجحان ہے اسے دریافت کیا جائے۔ پہلے نوآبادیاتی دور میں نسلیاتی چھوٹے گروہ کو بڑا گروہ جذب کر لیا کرتا تھا۔ اب یہ عمل جاری نہیں ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ آزاد پاکستان میں چھوٹے نسلیاتی گروھوں کے اپنے ارتقا کے لئے زیادہ مواقع ہیں۔ یہ اس لئے کہ پسماندہ علاقوں کی جہاں یہ لوگ رہتے ہیں معاشی اور ثقافتی نشوونما ہی رہی ہے۔ انہوں نے اپنی تحریری زبانیں تخلیق کر لی ہیں۔ ان زبانوں میں ادب شائع کیا جا رہا ہے جس کے سبب وہ پڑوسی لوگوں سے ممتاز کئے جا سکتے ہیں۔ انہیں اپنے مخصوص نسلیاتی فرقے کا احساس ہے۔ بروھی جس کے متعلق تمہید میں کافی لکھا گیا ہے چھوٹے گروھوں کے جذب نہ ہونے کی ایک مثال ہیں۔

کثیر قومی ایشیائی اور افریقی ملکوں کی طرح جنہوں نے حال میں نوآبادیاتی جوا اتار پھینکا ہے پاکستان میں بھی یہ عمل دیکھا جا سکتا ہے کہ مختلف زبانیں بولنے والے ایک دوسرے کے نزدیک ہو رہے ہیں۔ اس سے قائم شدہ ریاست کی حدود کے اندر مستحکم نسلیاتی سیاسی یا علاقائی فرقے کی تشکیل کی راہ کھل رہی ہے۔ اس نسلیاتی سیاسی یا علاقائی فرقے کی تشکیل کا تعلق پاکستان کے عوام کے درمیان سیاسی، معاشی اور ثقافتی رابطوں کی ترقی سے ہے۔ مشترکہ جغرافیائی حالت، طویل ثقافتی تاریخی باہمی رشتے، ملک کی آزادی اور حریت کے لئے سامراجیوں کے خلاف مشترکہ جدوجہد کی مشترکہ روایات، یکساں مفادات، آزادی کے بعد ملک کی پرامن تعمیر میں مشترکہ شرکت، پاکستان کے اقتدار اعلیٰ کے استحکام اور اس کے باشندوں کا معیار زندگی بڑھانے کی خاطر شانہ بشانہ جدوجہد ان رشتوں کو مضبوط کرتے ہیں۔ جدید صنعت اور ذرائع رسل ورسائل، اطلاعات کے ذرائع پاکستانی عوام کو ایک دوسرے سے نزدیک ہونے

کے ٹھوس خارجی مواقع پیش کرتے ہیں۔

مشرق کے نئے آزادملکوں میں جہاں بیرونی نوآبادکاروں کا جوروستم ختم ہوگیا ہے ایسے حالات پیدا ہوگئے ہیں کہ قوموں کے درمیان تضادات حل کئے جاسکتے ہیں، ماضی کے ورثے سے ملی ہوئی عدم اعتمادی دور کی جاسکتی ہے۔اس سے لوگوں میں اتحاد واتفاق بڑھنے کی وسیع راہیں کھلتی ہیں۔لیکن یہ لازمی شرائط خود بخود عملی جامہ نہیں پہن سکتیں۔ان کی عمل پذیری قومی جمہوری قوتوں اور اندرونی رجعت پرستی کے درمیان سخت جدوجہد سے ہوتی ہے جو کھلم کھلا یا خفیہ طور پر سامراج کی حامی ہے۔

نئے آزاد ممالک کی قومی ریاست کی تعمیر کا عمل دکھاتا ہے اور سوویت یونین کا پچاس سال سے زیادہ کا تجربہ ثابت کرتا ہے کہ قومی (نسلیاتی) مسائل کو حل کرنے کا کوئی ایک واحد نمونہ نہیں ہوسکتا اور نہ ہونا چاہئے۔قوموں کے درمیان تعلقات پر غور کرتے وقت معین ملک کے مخصوص ٹھوس، تاریخی طور پر قائم شدہ معاشرتی معاشی، سیاسی نظریاتی، ثقافتی، نسلیاتی، نفسیاتی اور دوسرے عناصر کو سنجیدگی سے پیش نظر رکھنا چاہئے۔

ساتھ ہی تاریخ تجربہ یہ بھی بتاتا ہے کہ جمہوری طریقے سے قومی (نسلیاتی) مسائل کا حل بعض مشترکہ اصولوں پر کاربند ہوئے بغیر ناممکن ہے۔

نئے آزاد شدہ ملکوں میں قومی مسئلے کو اس وقت تک جمہوری طور پر حل نہیں کیا جاسکتا جب تک کہ بیرونی استبداد، جاگیردارانہ اور ساہوکاری استحصال کی تمام باقیات فیصلہ کن طریقے سے ختم نہ کردی جائیں اور لوگوں کو سیاسی حقوق نہ مل جائیں۔اور یہ معین ریاست میں رہنے والے، تعداد کے لحاظ سے کم یا زیادہ، تمام لوگوں کے اس حق کو بلاشرط تسلیم کئے بغیر کہ وہ اپنی زبان اور ثقافت کو پروان چڑھا سکتے ہیں، قوم (نسلیاتی گروہ)، مذہب، نسل وغیرہ پر مبنی ہر امتیاز یا مراعات کو ختم کئے بغیر ناممکن ہے۔

قومی مسئلے کا جمہوری حل اس جدوجہد کا ایک لازمی حصہ ہے جو ترقی پسند قوتیں سیاسی اور معاشرتی مساوات کے لئے کررہی ہیں۔اسی لئے یہ جدوجہد ان محنت کش عوام کے اتحاد، ان ملکوں کے اقتدار اعلی اور اتحاد کے استحکام اور بقا، ان کی معیشت اور ثقافت کی ترقی کے لئے ضروری شرط ہے جنہوں نے غلامی کا جوا اتار پھینکا ہے۔

لیکن تاریخی تجربہ یہ اچھی طرح دکھاتا ہے کہ قوموں کے درمیان تضادات کا مکمل خاتمہ اور ان

حالات کی بیخ کنی جوان تضادات کوجنم دیتے ہیں اس وقت تک ممکن نہیں ہے جب تک کہ معاشرے کا اشتراکی تغیر نہ ہواور انسان کے ہاتھوں انسان کے استحصال کا خاتمہ نہ ہو جائے۔صرف اشتراکیت قومی (نسلیاتی) مسائل کے ایسے حل کے لئے امکانات پیدا کرتی ہے۔اور یہ حل مختلف قوموں کے محنت کشوں کے بنیادی مفادات کوہم آہنگی سے یک جا کرتا ہے اوران کی معیشت، زبانوں اور ثقافتوں کی ہمہ پہلو نشوونما کے واسطے حالات پیدا کرتا ہے۔صرف اشتراکیت ہی طبقاتی عدم مساوات کوختم کرکے لوگوں کورسمی نہیں بلکہ حقیقی مساوات کی ضمانت دیتی ہے۔اوراس طرح وہ کثیر قومی ریاستوں کی واجب التعظیم سالمیت اوراتحاد کے لئے بنیادفراہم کرتی ہے۔لہذا، ہمارے عہد میں ترقی پذیرملکوں میں عوام کے یک سنگ اتحاد اور برادرانہ اتصال کی خاطر ترقی پسندقوتوں کی ثابت قدم جدوجہدکومعاشرے کے اشتراکی تغیر کی جدوجہد سے کبھی جدانہیں کیاجاسکتا۔

یہ ایڈیشن مارکسسٹس انٹرنیٹ آرکائیواردوسیکشن کے لئے ابن حسن نے ترتیب دیا۔

اردوٹائپ: رضیہ سلطانہ۔

نظرثانی ترجمہ: ابن حسن

پڑھنے والوں سے

marxists.org کا اردوسیکشن آپ کا بہت شکرگزار ہوگا اگر آپ ہمیں اس کتاب کے مواداور اس کے ترجمے کے بارے میں اپنی رائے لکھیں۔اس کے علاوہ بھی اگر آپ کوئی مشورہ دے سکیں توہم شکرگزار ہوں گے۔

اپنی رائے کے لئے درج ذیل پتے پرای میل کریں:

hasan.marxists.org

اس کے علاوہ اگر آپ اردو یا کسی اور زبان کے سیکشن کے لئے اپنی خدمات رضا کارانہ طور پر پیش کرنا چاہیں توانسانی علمی ترقی میں آپ کا حصہ قدر کی نگاہ سے دیکھا جائے۔